ملک کی واحد ادبی مجلس

انجمن اربابِ علم پنجاب

کا

ادبی آرگن

ہزار داستان

مرتبہ

عابد علی عابد بی۔ اے ایل ایل بی

محمد ہادی حسین قریشی بی اے (آنرز)

اعزازی

ڈائرکٹران پالیسی

خان بہادر شیخ عبدالقادر بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا، صدر انجمن

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ایم۔ ایس سی۔ ڈی ایس سی نائب صدر

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی - - - - رکن انجمن

بلیغ الملک علامہ تاجور نجیب آبادی - - - - سیکرٹری

دارالاشاعت ادب لطیف چیمبرلین روڈ لاہور

نمبر شمار	فہرست اسمائے گرامی حضرات اراکین مجلس ادبا و مجلس انتظامیہ و مربیان	رقم چندہ
۱	ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع ایل ایل ڈی۔ کے۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ ای سرپرست	عـہ/
۲	خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔ صدر مجلس انتظامیہ	صہ/
۳	ڈاکٹر شانتی سروپ صاحب بھٹناگر ڈی۔ ایس۔ سی نائب صدر	صہ/
۴	ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا۔ نائب صدر	صہ/
۵	راجہ نریندر ناتھ صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ ایل سی بیرسٹرایٹ لا۔ صدر مجلس شعرا۔	صہ
۶	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی رکن مجلس انتظامیہ	عگ/
۷	خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج نائب صدر مجلس شعرا۔	عہ/
۸	لالہ کشوری موہن مترا۔ ایم۔ اے پروفیسر دیال سنگھ کالج نائب صدر مجلس ادبا۔	عہ/
۹	رائے صاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی۔ اے ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی اسکول رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۰	لالہ گلبہار سنگھ ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۱	شیخ نیاز محمد صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ بی وکیل رکن مجلس ادبا۔	عگ/
۱۲	مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس صدر مجلس ادبا	صہٰ/
۱۳	سید محمد یحییٰ شاہ صاحب رئیس لاہور۔ رکن مجلس انتظامیہ	صہٰ/
۱۴	سردار اوداے سنگھ صاحب شائق بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل فیروزپور رکن مجلس انتظامیہ	سے/
۱۵	شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی فائنشل سیکرٹری رکن مجلس انتظامیہ	عہ
۱۶	پنڈت میلارام صاحب وفا ایڈیٹر اخبار بھیشم رکن مجلس انتظامیہ	عگ/
۱۷	شیخ سراج الدین صاحب آذر ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل پروفیسر اسلامیہ کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۸	ابوالمعانی حضرت اختر شیرانی ایڈیٹر انتخاب رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۹	مولانا محمود شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج۔ رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۰	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اسسٹنٹ فارن سیکرٹری کشمیر	عہ/
۲۱	لالہ برج نرائن صاحب ایم۔ اے پروفیسر سناتن دھرم کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۲	مسٹر محمد یوسف خاں سلیم بی۔ اے پروفیسر کرسچین کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۳	شیخ عبدالحمید صاحب ڈلاھی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۴	مولنا تاجور نجیب آبادی سیکرٹری	عہ/
۲۵	مولانا سید اولاد حسین صاحب شاداں لکھنوی پروفیسر اورینٹل کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ
۲۶	میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر ہمایوں رکن مجلس انتظامیہ	سے/
[illegible]	شیخ نور الٰہی صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس انسپکٹر مدارس لاہور رکن مجلس ادبا۔	عگ/

ہزار داستان

جلد (۸) فہرست مضامین بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء نمبر (۱)

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور دار الاشاعت ادب لطیف کیلئے محمد اسمٰعیل [illegible] نے شائع کیا)

انجمن ارباب علم پنجاب کا آرگن

بڑی مسرت سے ہم یہ خبر ناظرین ہزار داستان تک پہنچاتے ہیں کہ مُلک کی مشہور علمی مجلس ارباب علم پنجاب نے ہزار داستان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔ ہزار داستان کا یہ نمبر انجمن ارباب علم کا آرگن بن کر شائع ہو رہا ہے۔ انجمن نے اُردو ادب کا جو اصلاحی پروگرام مُلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہزار داستان اُسے عملی صورت دیگا۔ آئندہ انجمن کے یادگار ادبی جلسوں کے گرانمایہ مضامین نظم و نثر ہزار داستان کے ہر نمبر میں نظر آئیں گے۔ اس مرتبہ جو تصویر شائع کیجا رہی ہے۔ وہ درحقیقت اُردو نظم کی ایک تاریخی تصویر ہے۔ حضرات اہل شملہ نے انجمن ارباب علم کو شملہ میں دعوت دی تھی۔ لاہور سے مُلک کے بیس مشہور اہل قلم کی ایک قابلِ قدر جماعت انجمن کی جانب سے شملہ گئی تھی۔ وہاں ہز ہائینس آنریبل نواب سر امیر الدین خاں بہادر والیٔ لوہارو اور سردار بہادر سر سندر سنگھ مجیٹھیا سابق ممبر انتظامیہ کونسل پنجاب کی صدارت میں جو انجمن کے جلسے ہُوتے وہ دُنیائے اُردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ہندوستان کے ہر طبقہ کے مشہور لیڈر گورنمنٹ کے بڑے بڑے آفیسر راجے مہاراجے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان جلسوں کے رُوح رواں انجمن کے لائف پریزیڈنٹ جناب خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔ سابق وزیر تعلیم تھے۔ آرمی پریس شملہ میں اُن تمام اہل قلم اور سحر طرازوں کا ایک گروپ لیا گیا تھا جنہوں نے انجمن کے جلسوں میں کچھ پڑھا تھا۔ پنڈت کرشن کانت مالویہ ممبر لیجسلیٹو اسمبلی بھی اس گروپ میں موجود ہیں۔ خان صاحب چوہدری عبدالحکیم اور مسٹر انعام الحق بی۔ اے انڈر سیکرٹری فارن آفس گورنمنٹ آف انڈیا بھی جو مجلس استقبالیہ کے وائس پریزیڈنٹ اور سیکرٹری تھے۔ اس میں وہ بھی نظر آئینگے۔ خواجہ مسعود احمد انصاری سیکرٹری انجمن ارباب علم شملہ بھی گروپ میں نمایاں ہیں۔ اُن کا اصل لطف تو دیکھنے والی نگاہوں نے لوٹا ہے۔ لیکن اُن مقتدر ہستیوں سے ہم ناظرین ہزار داستان کو صورت شناس کئے دیتے ہیں۔ جنہوں نے انجمن کے اُن جلسوں کو اُردو کی تاریخ میں یادگار بنایا۔

تاجور سیکرٹری انجمن

قابلِ توجّہ

انجمن کے ممبران مجلس ادبا کی خدمت میں التماس

مجلس ادبا کے تمام ممبران کی خدمت میں ہزار داستان ہر ماہ انجمن کی جانب سے مُفت بھیجا جایا کریگا۔ اور تمام ممبران کے نام ہمیشہ ہر نمبر میں شائع ہوں گے۔ براہ کرم جن ممبران کے ذمے انجمن کا چندۂ ممبری ہو۔ وہ پہلا نمبر وصول فرماتے ہی اپنا چندہ انجمن کے دفتر میں ارسال فرمائیں۔ کیونکہ ہزار داستان کے ماہوار اخراجات انجمن اسی صورت میں برداشت کر سکتی ہے۔ جب ممبران پوری توجہ سے اپنی ہمدردی کو انجمن کے لئے بیدار کر دیں۔

آئندہ ماہ بماہ انجمن کے آمد و صرف کی تفصیل ہزار داستان میں شائع ہُوا کریگی۔

ضیاء الدین شمسی فائینشل سیکرٹری انجمن

ANJUMAN AR AB-E-ILM SIMLA GROUP.

1st Row (Sitting, from left to right) 1 Pandit Krishen Kant Malvi 2 S Abid Ali B A LL B 3 K B Sheikh Abdul Qadir 4. Nafiz 5 K Dil Mohamed 6 Abhtar
2nd Row (from left to right) 1 Hari Chand Sharma 2 Shammas 3 K S. Ch Abdul Hakim 4 K M Ansari 5 Inam ul-Haq 6 Tilok Chand Mehrum 7. Andleb-i-Shadani 8. Zia-ud-Din Shamsi 9 Fakhir Harianwi 10 Sohan Lal Sahir
3rd Row (from left to right) 1 Sec Army Press 2 Hasrat 3 Hairat Delhavi 4. M D Tasir M A 5 Uday Singh Shaiq

پنجاب میں اُردو

(ذیل کا مضمون انجمن ارباب علم کے ایک جلسے میں جو خان بہادر شیخ عبدالقادر بی اے بیرسٹرایٹ لاء صدر دائمی انجمن کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا، پڑھا گیا تھا، اور اس سے پیشتر کہیں شائع نہیں ہوا) ایڈیٹر

اگرچہ یہ کہنا درست ہے کہ زبان اظہار خیال کا آلہ ہے۔ لیکن زبان کی یہ تعریف جامع و مانع نہیں کہی جاسکتی۔ مزاولت سے زبان ذہن کی ترتیب و فکرت کی تدوین کا آلہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو ایسی زبان سکھائی جائے، جو حشو و تنافر۔ خلط مبحث و غرابت۔ ایہام و اجتماع نقیضین۔ طول فضول اور اشکال پسندی۔ مبالغہ ضعف تالیف سے پاک ہو۔ اور آپ ایسی زبان بولنے اور لکھنے کے عادی ہو جائیں۔ اور آپ کو ایسی زبان میں غور و فکر کرنے کی مہارت ہو جائے۔ تو یقیناً آپ کی فکر مستقیم ہوگی۔ اور آپ کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد ملے گی۔

آپ جانتے ہیں کہ فکر کی قوت کا وہ درجہ ہے۔ کہ جس تک ترقی کرنے سے التزاماً انسان کا ذہن اتنا صحیح الفکر اور قوی الحرکت۔ وسیع المشاہدات اور سریع المناظرات ہو جاتا ہے۔ کہ پھر اُسے فوراً ضابطوں کے سمجھنے اور نفس نظام کے پہچاننے یعنی اصول قائم کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص فکرت پر تو قدرت رکھتا ہے مگر زبان پر نہیں۔ کیا ایسے موقعے اکثر پیش نہیں آتے۔ کہ ایک شخص آپ سے باتیں کرتے کرتے ایک سوال کے جواب میں بہت کچھ کہکر بھی اپنے کہے پر اعتماد نہیں رکھ سکتا۔ اور بالآخر اُسے اپنے کلام کی خود شرح کرنی پڑتی ہے۔ کہتا ہے۔ "میرا مطلب یہ ہے۔ . . . ." اگر اس کی ساری تقریر ساتھ ساتھ لکھی جارہی ہو۔ تو واضح ہوگا کہ "میرا مطلب" کے بعد جو کچھ قایل نے کہا۔ بس وہی جواب میں کافی تھا۔ اس سے پہلے کا قول بالکل فضول اور لایعنی تھا۔ میں کہتا ہوں کہ زبان فکرت اور قوائے ذہنی پر بہت کچھ حاوی ہے۔ اور دماغی ترتیب پر اس کا رسوخ اور اثر اس سے کہیں زیادہ ہے جو آپ سرسری طور پر خیال کر سکتے ہیں۔

ایک شخص زبان پر اتنی کم قدرت رکھتا ہے کہ

فرض کیجئے۔ لفظ " مردود " کے معنی جانکر بھی اس کے استعمال میں غلطی کرتا ہے۔ اس کا صرف موقع اور محل کے خلاف کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس تخطیہ کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اور یہ فقرہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے :-

" جب ابّا مردود شاہی میں چکلہ دار تھے " حضرات سامعین! آپ نے اس قسم کے الفاظ اور فقرے اکثر اشخاص کی زبان سے سُنے ہونگے۔ اور تبسم کیا ہوگا یا اظہارِ نفرت۔ بات یہ ہے کہ زبان فکر ت پر حاوی ہوکر قوتِ ارادی کو گویا سلب کر دیتی ہے۔ جس طرح ہکلے کے آلاتِ نطق کا مادی نقص قوتِ ارادی پر غالب آجاتا ہے۔ اور وہ بخلاف ارادہ حروف اور الفاظ کی تکرار کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک لفظ کا بے محل استعمال بوجہ مزاولت ایک ذہنی نقص بنکر قوت ارادی کا مزاحم ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ارکانِ تمدن اور تہذیب و معاشرت بھی زبان کے اثر سے آزاد نہیں یا منطقی صحت کے ساتھ یہ کہتے۔ کہ ایک جماعت کے خواصِ جمی اور ایک فرد کے شعار کا موازنہ اس کی زبان کی وضع قطع سے کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ علم لسان کے بعض ز بان ہی کو اس کا مزاج دریافت کرنے کے لئے بمنزلہ نبض کے قرار دیتے ہیں۔ انہیں وجوہ سے اور انہیں امور کو مدِ نظر رکھ کر ادیبوں نے ضابطے باندھے اور قواعد مرتب کئے۔ جن کی تفصیل علم معانی۔ علم بیان اور علم بدیع میں پائی جاتی ہے۔ اور انہیں میں سے چند کا ذکر یہاں بالاجمال کیا جائیگا۔ پیشتر اس کے کہ مَیں چند نکات پیش کروں۔ اس کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ حاشا وکلّا میرا یہ زعم نہیں کہ جن نقایص وسقایم کا ذکر ذیل میں آئیگا۔ اُن سے میرا کلام نظم ونثر بالکل پاک ہے میں تو کیا جس کسی کو یہ زعم ہو باطل ہے۔ بلکہ آپ یہ سمجھ لیں کہ ان نقایص وسقایم سے بچنے کی فکر ہمیشہ عارضِ حال رہتی ہے۔ لیکن فن اور زبان کے نکات کا اظہار ہر سمجھدار آدمی کا فرض ہے۔ آج کل ہر کہیں جمہوریت کا سکّہ رواں ہے۔ ہماری زبان بھی اس کے معرضِ عمل میں ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ جس طرح افراد آزادی اور آوارگی کے معنوں میں حدِ امتیاز قائم کرنے سے عاری ہیں اسی طرح جمہوریت کے معنی بھی غلط فہمی کا شکار بن رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ مَیں اس اصطلاح کو محض ادبی نفسِ معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ شخصیت اور جمہوریت میں فرق صرف اتنا ہے۔ کہ اوّل صورت میں قواعد کی توضیع وتعمیل صرف ایک شخص کو ودیعت ہوتی ہے۔ اور دوسری صورت میں اس ذمہ داری کے لئے چند اشخاص نامزد ہُوا کرتے ہیں۔ قواعد یا قوانین اور اُن کی تعمیل وپابندی ہر صورت میں لابدی ٹھہرتی ہے

چونکہ انسان بالطبع متمدّن ہے۔ اس کی زبان بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ضابطہ اور تنظیم کے تحت میں ہے لیکن افسوسناک استعجاب ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ ایسے اصحاب کی کمی نہیں جو اردو کو جمہوریت کی شان سے بیگانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس خواہش اور کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معمولی رسالہ یا کتاب کے مضامین سمجھنے کے لئے قاموس اور امر کوشش کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا تو انشا ایسی الجھی ہوئی اور اسلوب اتنا پیچیدہ رکھا جاتا ہے کہ شرح اور تفسیر کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے۔ میری نظر میں یہ آثار اچھے نہیں۔

ادبی۔ تاریخی اور شاعرانہ تحریروں میں غیر مانوس لغات کا استعمال، اللہ بخشے منشی نول کشور کی بدولت عربی فارسی اور ہندی کی ایسی بہت سی کتابیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں۔ جو پہلے اشرفیوں میں مشکل سے ہاتھ لگتی تھیں ہونا یہ چاہیئے تھا کہ علم کے اُن خزانوں کے جواہر اُردو کے زیور میں اس طرح جڑے جاتے۔ کہ اس کی زیب و زینت دوبالا ہو جاتی۔ انگریزی بھی اُردو جیسی غیر حرفی اور تجمیل زبان ہے۔ اس میں لاطینی۔ یونانی اور فرانسیسی وغیرہ زبانوں کے بے شمار لفظ اور ترکیبیں داخل ہیں۔ مگر وہ سموئے ہوئے ہیں۔ نہ تو بے جوڑ اور انمل ہیں۔ اور نہ اس شکل سے کہ سسرو اور سقراط۔ ڈڈرو اور دوما سے ماہر ہوئے بغیر سمجھ ہی میں نہ آسکیں بے ضرورت فارسی۔ عربی یا سنسکرت کے لغات کو اُردو زبان برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ ہر لغت کو اصطلاحی حیثیت دیں۔ اور اس کی اصطلاحی اور ادبی شان میں امتیاز نہ کریں، تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ زبان کی توسیع اور ترقی اس طرح ہوگی کہ آپ اسے ان مانوس زبانوں کے اور نیز انگریزی کے اُن ادبی خزانوں سے مالا مال کریں جو اُردو کے ظرف میں سما سکتے ہیں۔ اُردو اس ضعیف کی مانند ہے جسے قوت دینے والی اور تازگی بخش غذا کی ضرورت ہے۔ مگر وہ ثقیل اور بطی الہضم نہ ہونی چاہیئے۔ اب اگر اُسے ایسے مقویات اور مفرحات اعتدال سے زیادہ دیئے جائیں تو خوف ہے کہ آلات انہضام ماؤف ہو کر دل کے لئے خون کی کافی مقدار مہیّا نہ کر سکیں۔ جس سے دماغ کے مختل ہونے کا خدشہ ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ زبان کام کا آلہ قرار دی گئی ہے۔ جسکے توسل سے معلومات کی توسیع۔ خیال کی توسیع اور اخلاق و تمدن کی اصلاح مدِّ نظر رکھی جاتی ہے۔ وہ محض تفریح اور دل لگی کی چیز نہیں۔ جب ایک شے اپنے حقیقی مصرف سے گر جاتی ہے تو اس میں طرح طرح کے نقایص آجاتے ہیں۔ آپ ایک گھڑی سے جو اظہار وقت کا آلہ ہے زیور کا کام لینے لگیں تو وہ اپنے حقیقی مصرف

میں قاصر ہو جائیگی۔ آپ چاہینگے وہ چھوٹی ہو، پتلی ہو، ہلکی ہو، اس کا خول سونے کا ہو وغیرہ وغیرہ لیکن صحیح وقت دینے والی گھڑی بھاری ہو گی۔ اس لئے جسامت میں بڑی۔

اسی طرح زبان کا مصرف اگر محض دل بہلانا اور غزل و افسانہ گوئی قرار دیا جائے، تو پھر اس سے کوئی مفید اور اہم کام لینا مشکل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی اور کام کی بات جو کبھی کہی جاتی ہے لوگوں کے دلوں میں نہیں بیٹھتی

غیر مانوس الاستعمال لغات کلام کو فصاحت سے دُور کھینچ لے جاتے ہیں۔ اور جب ایک کلام فصاحت سے دُور ہو جائے تو تاثیر سے بھی محروم ہو جاتا ہے کلام فصیح کی تعریف علم معانی میں یہ آئی ہے۔ کہ کلام فصیح وہ کلام ہے جو غرابت۔ تنافر حروف۔ مخالفت قیاس لغوی اور عیب ترکیب سے پاک ہو۔ ایسا کلام اگر امر حق اور پاکیزہ خیالات پر محتوی ہو، تو سامع پر ضرور اثر کریگا۔ لیکن اگر وہ کلام فصیح نہیں تو اس کا اثر سامعین یا ناظرین کے دلوں پر جیسا کہ مقصود ہے ہرگز نہ ہوگا۔

غرابت کی تعریف میں اُوپر بتا آیا ہوں، یعنی کلمہ غیر مانوس الاستعمال کلام میں لانا مثلاً ریل کی جگہ سکۃ الحدید۔ شذرات۔ ملاحظات۔ استبداد۔ امتجاج حریت۔ بیاگرفی۔ ڈیفینیشن۔ ڈیپارٹمنٹ۔ آدرشیہ۔ آدرش۔ دکولوں۔ آندولن وغیرہ وغیرہ مصنفین اور اہلِ قلم کے کلام سے صفحہ اور سطر کی قید کے ساتھ نظیریں پیش کیجا سکتی ہیں۔ لیکن مذاقِ سلیم مانع ہے۔ کہ مبادا ایراد و تعریض کے الزام کا مورد ہو جاؤں۔

غرابت کے بعد ہی مخالفت قیاس لغوی کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تعریف ہے فارسی یا اُردو کے ضابطہ کے خلاف کوئی لفظ کلام میں وارد کرنا۔ جیسے ع

سودا میں اس چمن میں ہوں جوں غنچہ دل گرفت

اس مصرعہ میں دل گرفت ضابطہ فارسی کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔ دل گرفتہ کہنا چاہیئے۔

موسےٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی
فرعون کو تُو نے غرق کیا رودِ نیل کا

یہاں "رودِ نیل کا" خلافِ ضابطہ اردو استعمال کیا گیا ہے۔ اُردو کے ضابطہ کے مطابق "رودِ نیل میں" ہونا چاہیئے۔

یہ دو نقایص کلام کے اور سب نقایص سے کہیں زیادہ عام ہیں۔ اور اُردو کی اکثر تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ مقامی اور ذاتی تخصیص کا اِس میں دخل نہیں۔ لوگوں کا مذاق کچھ ایسا بگڑ گیا ہے کہ بےضرورت اور بے محل کلام میں غیر مانوس لغات عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے ٹھونسے جاتے ہیں۔ اگر پنڈتائی اور مولویت

کا زعم ذہن شریف پر ایسا ہی مسلط ہو گیا ہے۔ تو عربی، فارسی اور سنسکرت میں خامہ فرسائی کیوں نہیں فرمائی جاتی؟ بیچاری اُردو کے گلے پر شمشیر اصفہانی اور فولادِ ہندی کیوں لادی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات ذکر کے قابل ہے۔ جو نہایت عجیب ہے۔ یعنی مشاق اہلِ قلم اور مصنف خاص کر ایسے موقع پر جس کی اہمیت اعلےٰ درجے کی ہو اپنے قلم پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یا تو ایک عندیہ کو جو اصطلاحی حیثیت رکھتا ہو۔ ایک ہی تحریر میں ایک سے زیادہ الفاظ میں تعبیر کرینگے۔ جیسے ۱۹۱۵ء کی آل انڈیا مسلم لیگ کے استقبالی خطبہ ایڈریس کے لئے دو جگہ دو مختلف لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی حلیفی اور اتحادی۔ یا یہ ہوتا ہے کہ باوجودیکہ ایک تحریر ایک عالم فاضل سے لیکر گنوار کسان تک کیلئے مقصود ہو۔ لیکن ایسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں۔ کہ ان کی تشریح کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ایک لفظ کے لئے کئی کئی الفاظ خطوطِ وحدانی بطور توضیح کے لکھنے کی ضرورت عاید ہوتی ہے۔ اس کی نظیر ہیں پنجاب کی پچھلی انڈین نیشنل کانگرس کے استقبالی خطبہ سے چند الفاظ اور فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "محبت کی مے میں سرشار ہو کر" مے اور سرشار کو بدل کر اگر یوں کہتے "محبت کے نشہ میں چور ہو کر" تو پڑھے اور بن پڑھے سب سمجھ جاتے۔ دھیریہ لکھ کر خطوطِ وحدانی میں (استقلال)

لکھا گیا ہے۔ اسی طرح "نربھتا" کی تشریح "(بے خوفی)" سے کی گئی ہے۔

یہاں ایک اور نظیر بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ جو مخالفت قیاس لغوی کی ذیل میں آتی ہے ۱۹۱۹ء کے اپریل اور مئی کے مہینوں میں لاہور میں مارشل لاء یعنی فوجی حکومت کا دَور رہا۔ مارشل لاء کے افسر نے متعدد احکام رعایائے شہر کی آگاہی اور تعمیل کے لئے نافذ کئے۔ یہ احکام انگریزی اور اُردو وغیرہ کئی زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ انگریزی میں تو ان احکام کا ہمیشہ ایک ہی عنوان ہوتا تھا (مارشل لاء آرڈر نمبر . . . . .)

لیکن اُردو میں کوئی التزام ان تین لفظوں سے مرکب عنوان کا نہ بن پڑا۔ چنانچہ کم سے کم تین مختلف ترجمے ایسے احکام کے ایک ہی عنوان کے کئے گئے۔ حالانکہ اس کی حیثیت ٹھیٹھ اصطلاحی تھی۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) "اعلان فوجی قانون نمبر ۲۲"

(۲) "اعلان - فوجی قانون نمبر ۲۰"

(۳) "فوجی قانون حکم نمبر ۱۹"

حالانکہ یہ ترجمے پلٹن کے سپاہیوں یا نیم تعلیم یافتہ انگریز افسروں نے نہیں کئے تھے۔ بلکہ ایک سرکاری دفتر کے ان اہل قلم اصحاب نے جن کا کام ہی تالیف اور ترجمہ تھا۔ اب دیکھئے ان تینوں عنوانوں کے اگر بروئے قواعدِ

زبانِ اردو کچھ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ تو وہ مختلف فیہا ہیں۔
" اعلان فوجی قانون نمبر۱۲ " سے یہ پایا جاتا ہے کہ جس
طرح ہائیکورٹ کے فیصلے یا فنانشل کمشنر کے سرکلر مختلف
نمبروں میں نکلا کرتے ہیں۔ اسی طرح اہالیانِ فوج سے
متعلق جو قوانین افسرِ مجاز وقتاً فوقتاً جاری کرتا رہا۔ یہ اس
کے ایک نمبر کا اشتہار ہے۔

دوسرے عنوان میں اعلان کے بعد جو ایک لمبا
موٹا خط گھسیٹا گیا ہے۔ اس کی ہستی کو اُردو کے فنِ انشا کے
ضابطہ میں تسلیم کر بھی لیا جائے تاہم اس کلام کے کچھ معنی
قرار نہیں دیتے جا سکتے۔

تیسرا عنوان فوجی قانون حکم۔ یہ قطعاً مہمل ہے۔
اس لئے کہ یہ تینوں الفاظ الگ الگ اگرچہ اپنے معنی رکھتے
ہیں اور انہیں کلمہ کی حیثیت حاصل ہے لیکن قواعد
زبان اُردو کے بموجب ترکیب بالااسناد سے معرّا ہیں۔
لہٰذا یہ مجموعۂ الفاظ مہمل قرار پاتا ہے۔

مخالفتِ قیاسِ لغوی کی تحت میں چونکہ ترجمہ کا ذکر
آگیا ہے۔ تو یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کثرتِ استعمال
نے یورپ کی زبانوں کے بہت سے کلموں کو کلام میں ایسا
مروج کر دیا ہے اور کان ان سے اسقدر آشنا ہو گئے ہیں
کہ اب ان کی جگہ سنسکرت یا عربی۔ فارسی کے لغات لانا
یا گھڑ کر رکھنا سامعہ کو گوارا نہیں ہوتا۔ اور ایک قسم کا

مخالفت قیاس لغوی کا نقص وارد کرتا ہے۔ آزاد مرحوم
نے ایک لمبی فہرست ایسے الفاظ کی مرتب کی تھی لیکن اب
وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ ابھی تھوڑی مدّت گزری کہ
عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی ترتیب و تنظیم کی
ذیل میں اصطلاحات علوم طبیعات کے متعلق حیدرآباد
میں بڑی بحث ہوئی۔ ایک فریق کے وکیل مولانا علی حیدر
طباطبائی حیدر یار جنگ تھے۔ آپ باوجودیکہ عربی اور
فارسی کے جیّد عالم ہیں۔ لیکن آپ کا قول یہ تھا۔ کہ اگر ایک
لغت انگریزی کا ایک شے کے لئے معین ہے تو اس کو
اُردو میں استعمال کرنا بہتر ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ عربی کا
ایک سطر کا فقرہ گھڑا جائے۔

سب جانتے ہیں کہ جب کسی جماعت میں بیداری
کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ تو ہر چیز نیا اور قومی رنگ اختیار
کرتی جاتی ہے۔ مصوّری۔ موسیقی۔ شاعری۔ ڈراما۔ تعمیر وغیرہ
بھی آئین حکومت کی اصلاح اور اخلاق جمہور کے ارتقا
کے ساتھ ساتھ قومی رنگ پکڑتے جاتے ہیں۔ سیاسی آزادی
کے ساتھ ساتھ اور باتوں میں بھی آزادی آتی جاتی ہے لیکن
یہ آزادی سیاسی ہو یا کسی اور نوع کی اخذ و ترک۔ کسب اور
جلب منفعت۔ ضابطہ اور معقولیت پر موقوف ہونی چاہئے
تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں وہی
قوم پروان چڑھی جس کا دستور العمل اس شعر کی مصداق

خط ۵

تتبع زہر گوشہ یافتم
زہر خرمنے خوشہ یافتم

دُنیا کی اعلے درجے کی مقتدر اور متمدن اقوام میں سے دو کے ساتھ ہم کو خصوصیت ہے۔ جاپان اور انگلستان جاپان کے ساتھ اس بنا پر کہ وہ ہمارا ایشیائی بھائی ہے اور انگلستان سے اس لئے کہ وہ ہمارا حاکم ہے۔ جاپان کی ترقی کل کی بات ہے۔ اور انگلستان کی بیداری صرف سولھویں صدی عیسوی کے وسط سے عرصہ شہود میں آئی جسے کم وبیش تین سو برس ہوتے ہیں۔ ان دونوں قوموں کی اور ترقیات کے دفاتر کو جانے دو۔ اور صرف ایک ایک لغت کی کتاب اٹھالو تو واضح ہوگا کہ غیر زبانوں کے کتنے خیالات الفاظ اور ترکیبیں انہوں نے اپنے ہاں لے لئے اور ان کو اپنے ذہن اور زبان کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اگر اہل ہند بیدار ہونے لگے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زبان سے نادار ہوجائیں ہندی والوں نے بڑی دانائی کی کہ پنڈتوں کی ایک نہ مانی۔ اور یورپی زبانوں کے بہت سے اصطلاحی لغت یا ترکیبات جن کی آواز کانوں کو ناگوار نہ تھی اور جن کا بدل غیر مانوس سنسکرت کا لغت یا فقرہ تھا۔ جوں کے توں یا خفیف پھیر بدل کے ساتھ اپنی علمی فرہنگ میں داخل کرلئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو ہندی سائنٹیفک گلاسری۔ مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا۔ بنارس) اس اصول پر مولانا طباطبائی عثمانیہ یونیورسٹی کو چلانا چاہتے تھے۔ زبان کے باب میں ہندی والوں کی اہلیت قابلِ داد ہے۔ اور تقلید کی مستحق۔ تلک مرحوم کی گیتا رہس کا ہندی ترجمہ رائپور واقع صوبجات متوسط کے مسٹر مادھو راؤ سپرے نے کیا۔ اور ایسی زبان میں کیا۔ کہ ہر ہندی خوان جو سنسکرت نہیں جانتا اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ایک باب میں یہ فارسی اور عربی الفاظ کوئی پچاس صفحوں کے حجم میں میری نظر سے گزرے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

روزگار (یعنی شغل جو وجہ معاش ہو) طرح۔ طور۔ موقع۔ معلوم۔ ایک بار۔ پروا۔ دلیلیں پیش کرنا۔ بعد۔ علاقہ۔ سوار۔ ایک دم۔ ارادہ۔ جاری۔ بالکل۔ زور شور۔ حال۔ حال ہی میں۔ تیار۔ درمیان۔ مینار۔ عمارت۔ زمین۔ حساب۔ دربار۔ ضرور۔ حیثیت۔ صرف۔ نمونہ صدی۔ دلیلیں۔ دیر۔ یعنی۔ اصل میں۔ حصّہ۔ سلسلہ۔ صاف صاف۔ وغیرہ۔“

اگر میں ان الفاظ کے سنسکرت مترادف سنانے بیٹھوں، تو آپ میں سے اکثر اصحاب ابھی جمائیاں لینے لگیں۔ نہیں تو کھانسی ضرور چھوٹ پڑے !! اسے کہتے ہیں ادبی رواداری۔ اور تاج تبلیغ۔ ہمارے ہاں انشا پردازی کی معراج یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنے والے کو بڑا عالم اور لکھا پڑھا

سمجھا جائے۔ یہ سوچے کسی کی جوتی کہ جو کچھ لکھا ہے اس کے سمجھنے والے کتنے ہونگے۔ اخبار کو جریدہ۔ روزانہ کو روزنامہ۔ رسالہ کو مجلہ قس علی ہذا لکھ کر اپنے زعم میں اپنے آپ کو ظہوری اور بدر چاچ کی ٹکر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اڈیٹر تو مدیر کے ساتھ مدیر یا گڑگڑاتے چپت ہوا۔ اب رئیس التحریر کا من مانتا خطاب اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک رئیس التحریر ملاحظات کی ذیل میں فرماتے ہیں۔

"گزشتہ دسمبر سے —— برابر چھ جزو پر نکل رہا ہے۔ لیکن میری یہ جرأت صرف اس توقع پر تھی۔ کہ موجودہ خریداران میں سے ہر صاحب کم از کم ایک خریدار ضرور پیدا کر دینگے۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک میری یہ توقع پوری نہیں ہوئی تاہم میں مایوس نہیں ہوں۔ اور فروری کا رسالہ پھر چھ جزو پر شائع کر رہا ہوں۔ یعنی میں اپنی توقعات کو پھر باندازہ یک ماہ وسیع کرنا چاہتا ہوں۔ قدم بڑھا کر پھر اس کو لوٹانا میری فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن اگر آپ نے اعانت نہ فرمائی، تو مجبور ہو کر مجھے یہ بھی کرنا پڑیگا۔ اور رسالہ پھر ۸۰ صفحات کا کر دیا جائیگا - - - - - - - - -

"میں طبی مشورہ کی بنا پر فروری اور مارچ —— سے باہر بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ ہر چند ڈاک برابر مجھے ملتی رہیگی۔ تاہم ممکن ہے کہ تمام خطوط کا جواب بروقت نہ دے سکوں۔ اس لئے قبل سے یہ معذرت پیش کئے دیتا ہوں"

اس نثر کے ابتدائی حصہ میں تین جگہ "لیکن" آیا ہے۔ دو مقام پر یہ کلمہ محض حشو ہے۔ "یعنی" اور اسکے بعد جو کچھ درج ہے وہ بھی بے ضرورت ہے۔ دونوں "تاہم" اور "ہر چند" بھی غیر ضروری ہیں۔ یہ سارا مطلب فصیح اور سلیس اُردو میں اس طرح لکھا جا سکتا ہے :-

پچھلے دسمبر سے —— برابر چھ جز پر نکل رہا ہے۔ میری یہ جُرأت صرف اس توقع پر تھی کہ —— کے موجودہ قدردان ایک ایک خریدار تو ضرور پیدا کر دینگے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ مگر میں مایوس نہیں اور فروری کا رسالہ پھر چھ جزو پر نکال رہا ہوں۔ قدم بڑھا کر لوٹانا اپنا شعار نہیں۔ اس پر بھی آپ نے اعانت نہ فرمائی تو پھر میں مجبور ہو جاؤنگا۔ کہ رسالہ کو ۸۰ صفحات پر لے آؤں۔ - - - - - - - -

میں طبی مشورہ سے فروری اور مارچ میں —— سے باہر رہونگا۔ ڈاک تو مجھے ملتی رہیگی لیکن شاید سب خطوں کے جواب فوراً نہ دے سکوں۔ اس لئے پہلے سے یہ معذرت پیش کرتا ہوں۔

اسی رسالہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں۔ "اوائل ہفتدہم صدی میں" اگر سترھویں صدی کے اوائل" لکھ دیتے، تو کیا اُردو کی تیرھویں ہو جانے کی بدشگونی؟ بقولیکہ وزیرے چنیں شہریارے چناں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شوکت الفاظ بلند آہنگی اور زور کلام کا مفہوم غلط قرار دیا گیا ہے۔ شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ بلاغت اور کلام بلیغ اسی کا نام ہے۔ بلاغت یا کلام بلیغ کی تعریف ادیبوں نے یہ کی ہے۔ کہ ایسا کلام جس میں فصاحت اور مقتضائے حال کی موافقت پائی جائے۔ کلام بلیغ ہے کلام کے اسی وصف کو بلاغت کہتے ہیں۔

نثر لکھیں یا نظم انشا کو غریب اور خلاف قیاس لغات اور ترکیبوں سے گرانبار کر کے بلند آہنگی کا خون کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو تشبیہ اور استعاروں کی وہ بھرمار کر دی جاتی ہے۔ کہ الٰہی توبہ۔ سب مانتے ہیں کہ مرزا غالب نے ان دو صنعتوں کی مدد سے باریک نکتے شاعری کے اپنے کلام میں داخل کئے لیکن ان کے ہاں بھی ان کی بہتات سے تغزل کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور یہی نہیں کہ کلام نغز گفتاری سے دور ہو گیا۔ بلکہ مغلق ہو گیا۔ چنانچہ اپنے ارشد تلامذہ اور اہل مذاق احباب کے استفسار پر کبھی کبھی خود ان کو اپنے اشعار کی شرح کرنی پڑی۔ مرزا کا تتبع آجکل اُردو نظم کے طبقۂ جدید میں ساری وحاوی ہے۔ تتبع کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مرزا کو بھی یہ رنگ اعتدال سے خارج محسوس ہوا۔ اور آخر کو چھوڑ دینا پڑا۔ اُنھوں نے اواخر عمر میں اپنے ممدوح میر تقی کی طرف مراجعت کی۔ اور وہ اسی رنگ کے اشعار ہیں۔

جنھوں نے خلقت کو ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ پہلے فرمایا کرتے تھے:۔

سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنگلی جادہ سے

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہر آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

پھر فرمانے لگے:۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھینگے جواب میں

جان تم پر نثار کرتا ہوں
مَیں نہیں جانتا وفا کیا ہے

دیکھ کر اُن کو جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آزاد مرحوم نے تشبیہ و استعارہ کے استعمال کے باب میں جو تاکید کی ہے۔ نہایت اہم اور لازمی ہے۔ آپ

آب حیات میں فرماتے ہیں :-

"ہمارے متاخرین کو آفرین لینے کی آرزو ہوتی تو بڑا کمال یہ ہے کہ کبھی صنعت در صنعت کبھی استعارہ در استعارہ سے تنگ و تاریک کیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی۔ کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہیے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

"اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا کہ انہوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے کھلتا تھا مفت ہاتھ سے پھینک دیا وہ کیا ہے ؟ کلام کا اثر۔ اور اظہارِ اصلیت۔ ہمارے نازک خیال اور باریک بیں لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت کے ذوق شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے۔"

جاننا چاہیے کہ انسان کا نفس عقلی کی نسبت حسی کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔ اور لطف سخن کی بنیاد محاکات پر ہے۔ اس لئے تشبیہ کو علم بیان میں جگہ دی گئی لیکن لکھنے والوں کو احتیاط چاہیے کہ تشبیہیں اور استعارے کلام میں اسی قدر آئیں جسقدر کھانے میں نمک مسالہ۔ نہ کہ نمک مسالہ میں کھانا۔ تشبیہ کی بنیاد اگرچہ غواص پسندی۔ معنی آفرینی اور جدت طرازی اور تحسین کلام بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی علتِ غائی قصور اظہارِ حقیقت ہے۔ ذیل کی تاریخی مثال سے اس کی وضاحت ہو گی۔

لکھا ہے کہ حسّان ابن ثابت کے چھوٹے بچے کو ایک دفعہ بھڑ نے کاٹ کھایا۔ چہرہ پر ورم ہو گیا۔ حسّان کو خبر ہوئی۔ لڑکے سے پوچھا کس جانور نے کاٹا لڑکا جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ یہ حقیقت اس پر ظاہر نہ تھی۔ کہ جس جانور نے اسے کاٹا اس کو زنبور کہتے ہیں پھر حسّان نے پوچھا کہ وہ کس قطع کا جانور تھا بچّہ بے تکلف کہنے لگا۔ "کانّہٗ مُلتفّا حبرۃ" یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ دھاریدار چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔ بھڑوں کے پروں پر رنگین خط ہوتے ہیں۔ اس لئے انکو دھاریدا چادر سے تشبیہ دی۔ حسّان سمجھ گیا کہ بھڑ نے کاٹا تھا۔

پچھلے چالیس برسوں میں بیشمار ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوئے۔ اس سے جہاں یہ ہوا کہ انگریزی مصنّفوں کے خیالات سے اردو مالا مال ہوئی۔ یہ بھی ہوا۔ کہ اس کی انشا کی پرواز بگڑ گئی۔ بیان کا اسلوب پیچیدہ اور مغلق ہو گیا۔ اس کا الزام نہ صرف انگریزی داں اردو نویسوں پر ہے۔ بلکہ ان پر بھی جو انگریزی جانتے ہی نہیں۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو خیال دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سلاست سے ادا ہو سکتا تھا۔ گھیر گھوٹ کر ایک

لمبے اور پیچیدہ جملے میں اُلجھا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایسے جملے
تازہ تصانیف اور رسالوں میں اکثر پائے جاتے ہیں:۔

انسان جبکہ مسلّم طور پر اشرف المخلوقات مانا گیا ہے
تو چاہیے تھا کہ وہ اپنے حسیات و جذبات پر پُورے
طور پر قادر ہوتا جیسا کہ ایک مکمل انجن اپنے مختلف پرزوں
کے افعال و حرکات پر قادر ہوتا ہے۔ جبکہ ان میں سے
ہر ایک کا فعل جُداگانہ ہے۔ جن کی رفتار کو حدِّ اعتدال
کے اندر رکھنا اس کا فرض ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ
انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہُوئے بھی اپنے
پایہ سے گر جاتا ہے۔ جو آخر کار اسے گراتے گراتے
بہایم میں ملا دیتا ہے۔ جن سے تمیز کرنے کو قدرت نے
اسے عقلِ سلیم عطا فرمائی تھی۔ جو نورِ سبحانی اور دلیلِ
راہِ حقیقت بتاتی ہے۔ جیسا کہ علمار حکمار نے کہا ہے
جن کے علم و فضل کے اکناف عالم میں جھنڈے
گڑے ہُوئے ہیں۔ اور جنہیں اُستادِ خلائق مانا جاتا
ہے۔ خواہ ان کے تمام خیالات سے ہمیں اتفاق
ہو یا نہ ہو۔

اب دیکھئے یہ عبارت غرابت اور مخالفت قیاس
لغوی کی تعریف سے باہر ہے۔ لیکن کلمے اگرچہ بالاسناد
ترکیب رکھتے ہیں۔ ان کی نشست اور اسلوب ذہن سے

ناآشنا واقع ہُوئے ہیں۔ یعنی یہ عبارت باوجود اُردو زبان
کی ہونے کے اُردو کی سی نہیں جنچتی۔ متکلم کا مافی الضمیر چند
چھوٹے چھوٹے جملوں میں آسانی اور خوش اسلوبی سے ادا
ہوسکتا تھا۔ میاں بشیر احمد صاحب اور مولانا تاجور صاحب
نے اُردو پر بڑا احسان کیا کہ اپنے رسالہ ہمایوں میں اُردو
کے متعلق انعامی مضامین کا اعلان کیا۔ جو مضامین اِس
اعلان کے جواب میں لکھے گئے وہ ہمایوں میں چھپ چکے
ہیں۔ ان میں سے صرف دو مضامین کی طرف اشارہ کیا
جائیگا۔ مولانا وحیدالدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اپنے
مضمون میں لکھتے ہیں۔

" ہندی اور فارسی دونوں آریائی خاندان کی
زبانیں ہیں۔ اُردو زبان کے تیار کرنے میں ان دونوں
زبانوں نے کام کیا ہے۔ عربی ایک دوسرے خاندان
السنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کو سامی خاندان کہتے ہیں
اگر ہم اُردو کے ان الفاظ کو شمار کریں جو ہندی اور فارسی سے
لئے گئے ہیں۔ تو بمقابلہ عربی زبان کے الفاظ کے ان
کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے
ہیں کہ ہماری زبان میں آریائی الفاظ اور سامی الفاظ کے
درمیان میں چھ اور ایک کی نسبت ہے۔ اُردو زبان کی
قدرتی ساخت آریائی ہے۔ کیونکہ اس کی گرامر وہی ہے
جو آریائی زبانوں کی مشترک گرامر ہے۔ عربی کے الفاظ بےشبہ

اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ مگر ان سے اس زبان کی قدرتی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ اُردو گرامر کو عربی گرامر سے کوئی واسطہ نہیں۔"

"جو اُردو زبان کا موجودہ ادب عربی ایرانی ادب کی نقل ہے یعنی اس ادب کی نقل کی گئی ہے جو عرب اور ایران کے متحد اثر سے تیار ہوا ہے۔ اس میں ہندوستانیت کی جھلک نام کو نہیں۔"

اسی موضوع پر حضرت ناظر دہلوی اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"زبان کو سہل بنانا دراصل اس کو ترقی دینا ہے جو لوگ مغلق ترکیبیں اور ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ دیدہ و دانستہ اُردو کے دشمن ہیں۔"

میں اب اور اقتباس نہیں کرونگا۔ تاکہ طوالت سے بچوں۔ اس قبیل کے مضامین کو مارچ ۱۹۲۳ء کے ہمایوں میں تمام و کمال پڑھنا اور ان پر غور و فکر کرنا اردو کے ہر خیرخواہ کا فرض ہے۔

پروفیسر سلیم نے اپنے مضمون میں جس کا ابھی ذکر کر آیا ہوں، ایک نئی آنے والی قوم کی بشارت دی ہے۔ فرماتے ہیں۔" اس آنے والی قوم کا نام ہندلمان ہوگا۔" ایسی قوم کا یہاں کبھی ظہور ہوگا یا نہیں۔ اسے تو خلاقِ دو جہاں کی قدرت صانعہ پر چھوڑتے، بالفعل اس پر غور کیجئے کہ اردو میں ہندلمانیت جو بزرگ پیدا کر گئے ہیں اسے تو نہ مرنے دیں۔ اُردو کے سچے خیرخواہوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ ملک کے دیسی لواحقات۔ تلازمے۔ محاکات۔ روایتیں اور کہاوتیں جن سے متقدمین اردو زبان کو سجایا کرتے تھے۔ اور جن کا تتبع متاخرین نے بھی کیا۔ اب ہم نے زبان سے ان کے خارج کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

سُنئے سلف کیا فرما گئے ہیں۔

میر:
گردش سے روسیہ کی کیا کیا بلائیں آئیں
جانے ہی کے ہیں لچھن سارے اس آسماں کے
ریگستاں میں جاکے رہے یا سنگستاں میں ہم جوگی
رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہاں بسرام کیا
دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت
انچھر تو ہیں عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

سودا:
شعلہ پیرا اگر ہو تیری تیغ
کاہ سے کوہ تک ہو سب بھسمنت

جرأت:
شاید آجائے کبھی ہاتھ عروس گیتی
اسی امید پہ ہم بیٹھے ہیں آسن مارے
دل بھی اب مجھ سے دُور بھاگے ہے
اس سے مل کر اسے بھی بھاگ لگے

مصحفی: چہرہ اُتر گیا ہے نقشے بگڑ گئے ہیں
پھر ان دنوں تو میرے تمہیں سے جھگڑے ہیں

رنگین: ہے یہ گھر لنکا یہاں ہے کوئی باون گز سے کم؟
ایک سے ایک آہ بندی کی سہیلی قہر ہے

نصیر: تیرے ہی نام کی سمرن ہے مجھ کو اور تسبیح
تو ہی ہے ورد ہر اک صبح و شام عاشق کا

معروف: غیر ہفتہ کے دن آیا جو سفر سے معروف
میں نے جانا کہ بس اب مجھ پہ سنیچر آیا

ناسخ: دیکھا جسے ہو گیا وہ عاشق
تیری آنکھوں میں موہنی ہے

ذوق: گر رُخ کا بوسہ دیتے نہیں لب کا دیجئے
وہ ہی مثل ہے پھول نہیں پنکھڑی سہی

آتش: ارادہ عرش اعظم کا ہے آہ صبحگاہی کو
در فریاد رس پر چل کے اب دھونی رمانی ہے

اسیر: چاہے قسم جو یار تو کیا کیا اُٹھائیے
قرآن سر سے آنکھ سے گنگا اُٹھائیے

ہم تو پیاسے رہے مے غیر کو دی پیر مغاں
اُلٹی اس شہر میں بہتی ہوئی گنگا دیکھی

رند: نہ دلا یاد تو تسلسل اشک سمرنی یار کی کلائی کی

وزیر: اس بتِ کافر کا زاہد نے بھی نام ایسا جپا
دانہ تسبیح ہر اک رام دانہ ہو گیا

بحر: ہے کچھ نہ کچھ تو بجوگ ناحق نہیں یہ بروگ
کیسا لگا جی کو روگ اے بحر کیا حال ہے

طرۂ حسن اس صنم کے سر پہ زیبا ہو گیا
زلف کالی بن گئی۔ جوڑا کنھیا ہو گیا

ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار
کنھیا بنا وہ جو سنولا گیا

کب شعر ہم نے یار کے آگے پڑھے نہیں
کس دن ہمارے پھول ہیبر چڑھے نہیں

آپ نے دیکھا کہ متقدمین و متاخرین اُردو کیا کیا محاورے تلمیحات اور محاکات جو ٹھیٹھ ہندوستانی کیا معنی ہندوانی ہیں۔ اپنے کلام میں لاتے تھے۔ اور پھر کس صحت کے ساتھ اور برمحل۔ مرزا رفیع سودا کے ہاں کتنی مثنویاں ہندی آمیز اُردو میں ہیں۔ اور دوہے چوپائی میں ہیں۔ اور پھر یہ سب بزرگ جن کے کلام سے ابھی استفادہ کیا گیا مسلمان تھے۔ بلکہ ان کی شان میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ "ہندلسان" تھے۔ اور ان کا وطن مُلکِ سخن تھا۔

میرے محترم دوست حضرت صدر جلسہ مخزن مرحوم کے سرورق پر لکھا کرتے تھے۔ "نو کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں۔"

آجکل کی میعادی اور مستقل تصنیفیں دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ

شاید ہمارے فاضل دوست کے زمانہ میں اور اُردو رائج ہوگی کیونکہ جو زبان ہمارے آجکل کے اہل قلم لکھ رہے ہیں وہ عام فہم کیا معنی خاص فہم بھی نہیں۔ خاص الخاص فہم یا شاذ فہم ہے۔ اسے تو کروڑ کیا تو ہزار آدمی بھی مشکل سے سمجھ سکتے ہونگے۔ حال میں آپ کے ہاں ایک سوشل تقریب ہوچکی ہے۔ میرا مطلب لالہ لاجپت رائے کی دعوتِ چائے سے ہے۔ جو ترکی وفد کے اعزاز میں دی گئی۔ آپ نے ذہن نشین کئے، وہ الفاظ جولال چاند دل کے لکھیا حضرت لیاقت بے کی زبان مبارک سے نکلے۔ انہوں نے فرمایا مَیں اُردو سمجھ تو لیتا ہوں۔ لیکن آسانی اور صفائی سے بول نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہتے تو اُردو میں ہی اپنا مطلب ادا کرسکتے تھے۔ لیکن وہ ہماری میعادی لٹریچر کی زبان دیکھ کر سہم گئے۔ کیونکہ وہ ایسی زبان بولنے پر قادر نہ تھے۔

الغرض پروفیسر سلیم اور ناظر دہلوی سے میرا پورا اتفاق ہے۔ کہ اگر اُردو کو ہندوستان کی زبان بنانا منظور ہے تو اسے عربیرانی (یعنی عربی۔ ایرانی) کی بجائے "ہندُالمانی" زبان بنائیے۔ جہانتک ہوسکے اس کے معلومات اور علمیت کے خزانے میں ترقی کیجئے۔ لیکن برائے خدا اس کی اُردو تیت کو حلال نہ کیجئے۔ ۱۸۷۷ء میں جب اودھ پنچ نکلنا شروع ہوا۔ تو اکبر مرحوم نے منشی سجاد حسین صاحب مغفور کو لکھا تھا۔

مرضی تھی خدا تے دو جہاں کی
محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو آئے بک نہ جاؤ
ہشیار چلو بہک نہ جاؤ

مَیں دیکھتا ہوں آپ کو انتظار ہے کہ مَیں اپنے آج کے موضوع کے آخری حصّہ پر کیا کہونگا۔ آج کا موضوع رکھا گیا تھا "اُردو پنجاب میں"۔ لکچر کے اعلان میں پنجاب کا نام دیکھ کر ضرور کان کھڑے ہوئے ہونگے یہ سننے۔ اُردو کہاں پیدا ہوئی۔ اور اس نے کہاں نشوونما پایا۔ یہ ایسے سوال ہیں۔ جن کا جواب شافی نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی نے تفنّنِ طبع کے طور پر کبھی کچھ لکھ دیا تو اسے الہام اور سرتی سمجھ کر پلّے نہیں باندھ رکھنا چاہیے۔ آزاد مرحوم نے اس تنقیح پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اسے فقط شاہجہان آباد کا اقبال کہنا چاہیے۔ کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اُردو (اُردو بازار) کی طرف منسوب مشہور ہوگئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں اُن سے خیال کو وسعت دیکر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اسی وقت

سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔"

اگلے زمانے کے بزرگ بھی کتنے راستگو اور انصاف پسند تھے۔ آزاد مرحوم اگرچہ دہلی کے تھے لیکن انہوں نے اُردو کا سب سے اول باضابطہ شاعر ولی دکنی کو تسلیم کیا۔ امیر خسرو دہلوی کو نہیں۔ حالانکہ قرائن موجود تھے۔ کہ وہ امیر خسرو کے سر پہ سہرا باندھتے۔ مگر نہیں جو سچ جانا وہ لکھا۔ وہی بات کہی جو دھرم لگتی تھی۔ انہیں کے اس قول کی بنا پر جس سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا قرینِ انصاف ہے کہ واقعات حاصلہ کو ذہن نشین رکھ کر نہایت حزم و احتیاط سے استدلال کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پنجاب اُردو کے قدیمی منسوبات میں سے ہے۔ مبادیات کی بحث میں زیادہ دُور تک جانا بے سود ہوگا۔ واقعات بداہت سے شہادت دے رہے ہیں۔ مگر میرا رُوئے سخن عہدِ حاضرہ کی جانب ہے۔

پنجاب کو اُردو سے تعلق ہے۔ یہ امر تسلیم کرنا پڑیگا۔ اگرچہ پنجاب نے اپنی پنجابی سے کبھی سرد مہری کا برتاؤ نہیں کیا۔ اس کا باعث خواہ پنجاب کا اورینٹل کالج قرار دیا جائے۔ خواہ دہلی کا قرب اور خواجہ تاشی یا یہ واقعہ کہ اُردو کی نئی یا نیچرل شاعری کی بنیاد اہل دہلی کے ہاتھوں پنجاب میں ہے۔ اسی شہر لاہور میں رکھی گئی۔ یا یہ بات کہ جس طرح شاہ عالم ثانی کے عہد میں روہیلوں اور مرہٹوں کے ہاتھ سے دہلی کی تباہی ہو کر اس کے ہر علم و فن کے باکمال لکھنؤ میں جا بسے تھے اسی طرح ہنگامہ ۵۷ء کے بعد پنجاب میں چلے آئے۔ اور جس طرح اُس وقت پُورب کو اُردو سکھائی تھی۔ اب پچھم پر توجہ ارزانی فرمائی۔ غرضکہ علت غائی کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ بدیہی واقعہ ہے۔ کہ پنجاب ان خطوں میں سے ہے جنہیں اُردو سے خصوصیت ہے۔ اُردو کی ترقی اور توسیع میں پنجاب کا جو مہتم بالشان حصہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تصانیف و تالیفات اور تراجم وغیرہ کی تعداد جو یہاں سے ہر سال اشاعت پاتی ہے۔ حکومت اور یونیورسٹی، جس حوصلہ افزائی اور کشادہ دلی سے اُردو کی سرپرستی کرتی ہے اس دعوے کی حجت ناطق ہیں۔ اُردو ادب اور تہذیب انشا کے باب میں پنجاب کے شعرا اور اہلِ قلم کا بڑا حصہ ہے بایں ہمہ میں حیرت اور افسوس سے دیکھتا ہوں کہ اہل زبان کا ایک طبقہ پنجاب کے ساتھ نہ صرف سرد مہری کا بلکہ معاندانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ بیشک پنجاب کو ان حضرات سے ایسی توقع نہ تھی۔ لیکن اس پر بھی پنجاب نے تحمل اور تمکین سے کام لیا اور یہ اوصاف اس کے شعار میں داخل ہیں۔ اب جو یہ تذکرہ آگیا ہے تو کہنا پڑتا ہے ادبی نہیں مقامی وجوہ تھے۔ بڑے قوی اور محرک وجوہ

تھے۔ جنہوں نے لکھنؤ کے ایک حصّہ کے ہاتھوں پنجاب کے ساتھ یہ غیر متوقع سلوک کرایا۔ اول یہ کہ اُردو کے مرکزوں کے اعتبار سے پنجاب دہلی کا پیرو ہے (دیکھو مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ لکھنوی کا مضمون " دہلی اور لکھنؤ کی اُردو " مندرجہ رسالہ دلگداز مطبوعہ مئی ۱۹۱۸ء) معترضین یہ سمجھے کہ پنجاب پر حملہ کرنے سے وہ دہلی کی طاقت کو صدمہ پہنچائینگے دوسرا موجب اس قابلِ تحقیر و اکراہ تعریض کا یہ ہوا ہوگا کہ ان کو خوف ہُوا کہیں ایسا نہ ہو کہ پنجاب بھی ان کی طرح دہلی سے آزاد ہوکر خود مختار ہو جائے۔ اور کل کو انکا مقابل بن جائے۔ آپ نے اہلِ فرنگ کی امریکہ کے رواجِ غلامی کی تاریخ میں پڑھا ہوگا۔ کہ جو دیسی غلامی سے آزاد شدہ تھے وہی غلاموں پر زیادہ تشدّد کرتے تھے۔ اور اُن کی آزادی کے دشمن تھے۔ اُردو ادب کے باب میں اہلِ زبان فرقہ کی وہ پالیسی ہونی چاہیئے جس کا رنگ امریکہ کی خود مختاری کے بعد سے اپنی نو آبادیوں کے متعلق انگلستان کے تمدّن اور تدبّرِ سیاسی کے کوایف میں نمایاں ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت مجلسِ بین الاقوام یعنی لیگ آف نیشنز کے ووٹوں کا ضابطہ ہے۔ اس میں انگلستان نے کشادہ دلی یا خودغرضی نہیں، بلکہ نہایت عاقبت اندیشی اور سیاسی دانشمندی سے آسٹریلیا اور کینیڈا وغیرہ حتیٰ کہ ہندوستان کو بھی برابر کا ایک ایک ووٹ کا حق دلوایا۔ دہلی میں اِس دور اندیشی کی وجاہت تھی۔ اس نے پنجاب کی ترقیاتِ اُردو پر ہمدردی اور مسرت کا اظہار کیا۔ لکھنؤ اس سے عاری تھا۔ خواہ مخواہ مخالفت پر تل گیا۔

اس میں کوئی شکوے کی سزاوار بات نہیں۔ کوئی مقام یا خطّہ کیوں نہ ہو جہاں کی مادری زبان اُردو نہیں ایسی ہر جگہ میں آپ کو مقامی خصوصیات ملیں گے۔ جو آپس میں باعتبار نوعیت باختلاف ہمدگر متنازع فیہ ہوں گے کیوں نہ اسی قبیل سے پنجاب کے خصوصیات اُردو کو بھی تصوّر کیا جائے۔ واقعاتِ حاضرہ بیّن طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ دُنیا کی زبانیں اب اہلِ زبان کی چودھرایت کے قدغن سے نکلکر معقولیت کا پیرایہ پکڑتی جاتی ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہر کس و ناکس بیساختہ یہ کہہ اُٹھے کہ نہیں اس کے معنے یہ ہیں۔ اور ہم چونکہ اہلِ زبان ہیں۔ لہٰذا ہمارا قول صحیح اور آپ کا غلط۔ مَیں اس کی تصریح کی غرض سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل اور پنجاب کی کونسل کی رو داد سے ایک ایک نظیر پیش کرونگا۔ جن کا تعلق اسی بحث سے ہے دہلی کی کونسل میں ایک لفظ پر جو عالمانہ مباحثہ آنریبل سر جارج لونڈز اور آنریبل پنڈت مدنموہن مالوی کے درمیان ایک مسودہ قانون کی بحث کے دوران میں ہُوا۔ نہایت دلچسپ ہے۔ سر جارج نے لندن کی ایک قانونی رپورٹ سے یہ جملہ نقل کیا تھا۔

[*"An application was made on the part of Fitzerald in the court of Exchequer to set aside the verdict obtained against him by Mr Wright, which was dismissed with full costs."*] اس کا ترجمہ یہ ہے:-

ایک مرافعہ فٹز جیرلڈ کی جانب سے عدالت اکسچکر میں دائر کیا گیا۔ بدیں غرض کہ وہ حکم تعزیری جو مسٹر رائیٹ نے اس کے خلاف حاصل کیا تھا مسترد کیا جائے۔ جو مع خرچہ کے خارج کیا گیا۔

بحث لفظ "*which*"..... یا "جو" کی ضمیر سے تھی۔ کہ وہ کس کی طرف راجع ہے آیا مرافعہ کی طرف یا حکم تعزیری کی طرف۔ سر جارج پنڈت صاحب کو قایل نہ کر سکے۔ اور میری یادداشت صحیح ہے تو یہ قرار پایا۔ کہ اصل رپورٹ میں قرینہ اور ربطِ عبارت دیکھا جائے۔ مگر وہ اس وقت اجلاس میں موجود نہ تھی۔ اس قسم کا دوسرا معاملہ ستمبر ۱۹۱۳ء کے جلسہ پنجاب کونسل میں پیش آیا جبکہ آنریبل مسٹر شادی لال صاحب نے جو آجکل پنجاب کے چیف جسٹس ہیں۔ آنریبل سر مایکل فنٹن کے آبکاری کے مسودہ قانون پر انشا اور اسلوب کے اغلاط کی بناء پر ایک نہیں دو نہیں سولہ اعتراض وارد کیے۔ جو تسلیم کرنے پڑے۔ حالانکہ فنٹن صاحب اپنے وقت کے پنجاب کے سویلین جرگہ میں منشئ بے بدل تھے۔ اور لونڈز صاحب لنڈن کے ہائیکورٹ کے نامی بیرسٹر اور گورنمنٹ ہند کے وزیر صیغۂ قانونی تھے۔ اگر الہ آباد کا ایک ہندوستانی گریجوایٹ جو کبھی ہندوستان کے باہر نہیں گیا۔ لونڈز صاحب کی عبارت پر اور لاہور کے کالج کا ایک گریجوایٹ فنٹن صاحب کی انشاء پردازی پر ایسے معقول اعتراض کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ پنجاب کے ایک ادیب اور شاعر کو یہ حق نہ ہو کہ وہ اہلِ زبان کے کلام پر اظہار رائے کر سکے۔

اب جو بات یہانتک پہنچ گئی ہے تو میں اپنے پنجابی بھائیوں سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ وہ باوصف ہر امر کے اُردو کے باب میں اس غلطی سے بچیں۔ جس کا شکار ہمارے لکھنوی بھائی ہوئے۔ یہ معاملہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ مگر میں اس سے متعلق اپنا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالونگا۔ بلکہ چند اہل الرائے کے قول نقل کردونگا۔ خواجہ حالی مرحوم اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں فرماتے ہیں :-

"ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب دلی بگڑ چکی، اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا۔ اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعراء لکھنؤ ہی میں

جارہے۔ اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی۔ تو اس وقت نیچرل طور پر اہلِ لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی اور دلّی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے ...... خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں۔ کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے ---- اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔"

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو جو نامی رسالہ اُردو کے اڈیٹر اور حیدر آباد کے سررشتہ تعلیمات کے نامور افسر ہیں۔ "انتخاب کلام میر" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

"اب ایک سوال یہ باقی ہے کہ میر کی شاعری کا اثر ان کے لکھنوی ہمعصروں اور مابعد کے شاعروں پر کیا پڑا؟ اگرچہ میر صاحب کی خود اُن کے زمانہ میں بے انتہا قدر ہوئی۔ اور ابتک لوگ ان کی اُستادی کا لوہا مانتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ اُن کے آخر زمانہ نیز مابعد کی شاعری پر میر کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اہلِ لکھنؤ میں کلام کی اسقدر دل سے داد دیتے تھے۔ اس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوتے

مولوی صاحب آگے چلکر فرماتے ہیں :- "لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلّف تھی۔"

حضرت شوق نیموی اپنے بیش بہا رسالہ اصلاح میں جو ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ کے قومی پریس سے شائع ہوا تھا۔ لکھتے ہیں :-

مانا کہ ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است اور بلند پروازی و جدّت ایک عمدہ چیز ہے۔ مگر مزے کے ساتھ ہو۔ غزل میں عشقیہ مضامین درد انگیز معانی - پاکیزہ خیالات۔ سلجھی ہوئی ترکیبیں نکھری ہوئی بندشیں۔ دلکش الفاظ۔ چلبلے جملے۔ مربوط مصرعے۔ پھڑکتے ہوئے شعر ہونا چاہئیں۔ سابق زمانے سے اکثر دلّی والوں نے بیشتر ان امور کا خیال رکھا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دلّی کا رنگ کہتے ہیں۔ میر و درد کا کلیات۔ نسیم دہلوی کا دیوان۔ داغ کا کلام دیکھو کہ کسقدر مقناطیسی اثر رکھتا ہے۔ لکھنؤ کے اگلے شعراء میں سے صبا کی شیریں بیانی اور سحر کی سحر بیانی دلّی والوں سے ملتی جلتی ہے۔ اور اب تو اکثر لکھنؤ والوں نے اپنی طرز چھوڑکر وہی رنگ اختیار کیا ہے۔"

گورنمنٹ ہند امپیریل گیزیٹر آف انڈیا جلد دوم میں ہندوستانی زبانوں اور دیسی بولیوں کے اعلےٰ ترین ماہر ڈاکٹر گریرسن کی زبان سے فرماتی ہے :-

متاخرین اردو شعرا میں سے جو دلی کے مقلد تھے ولی محمد نظیر قابلِ ذکر ہے۔ اگرچہ وہ آگرے میں پیدا ہوا تھا.... اس کی تصانیف اس فارسیت سے پاک ہیں۔ جس نے شعرائے لکھنؤ کی شاعری کا چہرہ بگاڑا۔"

"اہل زبان" جو ایک مرکب اضافی ہے خواہ آپ اسے بامعنی قرار دیں یا مہمل لیکن کیا آپ یہ سُنکر خاموش ہو جائینگے کہ مدراس کے ایک پنجابی خواں شخص نے یا فرید پور کے تین کوڑی بابو نے ایسی ہیر لکھی کہ فضل شاہ اور وارث شاہ کے ہم پلہ ہے۔ آپ یہ خود اندازہ فرمالیں۔ کہ آپ کے دل کو اس وقت کیا احساس ہوگا۔ مَیں یہاں اہل زبان کا جھگڑا اُٹھانے نہیں آیا ہوں۔ جو اصحاب مجھے جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ مَیں مقامی تعصبات سے بالاتر ہوں۔ لیکن آپ ہی فرمایئے۔ کہ اس کا کیا علاج کہ جب میں ہیٹ کی پنجابی بولتا ہوں تو حالانکہ وہ لفظ صحیح معنی میں اور محل مناسب پر بولا گیا ہے۔ مگر اس کے سُنتے ہی آپ ہنس پڑتے ہیں۔ کیونکہ تیس سال آپ کا ہمسایہ ہونے کے باوجود بھی میں اس لفظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتا۔ وجہ کیا کہ مَیں جس گھر اور شہر میں پیدا ہوا تھا وہاں پنجابی نہیں بولی جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک فن یا زبان کی پشتینی مزاولت اور ایک زبان کے مادری ہونے کا امتیاز سائنس جدید کی رو سے بھی تسلیم کرنا پڑیگا۔ کیا مَیں یہ کہنے کی مبادرت کروں کہ پنجابی میں بھی فصاحت کا معیار معین ہے۔ مَیں اصلی وڈی ہیر کی طرف اشارہ کرونگا۔ میاں محمد الدین دھرٹیاولی اس کتاب کے دیباچہ میں وارث شاہ اور فضل شاہ کی ہیر کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"لیکن جو شاعر اپنی عمر میں ایک ہی کتاب کو بار بار سوچ کر بناتا رہا ہو۔ اور اس کی زبان کو مانجھ مانجھ کر صاف کرتا رہا ہو۔ قاعدہ کی بات ہے کہ وہ اس کی تصنیف جہانگیر منظوری اور عام مقبولیت حاصل کر کے رہتی ہے۔"

آگے چلکر لکھتے ہیں :-

"جس شاعر نے اپنی زبان میں محاورات و مصطلحات عوام کو خوب دل کھول کر بیان کیا ہو......"

اسی طرح اگر ہمارے ملک کی آبادی کے ایک حصہ نے پشت در پشت اپنا یہ مشغلہ رکھا ہو کہ زبان کو مانجھیں اور محاورات و مصطلحات کے صحیح استعمال کے طریقے قرار دیں۔ تو وہ سچ مچ ہم سب کیلئے مایۂ ناز ہونے چاہئیں۔ جس طرح سیّد وارث شاہ مرحوم پنجابی زبان کے باب میں ہیں۔ ایک

زبان کا روزمرّہ اور محاورہ ایسی چیزیں ہیں۔ کہ اس شخص سے سیکھنی ہی پڑیں گی۔ جس کی وہ مادری زبان ہے صاحب قاموس کی نظیر آپ کے سامنے موجود ہے۔ ہاں فن اور قاعدہ کے باب میں کسی کو کسی پر شرف حاصل نہیں دہلی سمجھے گی کہ اس کی زندگی اکارت نہیں گئی۔ جب پنجاب کے گھروں میں پہلا لفظ جو بچّہ کو سکھایا جائیگا وہ اُردو ہو۔

جن کو اہلِ زبان کہا جاتا ہے اور جو واقعی ہیں بھی، اُنہوں نے پنجاب سے سرد مہری کا سلوک کبھی نہیں کیا۔ داغ مرحوم ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

اہلِ کلکتہ سے لائق فائق

اہلِ لاہور ہوتے جاتے ہیں

(صفحہ ۲۵ ضمیمہ یادگارِ داغ)

مولوی سیّد مقبول احمد صاحب الہ آبادی ہمایوں کے اسی نمبر میں جس کا آگے ذکر آچکا ہے لکھتے ہیں:۔

"شبلی اکاڈمی - مولانا شرر کا ذاتی مطبع وطن اور پیسہ اخبار کی ایجنسیاں انجمن ترقی اُردو، اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا دفتر بالفعل اُردو لٹریچر کی اشاعت کا مرکز ہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ اُردو کی اشاعت کے باب میں پنجاب کو دہلی اور لکھنؤ کے پہلو بہ پہلو رکھا گیا ہے۔

دسمبر ۱۹۰۵ء کے مخزن میں میرے فاضل دوست صدرِ جلسہ نے ایک تجویز اُردو اکاڈمی قائم کرنے کی شائع فرمائی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کا نام وضع کرنے میں بندہ بھی شریک تھا۔ یہ نام اُردو سبھا قرار پایا۔ ساری اُردو دُنیا اُردو کی ٹکسال اور اُردو کے مرکز یا مرکزوں نے نہایت گرمجوشی اور خلوص دلی سے اس تجویز کا استقبال کیا۔ متعدد اقتباس طولِ کلام کا موجب ہونگے۔ مَیں اس جگہ لکھنؤ کے رسالۂ معیار سے چند سطریں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ اُردو کے متعلق ایک پنجابی تجویز کو کس طرح پذیرا کیا جاتا ہے:۔

"ہمارے مکرم دوست ایڈیٹر مخزن کی مبارک تحریک و تجویز پر لکھنؤ یا دہلی کے علاوہ اور اہلِ کرم بھی کمر ہمت مضبوط باندھ لیں تو بہت جلد یہ خارزار گلستاں نظر آئیگا کسی جگہ اور کسی مقام پر کوئی متنفس ایسا نہیں جو فاضل بیرسٹر شیخ عبدالقادر صاحب کی اس بیش بہا تجویز کا تہ دل سے لبیک کہکر مؤید نہ ہو۔ ہم سب ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہماری زبان اُردو ہے واقعی لیڈر قوم مسٹر عبدالقادر صاحب کی یہ تجویز کہ اُردو سبھا قائم ہو اور اس کے ذریعے سے زبانِ اُردو کا پژمردہ باغ ہرا ہرا نظر آئے۔ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔"

آپ نے دیکھا کہیں مغایرت یا رشک کی نام کو بھی بو آتی ہے؟ اور پھر اس بات کو اٹھارہ بیس برس ہونے آتے زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اور اگر آج اُردو سبھا ایک جیتی جاگتی ہستی نظر نہیں آتی تو اس کی جگہ آپ کی انجمن ارباب علم موجود ہے۔ آپ اس کے ارکین ہیں نواب حیدر یار جنگ۔ حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی۔ مولانا شوق قدوائی لکھنوی۔ حضرت چکبست لکھنوی اور حضرت شیدا دہلوی کے نام نامی پائینگے۔ اگر ان حضرات کے دل میں آپ کی طرف سے . . . . کچھ بھی مغایرت یا استحقار کی بو ہوتی تو وہ کب آپ کے ساتھ ملکر اُردو کی خدمت کرنے پر رضامند ہوتے

آج ایک اور بات جو آپ سے کہنی ہے یہ ہے کہ تنقید سے گھبرانا نہ چاہئے۔ مَیں اپنے دوستوں سے یہی کہا کرتا ہوں کہ جب تمہارے کلام کی تنقید کی جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھا کرو کہ اس سے کیا کیا اور کہاں تک فایدہ اُٹھا سکتے ہو۔

نواب حیدر یار جنگ طباطبائی اپریل اور مئی ۱۹۲۰ء کے مشترکہ زمانہ میں ادب الکاتب کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ "میرے ایک دوست اہل زبان انگریزی و فارسی پڑھے ہُوئے ہیں میرے شاگرد بھی ہیں۔" ان حضرت کی تحریر کی غلطیاں اور اصلاح پہلو بہ پہلو شائع کی گئی ہیں۔ جن سے واقعی سبق لینا چاہئے۔

مَیں پھر عرض کرونگا۔ کہ تنقید سے گھبرانا نہ چاہئے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ تمہارا نقاد کہانتک تمہارے شکریہ کا مستحق ہے۔ یعنی اس کے اعتراض کہاں تک درست ہیں۔ ان سے فایدہ اُٹھاؤ اور باقی کو بھول جاؤ۔ نقادوں کو ہر کہیں بُرا سمجھا گیا ہے۔ انگریزی کے شاعر جیمس رسل لول نے ایک نہایت دلچسپ نظم میں نقادوں کی تنقید یا تضحیک کی ہے۔ اس کا نام رکھا ہے۔

اس کے آخری حصہ کے چند اشعار کا ترجمہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ تصرف اتنا ہی کیا گیا ہے کہ "جانسن کے تذکرۂ شعرا" کی جگہ اپنے اُردو کے شعرا کے تذکرہ آبِ حیات کا نام ڈال دیا ہے۔ اور میر انیس کی ایک مشہور رباعی کے مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اسی سے اس انگریزی کے ترجمہ میں ہندوستانی ماحول پیدا ہو گیا ملاحظہ ہو۔

حصّہ استعداد کا فطرت نے ہر اک کو دیا
جو ملا جس گوں کا اس سے کام ویسا ہی لیا
شاعری تصنیف کی ہے قابلیت جس سے دور
وہ بھی تنقیدی مضامین لکھ کے چھاپے گا ضرور
کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے لے کے تنقیدیں کرے
زعم باطل بغضِ ذاتی اپنے شائع کر دتے

اس طرح ہر طفلِ مکتب آج بن بیٹھا ادیب
ہیں رسالے اس کی شہرت کے لئے گویا نقیب
پڑھ کے جستہ جستہ اور بے سمجھے وہ آبِ حیات
دیکھنے لگتا ہے اپنے پیشِ پا کل کائنات
بے تکلف جس طرح سیٹی بجاتا ہے کوئی
یوں وہ کردیتا ہے تنقیدِ اک بڑی تصنیف کی
دھیان کب قولِ امینی پر ذرا دیتا ہے وہ
پھول اور کلیاں ہٹا کر کانٹے چن لیتا ہے وہ
ایک ہے وقعت میں تعریض اس کی اور توصیف بھی
بلکہ ذم سے بڑھ کے ہے مدح وثنا اس کی بری
ڈھائی چاول لیکن اپنے وہ بگھارے گا ضرور
اسپہ وہ لکھے گا تنقید اور لکھے گا ضرور
اس طرح بٹ کر بناتا ہے وہ اک محکم رسن
جس کے پھندے میں لٹک جاتا ہے خود وہ پر فتن
دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں سب برملا
بھائی یہ کرجگ ہے کرنی کا یہ دیکھو پھل ملا

خاتمہ پر ایک گزارش کرونگا۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ قوم کی زبان بنانا یعنی اسے ہر پہلو سے ترقی دینا ایک انسان یا ایک جرگہ کا کام نہیں۔ اس کے لئے جمہور متعلقہ کے مساعی درکار ہیں۔ کام جو کرنا ہے۔ وہ بے اصول توسیع کا نہیں۔ بلکہ اس میں زبان کی تہذیب و تدوین بھی شامل ہے اسکی علمی استطاعت میں ترقی کے ساتھ اس کی لطافت اور ترنم کا بھی لحاظ رکھنا ہے۔ الفاظ کے ذخیرہ اور محاسن ادبی کی بھی توفیر لازم ہے اور یہ بھی مدِ نظر رکھنا ہے۔ کہ جو خوبیاں پہلے سے اُردو میں موجود ہیں وہ کہیں زائل نہ ہو جائیں۔ اس کام میں پنجاب دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ مل کر ممتاز اور نمایاں حصہ لے سکتا ہے۔ اس میں انگریزی دان عربی دان اور سنسکرت دان اہل زبان اور غیر اہل زبان سخن سنج اور ناظم و ناثر علمی اشغال میں مصروفِ کار اور صاحبِ تخیل۔ صیرفی اور فلسفی سخن فہم اور نقاد و مبصر سب کے شریک کار ہونے کی ضرورت ہے۔

صاحبِ علم و فن و فہم و ادب ہیں درکار
باغِ اُردوئے معلےٰ میں تب آئے گی بہار

کیفی

شامِ تاریک

(۱)

چھائی ہے جہاں پہ شامِ تاریک
سر پر آنچل سیاہ و باریک

دریا ہیں ظلمتوں کے جاری
خاموش ہے کائنات ساری

آواز رحیلِ کارواں بند
دشواریِ راہ کا بیاں بند

طائر سب آشیاں میں روپوش
خواب معصومیت سے مدہوش

گلزار و ہزار سار خاموش
یعنی ساری بہار خاموش

رنگینیِ زر فشانِ انجم
شادابیِ کاروانِ انجم

نورِ مہتاب کا تبسّم
قطعہ دریا کے خرام کا ترنّم

گلہائے نظر نواز کے رنگ
گلہائے چمن طراز کے رنگ

تاریکی انتظار میں گم
اندوہِ غم آشکار میں گم

مطرب کا ساز سو گیا ہے
نغمہ خاموش ہو گیا ہے

(۲)

انوار سیاہ جاگ اُٹھے ہیں
عشرت کے گناہ جاگ اُٹھے ہیں

روشن ہے دیارِ عیش کوشی
رندی مستی شراب نوشی

نغمے رقصاں ہیں عاشقی کے
شہرے ہیں طریق آذری کے

غلبہ مستی نے پا لیا ہے
نیکی نے مُنہ چھپا لیا ہے

برسینگے یہاں گناہ کے پھول
عشرت کی جلوہ گاہ کے پھول

کچھ نشّہ فضا میں پیرتا ہے
شیطان ہوا میں تیرتا ہے

(۳)

وہ حسن سیاہ کار نکلا		وہ غیرتِ صد بہار نکلا
اک بار چمک اٹھیں فضائیں		اکبار مہک اٹھیں ہوائیں
شاداب و کامران و گل پوش		رنگینیٔ عاشقی سے بیہوش
پیراہنِ ریشمیں بدن پر		گلرنگ و مرمریں بدن پر
انداز شباب گل بدامن		آنکھوں میں شمع حسن روشن
ہر ایک ادا ہوس کا پیغام		ہر ایک نگاہ عشرت انجام
آنکھوں کی سرگینیوں میں		قطعہ غمزوں کی نازنینیوں میں
اطوار تمام دلبری کے		انداز تمام ساحری کے
شانوں پر فتنہ خیز گیسو		بکھرے ہوئے مشک ریز گیسو
ہر عشوۂ بے قرار عریاں		ہر غمزۂ سحر کار عریاں
پاؤں میں لچک جوانیوں کی		بارش ہے گلفشانیوں کی
لغزش رفتار کی غضب ہے		گویا کہ رواں ہے موجۂ مے
ہونٹوں پر موجزن تبسّم		گویا کہ چمن چمن تبسّم

(۴)

اس حسن سے ہے بہار ہستی		رنگینیٔ زر نگار ہستی
ننگ و ناموس کو بھلا کے		بس میں ہو تو میں کہوں یہ جا کے
"تم زینتِ شامِ زندگی ہو		تم صبحِ دوامِ زندگی ہو"

عابد

تبدیل نظریہ

حامد۔ عزیز۔ احسن۔ یوں تو سبھی نئی روشنی کے تعلیم یافتہ لطیف الخیال اور با مذاق نوجوان تھے۔ مگر اسحاق اپنی غیر معمولی فراوانیِ شعریت کے سبب "یارانِ طریقت" کے مجمع میں ایک نمایاں خصوصیت کا مالک تھا۔ اُس کی زندگی کا جذباتی پہلو اسقدر روشن اور واضح تھا کہ دوسری تمام خصوصیات اس میں مدغم ہوگئی تھیں۔ اُس کے چہرہ کی بشاشت، لبوں کا دائمی تبسّم اور ہر وقت زیرِ لب گنگناتے رہنا، اُس کے جذباتِ رفیق کے صحیح مظہر تھے۔ یوں تو ہر حسین چیز کو دیکھ کر وہ پھڑک اُٹھتا تھا۔ مگر اُس کے خیال کی کبھی نہ رُکنے والی روانی اور اُس کا جوشِ اضطراب جو دیوانگی کی حد تک پُہنچ جاتا، اُس وقت قابلِ ملاحظہ ہوتے تھے۔ جب اُس کا موضوعِ کلام نسائیت۔ ہو۔ وہ کہتا تھا "حسن جہاں بھی ہو، اور جس رنگ میں ہو دلکش ہے۔ اگر تاج محل کی حسین نقاشی اور رنگین دلفریبی اُسے از خود رفتہ و مجنوں بنا دیتی تھی، تو قطب الدین ایبک کے عبرت آموز مزار کی کس مپرسی اور شکستہ حالی بھی اُس کے جذبات میں ایک طوفان بپا کرکے اُس کی آنکھیں پُرنم کرسکتی تھی۔ اب وہ یکسر سوز و گداز ہوتا اور بار بار کہتا۔ "یہاں حُسن سوگوار ہے اور وہاں محوِ آرائش"۔

وجدان اس کے نزدیک آرٹ یا اُسی کے الفاظ میں حُسن کی انتہا تھی۔ کیونکہ وہ آرٹ کو حُسن سے کوئی علیحدہ چیز نہ سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صنّاع کا کام حُسن کی تخلیق ہے اور اسی تعریف کے ماتحت وہ اپنے تئیں نصف صنّاع سمجھتا۔ کیونکہ وہ حُسن کا خالق نہ تھا پرستار تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُس کی فطری خصوصیات تھیں یا اکتسابی مگر کچھ بھی ہو اُس کا زاویہ نگاہ بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف خوش رہنا چاہتا تھا۔ اور حُسن کا مشاہدہ اُس کے نزدیک حصولِ مسرت کا بہترین ذریعہ تھا۔ اُسے اپنے ارادے پر پُورا پُورا اختیار تھا۔ اور پیہم کوشش سے اب یہ بات اُس کی فطرت میں داخل ہوگئی تھی۔ کہ وہ ہمیشہ دُنیا کے روشن پہلو پر نظر رکھتا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا اور نہ جاننا چاہتا تھا۔ کہ زندگی کا کوئی تاریک پہلو بھی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں اور وہ ریل کے سفر میں ہمراہ تھے۔ برسات کا موسم تھا، اور وہ اپنے مخصوص انداز میں برسات کی دلفریبیوں اور اُن امنگوں پر جو ایک حسّاس طبیعت میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ تقریر کر رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوگیا، تو میں نے کہا۔ "بھئی اسحاق تم کہتے تو

بالکل درست ہو۔ جب کبھی کوئی حسین صورت دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے یا کسی کا تصور ہی دماغ میں آتا ہے تو طبیعت میں ایک سرور سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے لئے ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ رُوح ایک بھاری بوجھ سے آزاد ہو گئی ہے۔" اُس نے میری طرف گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "یاد رکھو، یہ بھی ایک کمزوری ہے کیوں نہیں تم اُس سرور کو دائمی اور رُوح کی مسرت کو غیر فانی بنا لیتے؟"

"کیونکر؟" مَیں نے اس بیتابی سے پُوچھا۔ کہ گویا وہ کوئی کیمیا کا نسخہ بتا رہا تھا۔

"کیونکر؟" اُس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "یہ تو معمولی بات ہے۔ تمہارا یہ خیال تو صحیح ہے۔ کہ حُسن کا مشاہدہ طبیعت میں مسرت اور رُوح میں سرور پیدا کرتا ہے۔ اور اگر تم واقعی چاہتے ہو کہ وہ سرور چوبیس گھنٹے قائم رہے تو اُس کا بہترین طریق یہ ہے۔ کہ ہر وقت حسن کو اپنے پیشِ نظر رکھو۔"

مَیں نے کچھ مایوسانہ انداز میں کہا۔ "بہت مشکل! کسی حسین صورت سے دوچار ہو جانا تو اتفاق کی بات ہے۔ ورنہ تمام دن اندر کے اکھاڑے کی سیر کسے نصیب ہوتی ہے؟"

"آہ یہی تو مصیبت ہے کہ تم لوگ عمداً خوشی کو ضائع کر دیتے ہو۔ دُنیا ایک نگار خانہ ہے جس کا ہر نقش اپنے اندر کچھ نہ کچھ حسن رکھتا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ "دیدۂ دل وا کرے کوئی" سطحی نظر رکھنے والے شخص کو چیزیں بدصورت اور ڈراؤنی بھی نظر آتی ہونگی۔ مگر کیسا خوش نصیب ہے وہ شخص جو ہر شے کو حسین دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں ہر شخص واقعات عالم اور اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو ایک خاص عینک سے دیکھنے کا عادی ہے۔ بعض کے شیشے رنگدار اور بعض کے سفید ہیں۔ ہر چیز دیکھنے والے کی عینک کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اور وہ نادان سمجھتا ہے کہ اُسے چیز اپنی اصلی حالت میں نظر آ رہی ہے۔ اگر حبشی آئینہ میں اپنی بدزیب اور بھونڈی صورت دیکھ کر آئینہ کو مطعون کرتا ہے، تو اُس میں آئینہ کا کیا قصور؟ میری بات مانو۔ اگر واقعی خوش رہنا چاہتے ہو، تو ہر چیز میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ آج سے کئی سال قبل اسی نکتہ کو فطرت شناس غالب کس خوبی سے بیان کر گیا ہے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

دیکھو وہ نوحۂ غم میں حسن اور رونق تلاش کرتا ہے۔ اور یہی کامیاب و مسرور زندگی کا راز ہے۔"

اسحاق کا نقطۂ نگاہ غلط ہے یا صحیح اس سے ہمیں

بحث نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ خود اس پر عمل پیرا تھا۔ نظرِ اوّل میں تو یہ خیال مجذوب کی بڑ سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اسحاق کی ذات ایک بیّن ثبوت تھی اس بات کا کہ یہ ایک اصول ہے جس پر کاربند ہونا ممکن ہے۔

علم و فضل کے لحاظ سے بھی اسحاق ہماری سوسائٹی کا ممتاز فرد تھا۔ وہ کسرِ نفسی سے گو اپنے تئیں نصف صنّاع کہتا مگر میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو کسی صنعت کو کامیاب بنا سکتی ہیں۔ وہ ادیب تھا۔ شاعر تھا۔ اور خوش تقریر تھا۔ اُس نے گفتگو کرنا بھی ایک آرٹ کی طرح سیکھا تھا۔ باتیں کرتے وقت وہ اپنے مخصوص انتخاب الفاظ کی مدد سے بہت جلد مخاطب پر چھا جاتا تھا۔ ہماری بزم میں جب کسی مسئلہ کے تصفیہ میں آرا مختلف ہوتیں اور انفرادی رائے کی قربانی بھی گوارا نہ کی جا سکتی۔ تو اس وقت اسحاق اپنی جادو بھری تقریر سے ہم سب کو مبہوت کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیتا اور لطف یہ ہے کہ کسی کو شکایت کا موقع بھی نہ رہتا تھا اُس کے الفاظ۔ لب و لہجہ اور اضطراری و غیر اضطراری حرکات تمام تیقن اور وثوق سے پُر ہوتی تھیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں کسی مضبوط و مستحکم چٹان پر قائم سمجھتا ہے۔ جہاں سے بادو باراں کا زبردست طوفان بھی اُسے نہیں ہٹا سکتا۔ برسات کی بھیگی ہوئی ہوا اور ابر آلود فضا۔ بہار کی ولولہ انگیز صبح اور خمار آفریں شام خزاں کی حسرتناک اور سنسان خاموشی۔ غرض قدرت کا ہر منظر اور فطرت کا ہر پہلو اسحاق کے لئے بے شمار دلآویزیوں کا مرقع تھا۔ اُس کی آنکھیں ہر مقام پر اکتسابِ حسن میں مصروف ہوتی تھیں۔ دیہات کی سادہ اور چپ چاپ زندگی میں ' ندی کی خاموش روانی کے دھیمے دھیمے سروں کے ساتھ یا گھٹنوں گھٹنوں ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کے درمیان اگر وہ مسحور جذبات ہو کر لطیف سے لطیف شعر کہہ سکتا تھا، تو ریلوے اسٹیشن کے پُر شور ہجوم یا غروب آفتاب کے بعد انارکلی بازار کے دھکم دھکے میں وہ اکثر اپنے افسانوں کے کیریکٹر تلاش کرنے کے لئے نکل جاتا تھا۔ ملک کے ادبی رسالوں میں آئے دن اُس کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے مگر جیسا میں نے پہلے کہا ہے۔ وہ اپنے الفاظ کا بہترین ذخیرہ اور سارا زورِ قلم اُس وقت کے لئے اٹھا رکھتا تھا۔ جبکہ اُس کا موضوع نسائیت ہو۔ عورت اس کے نزدیک حسن کا مظہرِ ارتقائی تھا۔ اور وہ کہتا تھا کہ قدرت کی بہترین صنعت عورت ہی ہے۔ اور اس کی تخلیق کے بعد اب صانع خود اپنے فن کا اس سے بہتر نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ یوں تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ اور زندگی کا ہر شعبہ اسے بیتاب کرنے کے لئے اپنے اندر کچھ نہ کچھ

حسن رکھتا تھا۔ مگر اُس کی وارفتگیٔ مزاج اور رفعتِ خیال اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی جب وہ کسی دوست کے چھیڑ دینے سے نسوانی حسن پر تقریر کر رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا سینہ تلاطمِ جذبات سے پھٹا جاتا ہے۔ اور وہ اُن تمام خیالات کو جو اُس کے اندر سما نہیں سکتے۔ ہمارے سامنے بیک وقت نکال دینا چاہتا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر خدا جانے وہ کیا کچھ کہ جاتا تھا۔ اس قسم کی شاندار تقاریر سے ہمیں مرعوب کر لینا تو اس کیلئے آسان تھا۔ مگر شادی شدہ احباب اس کی ان حرکات پر ہمیشہ ہنستے اور اُس کے تمام جوش و خروش کو جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ ایک روز مسعود نے تنگ آکر اُسے ٹوک دیا۔ "اسحاق رہنے بھی دو اپنے اس فلسفہ کو ہم خوب سمجھتے ہیں۔ اگر تم پرستارِ نسائیت ہو تو تمہیں مبارک ہو یاد رکھو یہ پرستش اُسی وقت تک قائم ہے جبتک صنفِ نازک کے کسی فرد سے تمہیں دائمی مواصلت جسے اصطلاحِ عام میں شادی کہتے ہیں، نصیب نہیں ہوتی۔ بیسویں صدی کا ہر نوجوان تمہاری طرح ایامِ شباب میں رنگا رنگ کی دلفریبیوں سے مغلوب ہو کر عورت کو پھول، موسیقی اور خوشبو کا مجسمہ سمجھا کرتا ہے۔ مگر دیکھیں گے چند سال بعد تمہارا نظریہ کیسے قائم رہتا ہے۔ ہمارے محدود تمدن میں اتنی گنجائش تو ہے نہیں کہ ہماری شاعرانہ بلند پروازیاں حدِ تکمیل تک پہنچ سکیں

اس لئے مجبوراً ہم اُس شعریت کو جو دراصل ہماری ہی طبائع کا جزو ہے۔ جنس مقابل میں منعکس دیکھتے اور نادانی سے سمجھتے ہیں کہ عورت سراسر شعریت اور سراپا لطافت ہے۔"

"اگر تمہاری کم نظری اور کوتاہ اندیشی نے ہمارا تمدن محدود اور معاشرت خراب کر دی ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اگر تمہاری لاعلمی اور خود غرضی نے عورت کے حقوق ملیامیٹ کر کے اُسے سوسائٹی میں کوئی درجہ نہیں دیا، تو اس کے لئے تم قابلِ ملامت ہو۔ نہ کہ وہ معصوم ہستی جو ہر بار تمہاری بہیمیت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔" اسحاق بڑے طیش سے گفتگو کر رہا تھا۔ "ابتدائے آفرینش سے لیکر آجتک تم جیسے لوگوں کی جنہوں نے عورت کو ہمیشہ ذلیل کیا۔ اور اُسے اپنا آلۂ کار بناتے رکھا۔ کمی نہیں رہی۔ مگر یاد رہے کہ دُنیا بدل چکی ہے۔ تمہارے خیال کے لوگوں کا دائرہ بہت تنگ ہو رہا ہے۔ عورت کے احسانات کے شکریہ سے تم کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے، اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ دُنیا کا بہترین سرمایہ اور مرد کا نصف بہتر عورت ہی ہے۔ اگر شادی کے بعد عورت کی شعریت اور عظمت تمہاری نظروں میں گر جاتی ہے۔ تو اس کا الزام تمہاری ایجاد کردہ رسومات اور تمہارے اخلاق پر آتا ہے۔ اپنے آرام

اور مسرت کے لئے تو تم ساتویں آسمان تک پہنچ جاؤ۔ مگر
جہاں اُس ذات کا سوال آجائے جو تمہارے غم والم میں
شریک۔ تمہاری عزت و ناموس کی محافظ۔ تمہاری
بے دام کی غلام ہے۔ تو تمہاری آنکھوں میں خون اُتر آتا
ہے۔ وہ خوشنما پھول جو کھلی ہوئی ہوا میں، سورج کی جاں بخش
حرارت میں اور موسم کی تازگی میں پرورش پاکر ایک عالم
کو معطر کرسکتا ہے۔ تمہارے ہاتھوں سڑی ہوئی کلیوں
کے اندر آہنی دیواروں کے پیچھے شعاع آفتاب اور ہوا
کے جھونکے سے محروم قبل از وقت مرجھا جاتا ہے۔ یہ
انسانیت پر ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن "

" درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا"

رد عمل شروع ہونے کو ہے۔ اور یاد رکھو اس کا سب
سے پہلا وار تم ایسے لوگوں پر ہوگا۔"

- - - - - - - - - - -

ایک روز اسحاق مجھ سے ملا۔ وہ کچھ اُداس سا نظر
آرہا تھا۔ میں نے افسردگی کا سبب پوچھا۔ تو بڑی بد دلی
سے بولا۔ "ہم لوگ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان
میں رہکر عورت کی فطرت کو سمجھنا ایک امر محال ہے۔ میں
حیران ہوں کہ اس کم فہمی کے باوجود ہم کیونکر اس دھڑلے
سے نسائیات پر اپنا قلم اُٹھاتے ہیں۔ یہ ایک فحش غلطی ہے
جس کا اعادہ ہم سے ہر روز ہوتا ہے۔"

"تم نے یہ کیسے جانا؟" میں نے اس خیال سے
دریافت کیا کہ دیکھوں اس کی نئی تحقیقات جس کی بنا پر
یہ فیصلہ صادر ہوا تھا کیا کہتی ہے۔

" ہمارے ہاں پردے کی غیر معمولی سختی اور رسم و رواج
کی پابندی ہونے کی وجہ سے کوئی موزوں اور مستقل طریقہ
انتخاب زوجہ کا قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے شادی سے
پہلے عورت ہمارے لئے ایک معما ہی رہتی ہے۔ میں سمجھتا
تھا کہ متاہل ہونے کے بعد عورت کے مزاج کی تمام کیفیات
کو سمجھنا آسان ہوتا ہوگا۔ مگر بشیر کی شادی نے یہ خیال بھی
باطل کردیا۔ بشیر کی شادی اس لحاظ سے بہت اہم تھی۔ کہ
اُس کی بیوی خود اُس کا انتخاب تھی۔ اور شادی سے قبل
وہ ایک دوسرے سے سالہا سال سے محبت کر رہے تھے
طبائع بالکل یکساں ہونے کے سبب انہیں یہ عام دقت
بھی پیش نہیں آئی، جو شادی کے بعد ایک دوسرے کے
خیالات سے ناواقف ہونے کی صورت میں پیدا ہوا کرتی
ہے۔ مگر مجھے بہت تعجب ہوا، جب بشیر نے گزشتہ ملاقات
میں مجھ سے یہی شکایت کی جو آج میں تم سے کر رہا ہوں۔
وہ کہتا تھا کہ شادی کے بعد عورت کی زندگی کا صرف ایک
پہلو یعنی اُس کا بیوی ہونا ہم پر واضح ہوسکتا ہے۔ اور
اس حالت میں بھی وہ ہم سے بے تکلف نہیں ہوتی۔ کیونکہ
ماحول سے متاثر ہوکر وہ ہمیشہ اپنے تئیں ہم سے کمتر،

ہی سمجھتی ہے۔ اور جبتک اختلافِ مراتب کا یہ احساس قائم ہے اُس وقت تک آپس میں گھل ملکر ایک دوسرے کی فطرت سے کماحقہٗ آگاہ ہونا ناممکن ہے۔ دوستوں کے ساتھ ہمارے تعلقات موانست ابتدا میں معمولی ہم جلیس ہونے کی حیثیت سے رسمی علیک سلیک تک محدود ہوتے ہیں۔ پھر روزمرّہ کی ملاقات اور تبادلہ خیالات سے وُہ تعلقات ایک غیر شعوری طور پر بڑھتے بڑھتے دوستی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور بالآخر وہ دوستی رُوح کی ایک اشتہا بن جاتی ہے۔ جس سے علیحدگی بعض اوقات ہماری زندگی تلخ کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ دوستی پیدا کرنے میں فریقین کی جانب سے کبھی کوشش نہیں ہوتی اور عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی اس معاملہ میں ارادہ و کوشش سے کام لیا گیا ہے حصولِ مقصد میں ہمیشہ ناکامی کا سامنا ہوا ہے۔ جب تک سوسائٹی میں عورت کے لئے موزوں مقام نہیں بنایا جاتا اور جبتک ہندوستان کی فضا میں یہ خوشگوار تبدیلی نہیں ہوتی کہ عورت سے جائز دوستی، جس کا نتیجہ مناکحت نہ ہو قائم ہو سکے۔ تب تک یاد رکھو عورت کی فطرت کو سمجھنا محال کیا ناممکن ہے۔ اور ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے ہاں کبھی کوئی اچھا افسانہ یا صحیح شعر لکھا جا سکتا ہے؟ مثال کے طور پر اُن اقوام کو دیکھ لو، جن کے تمدّن میں، عام مجلسوں، نمائشوں اور تماشہ گاہوں میں عورت کو ویسی آزادی حاصل ہے جیسی مرد کو۔ وہاں آئے دن علم النفس کے نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ وہاں بہتر سے بہتر افسانے اور عمدہ سے عمدہ شعر لکھے جاتے ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ عورت مردوں کے درمیان ملی جُلی ہمیشہ اُن کی بالیدگیِ خیال کا باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان کا نسوانی تمدّن بہت پست ہے۔ اس کو بلند کرنا مَیں نے اپنا مقصدِ حیات مقرر کر لیا ہے اور اب میری کوششیں اسی کام کے لئے وقف ہو چکی ہیں۔

- - - - - - - - - - -

حالات و واقعات تبدیل ہوتے گئے اور گردش کے عالمگیر اصول کے ماتحت ہمارا مجمع احباب بھی منتشر ہو گیا۔ اسحاق لاہور سے کہیں باہر چلا گیا۔ اور ایک مُدّت تک لاپتہ ہی رہا۔ اُس کے مشاغل کے متعلق بھی مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک روز سہ پہر کے قریب مَیں ہوا خوری کے لئے باہر نکلا، تو دیکھا اسحاق صاحب بڑی تیز رفتاری سے سڑک پر چلے جا رہے ہیں۔ اُس کو پہچاننے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ کیونکہ اُس کی بالکل قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ اسحاق جو اس سے قبل انگریزی فیشن کا دلدادہ اور لباس کے بہترین نمونہ میں بڑی آن بان سے دیکھا جاتا تھا اب ایک بدزیب سی شروانی اور پاؤں میں ایک گرد آلود

بوٹ جسے کئی ہفتوں سے پالش نصیب نہ ہُوا تھا، پہنے کسی دھن میں محو خدا جانے کہاں جا رہا تھا۔ اُس کی ہیئت کذائی سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ کانگرس کمیٹی کا والنٹیر ہو گیا ہے۔ مَیں نے آواز دی اور ملتے ہی پُوچھا کہ "تم کب سے یہاں آئے ہُوئے ہو؟"

"کل آیا تھا۔"

"تو پھر ملے کیوں نہیں؟"

"یونہی کچھ مصروفیت رہی۔ وقت نہیں مل سکا۔"

وہ کچھ رسمی سا جواب دیکر مجھے ٹال دینا چاہتا تھا۔ مَیں نے پھر پوچھا۔ "اب کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا الارنس باغ کی طرف ٹہلنے کے لئے نکلا تھا۔"

مَیں بھی ساتھ ہو لیا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم باغ پہنچ گئے۔ بینچ پر بیٹھتے ہی مَیں نے پھر سلسلۂ سوالات شروع کر دیا۔

"تم اتنا عرصہ کہاں رہے؟ تم نے خط بھی کوئی نہیں لکھا۔"

اسحاق۔ "مَیں ایک جگہ نہیں ٹھہرا بلکہ بہت سے مقامات پر پھرتا رہا ہوں۔"

مَیں۔ لیکن تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تم کچھ کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے ہو۔"

اسحاق۔ "ہاں صحیح ہے۔ لیکن یہ ایک لمبی واردات ہے جسے شاید تم سُننا پسند نہ کرو۔"

مَیں۔ "نہیں مَیں ہمہ تن اشتیاق ہوں۔ تم شروع کرو۔"

"ناصر" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولنا شروع کیا۔ "دُنیا میں عموماً واقعات خلاف توقع پیش آتے رہتے ہیں۔ ہم سمجھتے کچھ ہیں مگر پردۂ غیب سے کچھ اور ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایسی مایوسیاں کچھ وقت کے لئے ہماری پریشانی کا باعث تو ضرور ہوتی ہیں۔ مگر اندازہ کرو اُس ناکامی کا جو ہمیں ایسی مہم میں پیش آتی ہے جس کی تیاری پر ہم اپنا تمام سرمایۂ حیات خرچ کر چکے ہیں جس کی کامیابی وناکامی پر ہماری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔"

اسحٰق خاموش ہو گیا مگر مَیں نے بے صبری سے کہا۔ "ہاں آگے چلو۔" اُس نے ایک دل شکستہ آواز میں کہا۔ "بس ایسی ہی ایک ناکامی سے مَیں دو چار ہُوا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا سُننا چاہتے ہو؟

مَیں نے پھر اصرار کیا۔ "نہیں مجھے تفصیل درکار ہے۔"

"اچھا تفصیل ہی سہی۔ یوں تو ہر چیز جس کا تعلق اس سفلی طبقہ سے ہے اپنی مقررہ میعادِ حیات کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ حتےٰ کہ انسانی خیالات اور اصولوں کی بھی ابتدا و انتہا ہے۔ مگر رُوح کی موت سب سے زیادہ

عبرتناک ہے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ ایک مرتبہ مَیں نے بڑے دعوے سے اپنا نصب العین ہندوستان کے نسوانی تمدن کا احیا قائم کیا تھا۔ یہ خیال جنون کی طرح مجھ پر قابو پاکر میری رُوح کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوچکا تھا۔ اور عرصہ تک جگ ہنسائی کے باوجود مَیں انتہائی کوشش کے ساتھ اُس پر عمل بھی کرتا رہا۔ مگر افسوس یہ تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور اور ناپائیدار نکلا۔ مَیں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اور اب حواس باختہ تشنہ کام لق ودق صحرا کے قلب میں کھڑا ہوں۔ مگر پانی کا کہیں بھی نام ونشان نہیں بشیر کی شادی کو ایک قابلِ تقلید نمونہ سمجھ کر مَیں ہمیشہ احباب میں اُس کا تذکرہ کیا کرتا تھا طرزِ انتخاب کی دقتوں کے باوجود اُس نے اپنی پسند کی بیوی تلاش کر لی تھی۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو مگر یہ بتانا میرا فرض ہے کہ بشیر اب ہمیشہ کے لئے دُنیا سے رخصت ہوچکا۔ اور اُس کی موت نے مجھے بھی جیتے جی مار دیا ہے۔"

اسحاق کے ان الفاظ سے مَیں سُن سا ہوگیا۔ مگر میری طرف التفات کئے بغیر اُس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"یہ الفاظ کہتے ہوئے میری زبان کانپ رہی ہے معلوم ہوتا ہے۔ میرے اعصاب میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ مگر کیا کروں مجھے بہرصورت حقیقت کو بےنقاب کرنا ہے۔ بشیر فیروزپور میں تھا کہ یکایک تپِ محرقہ میں مبتلا ہوگیا۔ اکیس دن تک وہ چارپائی پر پڑا رہا۔ علاج وغیرہ میں بہت کوشش کی گئی۔ اور جب وہ صحتیاب ہوکر اٹھا تو صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ ایک ہفتہ تک تو خیر گزری۔ مگر اس کے بعد پھر بخار ہوگیا۔ یہ تپِ محرقہ کا دوسرا حملہ تھا۔ جس سے کوئی خوش قسمت ہی جانبر ہوتا ہے۔ سترہ روز بشیر بستر پر بیہوش پڑا رہا۔ اور آخر مر کر اس ضیق سے نجات حاصل کی۔ جس مکان میں بشیر بیمار تھا۔ اُس کے عین مقابل کسی ٹھیکیدار کا مکان تھا۔ وہ ٹھیکیدار مَیں اس کا نام بھول گیا۔ اچھا خوش وضع اور جامہ زیب نوجوان تھا۔ بشیر کی بیماری کے زمانہ میں مَیں نے اُڑتی ہوئی خبر سُنی۔ کہ بشیر کی بیوی اور اُس ٹھیکیدار کے درمیان کوئی سلسلۂ نامہ وپیام جاری ہے۔ لیکن اس بات کو باور نہ کر سکتا تھا۔ اور نہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ روز بعد بےشمار زبانوں سے یہ بات میرے کانوں تک پہنچی۔ کہ اُن دونوں کے آپس میں مدت سے تعلقات قائم ہیں۔ ناصر یقین کرو مَیں پاگل ہوگیا تھا۔ بشیر کی چارپائی پر سر رکھ کر مَیں پہروں روتا اس لئے نہیں کہ وہ بسترِ مرگ پر اپنی قیمتی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ دنیا کیسی بےحیائیوں اور ناانصافیوں سے لبریز ہے۔ بشیر اپنے دوستوں کے لئے واقعی ایک بے بہا نعمت تھا۔ مگر اُس کی بیوی جسے اُس نے کن خواہشوں سے حاصل کیا تھا۔ محبت کے پردے

میں کیسی خطرناک سازش کر رہی تھی میں اکثر سوچتا ہوں اکہ یا اللہ اس نازک اور حسین جسم کے اندر جسے ہم عورت کہتے ہیں تو نے کیسا بے رحم اور خود غرض دل رکھا ہے۔ وہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے کس سنگدلی اور دلیری سے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دُور کر دیتی ہے۔ اور مرد ہمیشہ اُس کے افسونِ چشم سے بیوقوف بنا ہُوا اُس کی اُنگلیوں پر ناچتا ہے۔ دُنیا میں کتنی خونریزیاں اور تباہیاں محض اِس ہستی کی خاطر وقوع میں آئی ہیں۔ مرد ہمیشہ اپنی فطری سادہ لوحی اور کمزوری کے سبب عورت کی ایک جنبشِ چشم اور خفیف سے تبسم پر جس میں دھوکا۔ عیاری، قتل اور نفس پرستی کی آمیزش ہوتی ہے۔ اپنی جانیں فروخت کر دیتے ہیں۔ عورت اُسی وقت تک عورت ہے۔ جبتک وہ زیورِ عصمت سے مزیّن ہے۔ ورنہ ایک تباہ کن بلا ہے۔ جس کی زد سے محفوظ رہنے ہی میں سلامتی ہے۔ حقیقت مجھ پر روشن ہو چکی ہے اگرچہ دیر میں ہُوئی ہے۔ اور ساتھ ہی زندگی کا مقصد بھی نمایاں ہو گیا۔ مَیں اپنی تحریر اور تقریر سے لوگوں کو بتاؤں گا کہ عورت ایک زہر ہے۔ اُس سے بچو۔ ورنہ اُس کا ایک گھونٹ طرفۃ العین میں تمہیں نارِ جہنّم میں پہنچا دیگا۔ اُس کی سیاہ عنبریں زلفیں جن پر تم اپنی زندگیاں نچھاور کرتے ہو، ایک خونخوار اژدھے کی طرح تمہارے گرد چنگل مار کر تمہارا خاتمہ کر دیں گی۔"

"اسحاق تم بہت سختی سے کام لے رہے ہو۔" مَیں نے بڑے صبر سے اُس کی لمبی تقریر سُننے کے بعد یہ الفاظ کہے۔

"نہیں۔ نہیں۔ انصاف یہی چاہتا ہے۔" یہ کہہ اپنی لکڑی کا سہارا لیتے ہُوئے وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ناصر کیا سوچتے ہو؟ آؤ تم بھی میرے ہمنوا ہو جاؤ۔ عورت سے انتقام لینا ہی میری زندگی کا مقصدِ وحید ہے۔"

عاشق بٹالوی

تاثرات

سدا بہارِ محبت کا لالہ زار رہے
نگاہِ شوق رہے حسن باوقار رہے

فروغِ حسن اسی طرح سحرکار رہے
بہارِ ناز پہ یارب یونہی بہار رہے

زہے نصیب جو وہ مائلِ ستم ہی رہیں
زہے نصیب جو دل میرا داغدار رہے

ہزار ضبط کیا پھر بھی ضبط ہو نہ سکا
وہ دل ہی کیا کہ بھلا جس پہ اختیار رہے

ہمارا عشق رہا کامرانِ مستیٔ غم
کہ شادکام رہے گو بہ حالِ زار رہے

شبِ فراق سعادت مسرتوں میں کٹی
کوئی خیال تھا وہ جس سے ہمکنار رہے

"سعادت منہاس"

حبّات

کوئی تدبیر بن آئی نہ کوئی آسرا نکلا
ہوئے برباد غم آخر یہ قسمت کا لکھا نکلا

چمن کا پتّہ پتّہ خون سے بلبل کے رنگیں ہے
چمن کا ذرّہ ذرّہ رازِ غم سے آشنا نکلا

ازل سے رنگِ حسن و عشق میں دلبستگی نکلی
کوئی رنگیں ادا نکلا کوئی رنگیں نوا نکلا

شمیمِ گیسوئے محبوب تیرے دوش پر نکلی
ترا احسان مرے دل پہ اے موجِ صبا نکلا

ظہیر

ناٹک کتھا کے سلسلے کی تیسری کہانی

مالتی اور مادھو

(از بھو بھوتی)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی پاٹ شالہ میں دو لڑکے پڑھتے تھے۔ ایک کا نام بھوری واسو اور دوسرے کا دیورت تھا۔ دونوں ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ اور انہیں ایکدوسرے سے بڑی محبت تھی۔ ایک ہی دن ان کی شادی ہوئی۔ اور ایک ہی دن دیورت کے ہاں لڑکا جس کا نام مادھو رکھا گیا اور بھوری واسو کے گھر لڑکی جس کا نام مالتی تجویز ہوا پیدا ہوئی۔ دونوں دوستوں نے کامندکی کی ناکامی بدھ مت کی ایک اُستانی کے ہاتھ پر سوگند کھائی کہ جب یہ بچے جوان ہونگے تو ان کا آپس میں بیاہ کیا جائیگا۔ ایک دن دونوں دوست مزے سے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ بھوری واسو پدماوتی (اجین) کے راجہ کا اور دیورت کندینا پور (برار) کے راج کا وزیر مقرر ہوا ہے۔ اور دونوں عمر بھر میں پہلی دفعہ ایکدوسرے سے علیحدہ ہوکر اپنی اپنی نوکری پر گئے۔

اس واقعہ کے ۱۸ سال بعد جب یہ بچے جوان ہوکر بیاہ شادی کے قابل ہوئے، تو بھوری واسو اور دیورت نے اپنے لڑکپن کا عہد پورا کرنا چاہا۔ مگر آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ مالتی اور مادھو کے بیاہ کو ہی لیجئے۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ اسمیں روڑا اٹکیگا۔ لیکن رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اور وہ بھی ایسی کہ جس کا کسی کو سان گمان نہ تھا۔ کون جانتا تھا کہ نندن جیسے بڈھے کھوسٹ کو مالتی سے بیاہ کا شوق چرائیگا۔ اور راجہ اپنے ایک اہلکار کی سٹھیائی ہوئی آرزو پوری کرنے کے لئے بہار اور خزاں کو گلے ملانے کا تماشہ دیکھنے پر تل جائیگا۔ راجہ کے اشارہ کرنے کی دیر کہ بھوری واسو کو باچھیں کھلاکر یہ کہنا ہی پڑا "کہ مہاراج وہ آپ کی پتری ہے۔ جسے چاہیں دان کریں۔ خانہ زاد کو تو اپنی جان تک سے دریغ نہیں۔" مگر یہ سب منہ کی باتیں تھیں ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی پیاری بیٹی کو کنوئیں میں دھکیلنے پر راضی ہو جاتا۔ اُسے راجہ کے حکم سے سر پھیرنے کی مجال نہ تھی۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ بلا اُوپر ہی اُوپر ٹل جائے۔ راجہ بھی ناراض نہ ہو اور مالتی کا

بیاہ بھی مادھو سے ہو جاتے۔ آخر اس نے مائی کامندکی کو سارا قصہ سنایا۔ اور اس سے پوچھا۔ کہ اب کیا کیا جائے مائی کامندکی نے ان دونوں لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے پدماوتی میں پاٹ شالہ کھولا تھا۔ اور مالتی بھی اس کے پاس پڑھتی تھی۔ کامندکی نے بھوری واسو کو تسلی دی۔ اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ایک تدبیر کرتی ہوں۔ اگر کام دیو کی عنایت سے وہ پٹ پڑی تو پو بارہ ہیں۔ پھر اس نے وزیر کو اپنی تدبیر سمجھائی۔ اور وہ مطمئن ہو کر گھر گیا۔

بھوری واسو کے جانے کے بعد کامندکی نے دیورت کو ایک چٹھی لکھی، کہ مادھو کو فوراً پدماوتی بھیج دیا جائے تاکہ وہ زندگی کا ضروری سبق بھی پڑھ لے۔ دیورت کامندکی کے اشارے کو سمجھ گیا۔ اور اس نے مادھو کو پدماوتی روانہ کر دیا۔ جب مادھو کامندکی کے آشرم میں پہنچا۔ تو مالتی اور نندن کے بیاہ کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ اور اس سلسلہ میں مالتی کو اکثر مندر جانا پڑتا تھا۔ ایک دن کامندکی کو پتہ چلا کہ کل صبح مالتی پوجا کے لئے مندر جائیگی۔ تو اس نے مادھو سے کہا کہ کل مدن دیو کے مندر میں بڑا بھاری میلہ لگیگا۔ تم بھی جانا اور کہیں بیٹھ کر سیر دیکھنا۔ دوسرے دن مادھو پو پھٹتے ہی مندر کے باغ میں جا بیٹھا۔ اور پھول توڑ کر ہار گوندنے لگا۔ مالتی اس سے پہلے تاروں کی چھاؤں میں پہنچ چکی تھی۔ اور اب پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر باغ کی سیر کو آ رہی تھی۔ مادھو اور مالتی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گھور کر دیکھا۔ مگر اس انداز سے دیکھا۔ کہ اگر کوئی دیکھتا ہو تو یہی سمجھے کہ انکی آنکھوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ مالتی تو چلی گئی اور مادھو اپنے دل میں اس کی تصویر اتار تا رہ گیا۔ اس طرح مائی کامندکی کی تدبیر کی پہلی منزل کامیابی سے طے ہوئی۔

مادھو اپنی خیالی دنیا میں گھوم رہا تھا۔ کہ ایک رسیلی آواز نے اس طلسم کو توڑا۔ وہ چونک پڑا سر اُٹھا کر دیکھتا ہے تو ایک دوشیزہ کے پیارے پیارے مکھڑے سے مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شوخی کا متحرک بت تھا یا حیا کا چلتا پھرتا پتلا۔ تھوڑی دیر تک ایک کی شوخی اور دوسرے کی حیرت میں جنگ ہوتی رہی۔ آخر لڑکی ہی نے زبان کھولی اور کہا۔ "صاحب آپ نے یہ خوبصورت ہار جن پھولوں سے بنایا ہے وہ میری دودھ بہن مالتی کو بہت بھاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ آپ نے سارے باغ کا عطر نکال کر اس ہار میں رکھ دیا ہے۔ اور اگر وزیر بھوری واسو کی اکلوتی بیٹی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے تو کون اچنبے کی بات ہے ہاں میرا نام! تو جناب داسی کو لونگکا کہتے ہیں۔" مادھو کا خیال تھا کہ اس کی آنکھ ہی سحر ہے۔ اب اسے معلوم ہوتا

کہ خیر سے زبان بھی جادو سے خالی نہیں۔ وہ چپ تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر لفظ نہیں ملتے تھے۔ اُس نے پہلے ہار کی طرف دیکھا۔ پھر لونگکا کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اور یہ جو یہ کی گود سے تازہ تازہ نکلے ہوئے نوجوان کا دماغ اس بات کا فیصلہ کرنے سے عاجز ثابت ہُوا کہ ہار اور لونگکا میں سے کون زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کی نگاہیں پریشان ہو کر سارے باغ میں پھیل گئیں۔ اور اس عورت کی تلاش میں دوڑنے لگیں۔ جو مادھو کی نظروں میں لونگکا کے حسن کا لاجواب جواب تھا۔

اُنھوں نے مالتی کو پھاٹک کے پاس کھڑے پایا۔ دونوں نے پھر ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ مادھو کی نگاہیں ڈھیٹھ تھیں جمی رہیں۔ مگر مالتی نے آنکھیں جھکا لیں ذرا مُنہ پھیر لیا۔ ہاں درست ہے اس لئے تاکہ اُس کے چہرے کی لالی اس کے دل کا راز فاش نہ کر دے۔ مگر یہ روک تھام بے سود تھی۔ مادھو تو یہ بات پا چکا تھا۔ کہ مالتی کا دل بھی اس کسک سے بیگانہ نہیں، جس پر اس کا دل لوٹ ہے۔ دونوں کی نگاہوں میں چھریاں چلنے کا یہ نتیجہ ہُوا۔ کہ مادھو نے ہاری مان لی۔ اور ہار لونگکا کے حوالے کر کے ہتھیار ڈال دیے۔ لونگکا فاتحانہ انداز سے دوڑی دوڑی گئی، اور ہار مالتی کے نذر کیا۔ مادھو کی نگاہیں یہ دیکھ کر پھولی نہ سمائیں کہ مالتی نے

اسے لیکر جھٹ انگیا میں رکھ لیا۔ گویا یہ بھی ایک راز تھا جسے وہ دل میں بند کرنا چاہتی تھی۔ مالتی اور لونگکا پھُولوں کی باس کی طرح باغ سے نکل گئیں اور مادھو کی نگاہ میں ساری فضا پر اوس پڑ گئی۔ وہ اپنے دل کو خیال کے کھلونوں سے بہلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کہ اس کا دوست مکراندا آنکلا۔ مادھو نے اسے سارا ماجرا سنایا۔ تو وہ سنّاٹے میں آگیا۔ اور اس آرزو کے راستہ میں ہزاروں کانٹے نظر آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ نندن سے مُنہ لگے اہلکار کے مقابلہ میں مادھو کی وہی بساط تھی جو راجہ بھوج کے سامنے گنگا تیلی کی ہو سکتی ہے۔ ہاں ہار کا معاملہ ایسی بات تھی جہاں پانی مرتا تھا۔ اور جس کی اوٹ میں امید آنکھ مچولی کھیلتی تھی۔ اس کا دماغ معاملہ کی اُونچ نیچ کی ادھیڑ بن میں پھنسا تھا کہ مکراندا کا نوکر کالاہمسا آگیا۔ اور اُس نے اپنے آقا کو ایک تصویر دکھائی۔ مکراندا نے تصویر دیکھی، تو چلّا اُٹھا۔ "مادھو کی تصویر! کس نے اُتاری! تمہیں کہاں سے ملی؟"

کالاہمسا مکراندا کا پُرانا نوکر اس کے بہت مُنہ چڑھا گیا تھا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "اجی کس نے اُتاری اُس نے جس کی تصویر مادھو جی اپنے دل میں چھپائے بیٹھے ہیں۔ ملی کہاں سے، تو اس کا قصّہ سُننے آئی جی

کی داسی مندریکا نے لونگکا سے لی اور اس سے ذرا میں
مانگ لایا۔ بات یہ ہوئی کہ مادھو جی کسی دن گھومتے گھامتے
مالتی کے محل کے پاس گزرے۔ مالتی جھروکے سے دیکھ
رہی تھی۔ اسے آپکی شکل پسند آئی۔ اور کاغذ پر اُتار لی بس"
یہ سُنکر مکراندا نے مادھو سے کہا۔ کہ "اب ایک کام کرو
تم بھی مالتی کی تصویر اُتار کر اس کے پاس بھیجدو۔" بہت
اصرار کے بعد مادھو نے قلم اُٹھایا اور چند منٹوں میں مالتی
کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ مکراندا نے دیکھ کر کہا۔ "اوہو!
یہ تو ہو بہو مالتی ہے۔ صرف بولنے کی کسر ہے۔" اتنے
میں داسی مندریکا آئی اور کالاہمسا سے تصویر مانگنے
لگی۔ اس نے وہی تصویر دیدی، جو مادھو نے ابھی ابھی
تیار کی تھی۔ مندریکا اسے دیکھ کر بھچک رہ گئی۔ مگر جب
کالاہمسا نے اسے تصویروں کو تبدیل کرنے کا مطلب
سمجھایا تو وہ بھی خوشی سے اس ملی بھگت میں شریک
ہوگئی۔ اور مالتی کی شبیہ کو لیکر لونگکا کے گھر کی طرف
روانہ ہوگئی۔ اب وہاں اور ٹھہرنا بیکار تھا۔ اس لئے مکراندا
اور مادھو بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

لونگکا کو تصویر ملی تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی
جھٹ مالتی کے پاس لے گئی۔ تصویر کی آڑ میں نندن
کو خوب جلی کٹی سُنائیں۔ اور مادھو کے خیال کو پکے پاؤں
مالتی کے دل میں جما دیا۔ اس طرح مائی کامندکی کی تدبیر
کی دوسری منزل بھی ختم ہوگئی۔ چند دن گزرنے کے بعد
مائی نے مناسب خیال کیا۔ کہ لگے ہاتھوں مالتی اور
مادھو کا ایک اور ملاپ ہو جاتے۔ اس نے مالتی کو
شیو جی کی مورتی پر پھول چڑھانے کی ہدایت کی۔ اور
یونہی باتوں باتوں میں یہ بات مادھو کو جتا دی۔

دوسرے دن مالتی ٹوکری میں پھول ڈالکر مائی
کے ساتھ شوالہ کو چل پڑی۔ مادھو پہلے ہی سے جھاڑیوں
میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر باہر آنے لگا تو مائی
نے اشارہ سے روک دیا۔ اور مالتی سے مادھو کی باتیں
کرنے لگی۔ جن کے جواب میں مالتی کو کہنا ہی پڑا کہ سارے
سنسار میں مادھو ایک نوجوان ہے۔ جس میں آدمی
کی ساری اچھائیاں پائی جاتی ہیں۔ مادھو مزے
لے لے کر یہ شربت کے گھونٹ پی رہا ہے کہ یکایک
ہلڑ مچا۔ کہ ایک شیر پنجرے سے چھوٹ گیا ہے۔ اور
ستھراؤ کرتا چلا آرہا ہے۔ ابھی اس خبر کی دہشت ان
کے دلوں کو پورے طور پر دہلانے نہ پائی تھی کہ مائی کی
ایک داسی چیختی چلاتی آئی کہ "ہے ہے شیر نندن کی
بہن اور مالتی کی سہیلی مندریکا کو دبوچا چاہتا ہے۔
نگوڑی ہزار جان سے دوڑ رہی ہے پر خیر نظر نہیں آتی۔
ہے ایشور! اب کیا ہوگا۔ کوئی نہیں جو اس آڑے
وقت میں اس کے کام آئے۔ شیر مالتی کی سہیلی پر حملہ

کرے۔ اور مادھو نچلا بیٹھا رہے۔ ناممکن تھا۔ اس نے بجلی کی طرح جھاڑیوں کی گھنگھور گھٹا سے نکلکر شیر پر دھاوا بول دیا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے مکراندا شیر کے مقابل ہوچکا تھا۔ اور دونوں میں چوٹیں چل رہی تھیں شیر مکراندا کو دباتے چلا جاتا تھا۔ مگر مادھو کے کھانڈے نے لڑائی کا نقشہ بدل دیا۔ اور اب شیر کو ہار ماننا پڑی۔

اُنہوں نے چند منٹوں میں شیر کو تکہ بوٹی کرڈالا۔ مگر خود بھی زخموں سے چور ہوکر زمین پر گر پڑے۔ بیشک حیا عورت کا سب سے قیمتی زیور ہے۔ اور اسی سے اس کا سہاگ قائم رہتا ہے۔ اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ وہ حیا پر حیات کو قربان کردینے اور ان پر جان نچھاور کرنے کو کھیل سمجھتی ہے۔ مگر جو نقشہ مالتی کے سامنے تھا اسے دیکھ کر تو مردوں کا کلیجہ پانی ہوکر بہ جاتے۔ وہ تو عورت ذات تھی۔ آخر کہانتک ضبط کرتی۔ اور اُسے یوں خاک پر تڑپنے دیتی جس نے اس کی سہیلی کے لئے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا۔ جب مالتی سے نہ رہا گیا تو اُس نے بڑھ کر بیہوش مادھو کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور اس کے ہاتھ سہلانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد مادھو کو ہوش آگیا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کے ہوش بار بار گم ہوں اور ہر بار مالتی انہیں ڈھونڈ لاتے۔ اس کی آرزو تھی۔ کہ یہ روگ طول میں مالتی کے بالوں سے بھی دو ہاتھ آگے رہے۔ اور تیمارداری کے نشہ کا تار ٹوٹنے میں نہ آتے مکراندا کے گھاؤ بھی خالی نہ گئے۔ اور مدنیدکا کے دل میں گھر کرکے رہے۔ یہ سب کچھ تو ہُوا۔ لیکن مالتی اور مادھو کی شادی میں جو رکاوٹیں پیدا ہوئی تھیں، جوں کی توں کھڑی تھیں۔ اور ان کے رفع ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ہر طرف سے نراس ہوکر مادھو نے جی میں ٹھان لی۔ کہ جو ہو سو ہو وہ بھوتوں پریتوں سے مدد لیگا۔ اور راجہ کے سر پر جو نندن کے بیاہ کا جن چڑھا ہے اسے اُتاریگا۔

سیاہ کالی رات سائیں سائیں کررہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان نے چاند تاروں کے غم میں ماتمی لباس پہنا ہے۔ ہو کا عالم تھا۔ اور انتہا کی سنسانی تیز ہوا کے تند جھونکے اس خوفناک منظر کو اور زیادہ ہولناک بنارہے تھے۔ یہ سماں تھا جب مادھو نے شمشان بھومی میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں گوشت کا ایک ٹکڑا تھا۔ اور ڈر کے مارے دونوں کانپ رہے تھے۔ مادھو جیوٹ سپاہی کیا جانے کہ ڈر کس جانور کا نام ہے۔ مگر اس نقشہ نے اسے بھی بزدلی کا زرد زرد چہرہ دکھا دیا۔ بھوت گوشت کی بو سونگھ کر اس کے گرد جمع ہوگئے۔ اور اپنی کان پھاڑ چیخوں سے فضا میں لرزا پیدا کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ مادھو

ان کی چیخ پکار کے بھڑ ہے میں آجائیگا۔ مگر جب اس پر
کچھ اثر نہ ہوا تو وہ چھینا جھپٹی پر اُتر آئے۔ مادھو نے
اس کی بھی پروا نہ کی۔ اور بڑھے چلا گیا۔ تاکہ جلتی ہوئی
چتا کے سرہانے کھڑے ہوکر اُنہیں گوشت کی بھینٹ
دے اور مدد کا وعدہ لے۔ اچانک کسی عورت کی ایک
دردناک چیخ سے چونک اُٹھا۔ کان لگا کر سنتا ہے تو
کالی کے مندر سے مالتی کی فریادوں نے تانتا باندھ
دیا۔ دُنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہوگئی۔ اسے کچھ
سدھ نہ رہی۔ کہ وہ کیوں ایسی کٹھن جگہ میں آیا تھا۔
بس پھر کیا گوشت کو زمین پر پٹک اور تلوار سونت کر مندر
میں جا گھسا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہے کہ مالتی زمین پر
بیہوش پڑی ہے۔ اور کالی کا ایک پجاری جس کا نام
اگھوڑ گھنٹ تھا۔ اس کے سر پر تلوار تول رہا ہے۔
اور چاہتا ہے کہ ایک ہی وار میں بھٹا سا سر اڑا کر اسے
دیوی کی بھینٹ چڑھائے۔ کہ اس کی شاگرد وہ کپال کنڈلا
کے جادو میں کامل ہونے میں صرف یہی شرط
باقی تھی۔ مادھو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بیہوش مالتی کو گود
میں اُٹھا کر مندر سے باہر لے آیا۔ اتفاق سے جو آدمی
اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے ادھر
آنکلے۔ اور مادھو مالتی کو ان کے حوالہ کر کے اگھوڑ گھنٹ
کی طرف متوجہ ہوا۔ جو غصّہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ اور
اس کے تعاقب میں چلا آتا تھا۔ پجاری کھانڈا کھینچ کر
ٹوٹ پڑا۔ مادھو بھی پورا پھکیت اور منجھا ہوا لڑنتیا
تھا۔ اس نے بھی سردہی کے وہ ہاتھ دکھائے۔ کہ
پجاری کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ آخر مادھو نے ایسا
بھرپور وار کیا کہ پجاری کا بھنڈارا کھل گیا۔ اور اس
کی لاش مندر کے دروازے پر تڑپنے لگی۔ کپال کنڈلا
نے اپنے گرو کی یہ گت دیکھ کر ماتم شروع کیا۔ دوہتڑ
چلانے لگی۔ سر کے بال نوچ ڈالے۔ اور مادھو کو دل
کھول کر کوسنے سنائے۔ جب اس سے بھی سیری نہ
ہوئی۔ تو کالی کی مورتی کے سامنے جا کر انتقام کا پرن
کیا۔ مادھو اپنی آخری تدبیر کو چوپٹ پڑتے دیکھ کر دل
ہار بیٹھا اور مرجھایا ہوا چہرہ لیکر گھر کو گیا۔

دوسرے دن مادھو نے سنا کہ مالتی شوالہ کو پوجا
کے لئے جارہی ہے۔ اور وہیں وہ سہاگ کا جوڑا پہنیگی
جو راجہ نے اسے بھیجا تھا۔ مادھو نے یہ خبر مکراندا کو سنائی
اور دونوں سر دھننے لگے۔ کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر سوچتے
سوچتے مکراندا کو ایک عجیب بات سوجھی۔ اور ڈوبتے
ہوئے مادھو کو یہ تنکا کا سہارا بھی غنیمت معلوم ہوا۔
مگر اس تجویز کا پورا ہونا لونگلا کی شرکت پر منحصر تھا۔ اور
اُنہیں اندیشہ تھا۔ کہ کہیں وہ اس سازش میں شریک
ہونے سے انکار نہ کر دے۔ آخر بڑے اصرار کے بعد

ماتی کا مندکی کے کہنے سننے پر اس نے ہامی بھر ہی لی۔
جب اس کی طرف سے خاطر جمع ہوئی تو انہوں نے
پجاریوں کو رشوت دے کر اپنے ساتھ گانٹھ لیا۔ اور
وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ مکراندا شیو جی کی
مورتی کے پیچھے چھپ کر دیکھ لے کہ نئی نویلی دلہن کیسے
پوجا کرتی ہے۔ مکراندا مورتی کے پیچھے اور مادھو کسی اور
جگہ چھپ گئے تو مالتی اور لونگکا آئے۔ مالتی کی وہ چال
جو کبھی چکور کو شرماتی تھی آج کسی بیمار کی رفتار معلوم
ہوتی تھی۔ اس کا کنول روپ چہرہ باسی ہاروں سے بھی
زیادہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن سے
پتہ لگتا تھا۔ کہ اس کے کلیجہ پر کیا چھریاں چل رہی ہیں
اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے
سینہ میں تن من کو جلانے والی بھٹی سلگ رہی ہے
لونگکا نے مالتی کی طرف سے مورتی پر پھول چڑھاتے۔
ارتھی کی رسوم پوری کی اور نظر اٹھا کر دیکھا تو مالتی دونوں
ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر زار زار رو رہی تھی۔ لونگکا
تو موقع کی تاک میں تھی۔ اس نے جھٹ مادھو کو اشارہ
کیا۔ اور وہ سہاگ کا جوڑا پہن گھونگٹ نکال کھڑا ہو گیا
مکراندا کی شکل ایسی پیاری پیاری اور نک سک ایسا
زنانہ تھا کہ کوئی شخص اس کی چھب تختی دیکھ کر گمان نہیں
کر سکتا تھا کہ وہ مرد ہے۔ اتنے میں مالتی نے ایک ہاتھ
آنکھوں پر سے ہٹایا۔ مادھو کا گندھا ہوا ہار نکالا اور
یہ کہکر لونگکا کے گلے میں ڈالنا چاہا۔ کہ مادھو کی محبت
کی یہ نشانی اسے لوٹا دینا کہ وہ اب اس کے قابل نہیں
رہی۔ مگر وہ ہار بجائے لونگکا کے مکراندا کے گلے میں
جا پڑا۔ کیونکہ اب اس کی جگہ مکراندا کھڑا تھا۔ مالتی کو
اپنی بھول معلوم ہوئی تو اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔
دھیمی سی آواز سے لونگکا کو پکارا وہ تو نہ آئی۔ مگر اس کی
بجائے ماتی کا مندکی مادھو کو ساتھ لئے برآمد ہوئی۔
اور اس نے مالتی کا ہاتھ مادھو کے ہاتھ میں دیکر سارا
قصہ سنایا۔ کہ کس طرح ان کی سنگنی ہوئی تھی
پھر وہ انہیں اپنے آشرم کے باغ میں لے گئی۔ اور بیاہ
کی رسمیں ادا کر کے انہیں کہا۔ کہ جہاں سینگ سمائیں
نکل جاؤ۔

اب مکراندا کا حال سنئے۔ اس نے گھونگٹ کی آڑ
لیکر دلہن کے سب کام انجام دیئے۔ اور برات کے ساتھ
نندن کے گھر پہنچا۔ جب رات خاصی بھیگ گئی تو نندن
اپنی دلہن کے پاس آیا۔ مکراندا نے پہلے تو ناز نخرے میں
نندن کو خوب بنایا۔ اور جب اس نے گھونگٹ کھولنے
کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے زور سے دھکا دیا کہ بیچارا
لڑکھنیاں کھاتا ہوا کہیں کا کہیں جا پڑا۔ وہ اپنی دھان پان
دلہن کی یہ گاؤ زوری دیکھ کر نیلا پیلا ہو گیا۔ مگر دم نہ مارا

کیونکہ وہ جوتی ہاتھ میں لے کر کفش کاری کے لئے تیار کھڑی تھی۔ کپڑے جھاڑ کر کھسیانی بلی کی طرح دبے پاؤں باہر نکلا۔ اور سیدھا اپنی بہن مدنیدکا کے پاس گیا۔ اور رو رو کر اپنا دکھڑا سنایا۔ نند کو بھاوج کے یہ کوتک نرالے معلوم ہوئے۔ بھلا شریفوں کی بہو بیٹیوں کو ڈھول دھپے سے کیا علاقہ۔ پھر بھی وہ اپنے بھائی کی یہ گت ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکی۔ اور یہ ٹھان کر چلی کہ بھاوج کے بل نکلے کی طرح نکال کر رکھ دیگی۔ دلہن کے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو لونگکا پہلے سے موجود کھڑی تھی۔ اس سے مالتی کی شکایت شروع کی۔ اس نے بات سے بات نکال کر مکراندا کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور کہا کہ ایسے چاہنے والے نصیبوں سے ملا کرتے ہیں۔ جو کسی کے لئے جان پر کھیل جانے کو تیار ہوں۔ مدنیدکا کو کیا خبر کہ مکراندا کان لگائے ان کی سب باتیں سن رہا ہے۔ اس نے سیدھے سبھاؤ سے اپنے دل کی لگی بیان کی اور کہا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں کہ پھر انکے درشن ہوں۔ لونگکا نے پوچھا اچھا اگر وہ تمہیں مل جائیں تو کیا کرو۔ مدنیدکا نے لجا کر جواب دیا کیا کروں ہاواہ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے لونگکا نے کہا۔ تو میں بھولی نہیں پوچھتی۔ مگر اتنا تو بتا دو کہ اگر وہ تمہیں اس طرح لے کر نکل جائے جیسے کرشن مہاراج رکمنی کو لیکر چل دئے تھے تو پھر۔ بولی کہ بھگا لے جانے کی ایک ہی کہی۔ اس کی کیا ضرورت ہے وہ ذرا اشارہ کر دیں تو یہ من مول کی داسی ان کے قدموں لگی پھرے۔ یہ باتیں کرتے کرتے وہ کمرے میں داخل ہوئیں اور دلہن کے پلنگ کے پاس جا پہنچی۔ مدنیدکا نے کہا۔ مالتی سو رہی ہو کیا' اٹھو نا ذرا باتیں کریں۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جگانے لگی۔ ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ مکراندا نے اس کا پونچا پکڑ لیا مدنیدکا کی نازک نازک کلائی بل پہ بل کھانے لگی۔ اور کتی چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ جب ہزار جتن سے بھی کلائی اس کی گرفت سے نہ نکلی تو مدنیدکا چلائی۔ ارے کوئی دوڑیو یہ مالتی نہیں کوئی چالیا مردوا ہے۔ لونگکا نے ہنس کر کہا۔ جی ہاں مردوا ہے مگر وہی جس کے لئے مری جا رہی ہو۔ ذرا آنکھیں کھولکر دیکھو تو کون ہے۔ مدنیدکا نے غور سے دیکھا تو مکراندا مسکرا رہا تھا۔ وہ بھی ہنس پڑی اور لونگکا نے ان کو ملا کر کہا۔ کہ اب جلد چلو۔ اور مالتی اور مادھو کے پاس پہنچ جاؤ۔

مادھو مالتی کے پہلو میں ایک پہاڑی پر بیٹھا مزے سے جھیل کی سیر کر رہا تھا۔ اور مالتی مادھو کے گندھے ہوئے ہار کو پھر گلے میں ڈالے اس سے کھیل رہی تھی۔ کہ لونگکا۔ مدنیدکا اور کالاہسا گھبرائے ہوئے آئے۔ اور انہیں بتایا کہ نندن کے سپاہیوں نے مکراندا کو پکڑ لیا۔ اور اسے

گھسیٹے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ یہ سُنکر مادھو کو تاب
کہاں، کالاہسا کو ساتھ لیکر دوڑا۔ اور سپاہیوں سے
سر بکف ہو کر لڑنے لگا۔ تھوڑی دیر میں سپاہی میدان چھوڑ
گئے۔ اور وہ مکراندا کو ساتھ لیکر جانے کو تھے کہ راجہ کا
چوبدار انہیں لینے کے لئے آیا۔ جب مادھو اور مکراندا دربار
میں پُہنچے تو نندن اور بھوری واسو نے انہیں زہر بھری
نگاہوں سے دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان کا بس
چلتا تو دونوں کو کچا چبا جاتے۔ لیکن راجہ کا تبسم ان کے
استقبال کے لئے بڑھا۔ اور اس نے بھوری واسو کو
مخاطب کر کے کہا۔ کہ راج کو ایسے ہی منچلے سورما سپاہیوں
کی ضرورت ہے۔ راجہ کے مُنہ سے یہ لفظ نہ نکلے بلکہ کمان
سے ایک تیر چھوٹا جو نندن کے دل پر بیٹھا۔ اور اس کی
آرزوؤں کا خون کر گیا۔ اس کے سینہ پر سانپ لوٹ
گئے۔ مگر کرتا تو کیا کرتا۔ دانت پیس کر اور زہر کے گھونٹ
پی کر رہ گیا۔ بھوری واسو کا غصّہ تو نرا دکھاوا تھا۔ اسے
راجہ کی مہربانی میں اپنی مُنہ مانگی مراد کی جھلک نظر آئی۔
راجہ نے دونوں کو خلعت دیکر رخصت کیا۔ اور وہ فتح کے
پھریرے اُڑاتے وہاں سے لوٹے۔ کالاہسا یہ خوشخبری
لیکر بھاگا بھاگ جھیل کے کنارے پُہنچا۔ مگر وہاں اور ہی
گل کھلا تھا۔ مالتی گم تھی اور مدنیکا اور لونگلکا اسے ڈھونڈ
رہی تھیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد مادھو اور مکراندا بھی پُہنچے۔

مادھو نے جب مالتی کو وہاں نہ پایا تو چھوٹتے ہی پوچھا کہ
یہ تو کہو مالتی کہاں ہے۔ مدنیکا نے بھرّائی ہوئی آواز
سے جواب دیا کہ "جب آپ کے آنے میں ذرا دیر ہو گئی
تو مالتی گھبرا کر پہاڑی سے نیچے اُتری۔ اور آپ کی راہ
دیکھنے لگی۔ پس پھر اب تک لوٹ کر نہیں آئی"۔ مادھو تو
کپال کنڈلا پر شک ہوا کہ ہو نہ ہو وہی مالتی کو اگھور گھنٹ
کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اڑا لے گئی ہے۔ مادھو تو
غم کے مارے سڑی سودائیوں کی سی باتیں کرنے لگا
اور مکراندا نے دم دلاسے کی باتیں شروع کیں۔ صرف
ایک لونگلکا تھی جس کے اوسان بجا تھے۔ وہ مائی کامندکی
کے پاس گئی اور اسے ساری بپتا سُنائی۔ مائی کی ایک
شاگردہ کو جس کا نام سدہامنی تھا۔ جادو میں بڑا
کمال حاصل تھا۔ مائی نے اس سے مدد مانگی۔ اور وہ
فوراً ہوا میں اُڑ کر کپال کنڈلا کو ڈھونڈنے چل پڑی۔
کیونکہ اسے جادو کے ذریعہ معلوم ہو گیا کہ یہ ساری
اسی کی کارستانی ہے۔ اور وہ کالی کے مندر کے پاس
ایک پہاڑی پر مالتی کو دیوی کی بھینٹ چڑھایا
چاہتی ہے۔

سدہامنی اور کپال کنڈلا کا آمنا سامنا ہوا۔
اور دونوں طرف سے جادو کے بان چلنے لگے۔ بڑی سخت
جنگ کے بعد آخر کپال کنڈلا ماری گئی اور سدہامنی نے

فتح کی نشانی یعنی مالتی کو کامندکی کے پاس پہنچایا جو بیہوشی میں بھی مادھو کا نام رٹتے جاتی تھی۔ سدہامنی نے اسے وہاں چھوڑا اور آپ مادھو کی تلاش میں چلی۔ تھوڑی دیر میں وہ مل تو گیا مگر ایسی حالت میں گویا گھڑی ساعت کا مہمان ہے۔ مکراندا بھی پاس کھڑا پہاڑی سے کود کر خودکشی کرنے کے لئے کندھے تول رہا تھا۔ سدہامنی نے اسے وہ ہار دکھایا جو مادھو نے مالتی کو دیا تھا۔ اور اُسے یقین دلایا کہ مالتی زندہ مل گئی ہے۔ اور مائی کامندکی کے آشرم میں چنگی بھلی موجود ہے۔ اب سدہامنی یہ سوچنے لگی۔ کہ مادھو کو کیسے ہوش میں لائیں۔ مکراندا نے کہا اس کی فکر بیکار ہے۔ یہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیجئے۔ ہزار نسخوں کا کام کریگا۔ ہار گلے میں پڑنا تھا کہ مادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ اور جب اسے معلوم ہُوا۔ کہ مالتی نزدیک ہی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تو وہ چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ سدہامنی اور مکراندا مادھو کو ساتھ لیکر آشرم میں آئے۔ مالتی اور مادھو کا ملاپ ہُوا۔ اور وہ اس خوشی میں اپنے سارے غم بھول گئے۔ مدنیدکا اور لونگکا بھی آ گئے۔ اور سب نے مل کر بدھ دیو کا شکر ادا کیا جس کی مہربانی سے مشکلوں کے تمام پہاڑ پانی ہو کر بہ گئے اتنے میں ایک چوبدار آیا۔ اور اس نے یہ حکم سُنایا۔ کہ راجہ نے مادھو اور مالتی۔ مکراندا اور مدنیدکا کی شادی کی منظوری دیدی ہے۔ کامندکی نے مکراندا اور مدنیدکا کی شادی کی رسمیں ادا کر دیں۔ اور سب خوشی سے ہنستے بولتے اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

نور الٰہی
و
محمد عمر

نوٹ

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف

جواب طلب خطوط کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ ضرور ساتھ آنا چاہئے۔ "مینجر"

نور جہاں

خدائی نیند میں سرشار ہے، برکھا کا موسم ہے
زمینِ شہدرہ پر ہر طرف کھویا سا عالم ہے

افق پر منتشر، مہتاب کی سرشار لہریں ہیں
فضا کے دامنوں میں موجزن چاندی کی نہریں ہیں

نقابِ آسماں میں ننھّے تارے جھلملاتے ہیں
کہ بحرِ نیل میں گلہائے زرّیں کھلکھلاتے ہیں

غبارِ مرمریں سا اُڑ رہا ہے صحنِ ہستی سے
ہوا کی پیالیاں لبریز ہیں پھولوں کی مستی سے

چراغاں ہو رہا ہے چاند کے نیلے شبستاں میں
کہ پریوں نے کہیں موتی بکھیرے ہیں پرستاں میں

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی چھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

رسیلی بو کی موجیں اُڑ رہی ہیں سرو سوسن پر
نشہ کا سا سماں چھایا ہُوا ہے سارے گلشن پر

پرندے سو چکے ہیں جا کے اپنے آشیانوں میں
بھیانک سنسنی سی چھا رہی ہے گلستانوں میں

خموشی کا سماں اِک ہو کا عالم ہے زمانے پر
سکوں طاری ہے قدرت کے انوکھے کارخانہ پر

نہا کر آئی ہیں اندر کی حوریں عطر کے جل میں
نشہ کی موجیں اُڑتی پھرتی ہیں سنسان جنگل میں

سکونِ شب سے ہیں ٹھہری ہُوئی پانی کی نہریں بھی
کہیں گہرائیوں میں سو چکی ہیں جا کے لہریں بھی

روپہلی رات پر طاری ہے اندوہِ حسیں کوئی
کہ گہری فکر میں لیٹی ہُوئی ہے مہ جبیں کوئی

زمین و چرخ نے چپ سادھ لی ہے ہر صدا چپ ہے
اِدھر اُجلی فضا چپ ہے اُدھر ٹھنڈی ہوا چپ ہے

یہ بھیگی رات یہ مستانہ رُت یہ نور کا عالم
زمرّد فام نخلستاں پہ برقِ طور کا عالم

ہوا سے ننھّی کرنیں کھیلتی ہیں شاخساروں پر
کہ کچھ چینی کی گڑیاں جھولتی ہیں سبزہ زاروں پر

اسی سنسان نخلستاں میں اِک اُجڑی عمارت ہے
جہاں دفن اِک شہنشاہِ گرامی کی محبت ہے

یہاں وہ بانوئے عفت نشاں سوتی ہے تربت میں
کٹی تھی جس کی ساری عمر آغوشِ حکومت میں

ادب! اے دل ادب کر! روضۂ نورِ جہاں ہے یہ!

مقدس خوابگاہِ ملکۂ ہندوستاں ہے یہ!

(بعض تصوّراتِ تاریخی)

کوئی زائر جب اس کے مرقدِ انور پہ جاتا ہے — تو اس کو سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے

جب اس کا باپ نکلا تھا وطن سے بے وطن ہو کر — چلا تھا پھول صحرا کی طرف زیبِ چمن ہو کر

نکلکر ملک سے اپنے وہ جب قندھار تک پہنچا — لئے بیگم کو ساتھ اِک وادیٔ پُرخار تک پہنچا

تو اس ہیبت فزا جنگل میں اِک دختر ہوئی پیدا — قمر کی گود سے اِک زہرۂ انور ہوئی پیدا

مگر ماں باپ پر قسمت نے ایسا وقت ڈالا تھا — کہ دل میں درد تھا آنکھوں میں آنسو لب پہ نالہ تھا

پریشانی کے بادل چھا رہے تھے ان کی حالت پر — غم و حسرت کے دریا موجزن تھے ان کی صورت پر

نہ سوجھی جب کوئی تدبیر انہیں اس کی حفاظت کی — تو رکھ لی ہار کر چھاتی پہ سِل دونوں نے فرقت کی

لٹا کر چل دئیے دونوں اسے سبزہ کے بستر پر — ستارے رو رہے تھے خون اس غمگین منظر پر

کہ یوں لختِ جگر کو چھوڑ کر جاتا نہیں کوئی — ذرا سی جان کو بے دودھ تڑپاتا نہیں کوئی

وہ دختر کون تھی؟ اے ملکۂ نورِ جہاں تو تھی!

وہ بیکس کون تھی؟ اے زینتِ ہندوستاں تو تھی!

مگر تقدیر کے آگے کسی کی چل نہیں سکتی — مسرت مٹ نہیں سکتی مصیبت ٹل نہیں سکتی

یکایک رحمتِ خلاقِ باری جوش میں آئی — دلِ قدرت میں بندوں کی محبت ہوش میں آئی

صدا سُنکر تری رونے کی اِک سردار آ پہنچا — عقب سے قافلہ کا قافلہ سالار آ پہنچا

محبت سے وہ گودی میں اُٹھا کر لے گیا تجھ کو — تو گویا مر چکی تھی وہ جلا کر لے گیا تجھ کو

تری معصوم قسمت نے بھی کی پھر یاوری تیری — ہوئی تفویض تیری ماں کو ہی دایہ گری تیری

حکومت نے نوازا اور بخشا مرتبا اس کو — خطاب اعتماد الدولہ اکبر سے ملا اس کو

غرض تو پرورش پانے لگی قصرِ حکومت میں — بسر ہونے لگی طفلی کی دنیائے مسرت میں

یونہی آپہنچی جب طفلی تری حدِ جوانی میں — شباب اِک موج بنکر اُٹھا بحرِ زندگانی میں

تو شادی کر دی شاہنشہ نے تیری شیر افگن سے
خوشی کا غلغلہ اٹھا نوا سنجان گلشن سے
مگر کچھ دن میں لایا رنگ یہ چرخ کہن آخر
کہ درہم ہو گئی تیری خوشی کی انجمن آخر
زمانہ نے لباس بیوگی پہنا دیا تجھ کو
مسرت زار سے غم خانہ میں پہنچا دیا تجھ کو

نگاہوں سے تصور پھر نیا پردہ اٹھاتا ہے
تجھے ملکہ بنا کر قصر شاہی میں بلاتا ہے

جہانگیر اک طرف معروف ہے صہبا پرستی میں
لگا تے ساغرمے لب سے ہے سرشار مستی میں
ادھر مشغول ہے تو انتظام ملک و دولت میں
امور سلطنت میں اور مہمات سیاست میں
حکومت کر رہی ہے عقل و دانش کے سہارے پر
مدبر ناچتے ہیں تیرے اک ادنےٰ اشارے پر
کچھ اس انداز سے چھیڑا حکومت کے ترانے کو
شہنشہ کی ضرورت ہی نہیں گویا زمانے کو

یہ نیرنگ تصور ہے کہ اک خواب پریشاں ہے
فضائے شہدرہ میں جیسے تو اب بھی خراماں ہے

جلو میں تیرے کمسن لڑکیاں زہرہ شمائل ہیں
زمیں کو آنکھوں آنکھوں میں الٹ دینے پہ مائل ہیں
یہ پریاں ہیں جو بہر سیر نکلی ہیں پرستاں سے
کہ کچھ حوریں اتر کر آگئی ہیں باغ رضواں سے
بلا کی شوخیاں ہیں ان پریوش نازنینوں میں
ہزاروں بجلیاں بھر دی ہیں گویا آبگینوں میں
یہ کمسن حسن کی چڑیاں مگن ہیں رنگ رلیوں میں
کہ تیرے سحر لب سے پڑ گئی ہے جان کلیوں میں
بہار آتیں فضا میں گونجتے ہیں قہقہے ان کے
خمار آگیں ہوا میں اڑ رہے ہیں قہقہے ان کے
کبھی یہ کھیلتی ہیں آکے راوی کے کناروں پر
کبھی یہ لوٹتی ہیں بیخودی میں سبزہ زاروں پر
زمیں پر ہے شراب حسن کا طوفان سا برپا
جہاں میں ہے بہار ناز کا ہیجان سا برپا
برس جاتی ہیں پنکھڑیاں وہ جس دم بات کرتی ہیں
لبوں کی سرخ قینچی سے ہزاروں گل کترتی ہیں
دو لعل آبدار و صد ہزاراں گل چکا نیدا
دو چشم کیف بار و صد ہزاراں دل چکا
تصور اس تماشا زار میں جی بھر کے رونے دے
مجھے اک اک کرن کے تار میں موتی پرونے دے

یکایک دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدلتا ہے
نیا عالم نکلنے پر نیا عالم نکلتا ہے

ادھر تو اور جہانگیر اک طرف خاموش بیٹھے ہیں
شراب عشق سے سرشار ہیں مدہوش بیٹھے ہیں

ترے ہاتوں میں اک زرین جام نور افشاں ہے
کہ آغوش سحر میں ایک خورشید درخشاں ہے

کبھی تو بھر کے پیالہ اپنے ہاتوں سے پلاتی ہے
کبھی حالت پہ اس کی چپکے چپکے مسکراتی ہے

دل مخمور میں ارمان اب باقی نہیں کوئی
کہ جنت میں بھی تجھ سا نازنیں ساقی نہیں کوئی

کبھی مدہوش سلطاں دیکھتا ہے پیار سے تجھ کو
نگاہ حسرت آلود و تمنا بار سے تجھ کو

نظر ملنا ترا وہ جھیپ کر گھبرا کے رہ جانا
لجا کر آنکھ نیچی کر کے وہ شرما کے رہ جانا

عبث بدنام کیوں دنیا میں اس کی مے پرستی ہے
شہنشہ جس سے ہے مخمور وہ کچھ اور مستی ہے

وہ مستی کیا ہے تیرے دیدۂ میگوں کی سرشاری
یہیں سے ملتی رہتی تھی اسے تعلیم میخواری

تخیل اس تماشا زار میں کروٹ جو لیتا ہے
تصور ہاتھ سے ماضی کا دامن چھوڑ دیتا ہے

تو میں ہوتا ہوں تنہا اور تیری قبر ہوتی ہے
دل غم آشیاں کو جستجوئے صبر ہوتی ہے

اسی حالت میں اپنی آنکھ سے موتی لٹاتا ہوں
تری سرکار میں کچھ دکھ بھرے نغمے سناتا ہوں

کہ تیرے غم میں ہیں ٹھنڈی ہوائیں بیقرار ابتک
تری فرقت سے ہیں باغوں میں لالے داغدار ابتک

یہاں کی ہر کلی ہر پھول اک تصویر ہے تیری
تو ہے اک خواب اور یہ گل زمیں تعبیر ہے تیری

تری راتیں ابھی تک سو رہی ہیں سبزہ زاروں میں
تری باتیں ابھی تک گونجتی ہیں جوئباروں میں

جو خوشبو کھیلتی رہتی تھی اک دن تیرے کاکل سے
وہی اب جھلکی پڑتی ہے یہاں کے لالہ و گل سے

چمن بکھرا ہوا اک خواب تیری زندگانی کا
کلی بگڑا ہوا اک نقش تیری نوجوانی کا

ادیبوں کی زباں پر آج تک تیرے فسانے ہیں
لب شاعر پہ ابتک تیری مدحت کے ترانے ہیں

تیری فطرت کسی کے ذہن میں آہی نہیں سکتی
ہماری فکر اس کو حشر تک پا ہی نہیں سکتی

تری موزونیِ طبع خداداد ایسی دولت تھی
جسے سُن سن کے خود تخیل انسانی کو حیرت تھی

جہانِ بذلہ سنجی میں بپا ہے اضطراب ایسا
رہیگا یاد محشر تک سوال ایسا جواب ایسا

نہیں دیکھا کسی نے آجتک ساری خدائی میں
کہ شوہر کی جگہ بیوی نے لی ہو بادشاہی میں

مگر تو ایسی دانا اور دور اندیش عورت تھی
کہ ہندوستاں کے ہر گوشے پہ تیری ہی حکومت تھی

تری تیمار داری کرتی تھی بیمار کو اچھا
مریضِ عشق اس شاہنشہ میخوار کو اچھا

ترے آگے دلیروں کی دلیری سرد ہو جاتی
تری تلوار سے شیروں کی شیری سرد ہو جاتی

ترے دیدار کا ہے منظروں میں اضطراب اب تک
زمیں کا ذرّہ ذرّہ دیکھتا ہے تیرے خواب ابتک

تری خوشبو مہکتی ہے ابھی تک غنچہ زاروں میں
ترے نغمے مچلتے ہیں ابھی تک جوئباروں میں

تو روتی تھی تو ساری کائنات آنسو بہاتی تھی
تو ہنستی تھی تو فطرت مسکرا کر لوٹ جاتی تھی

تو سوتی تھی تو ساتوں آسماں کو نیند آتی تھی
تو اٹھتی تھی تو کل خوابیدہ دُنیا کو اٹھاتی تھی

غمستانِ جہاں میں تو مجسم اک تبسم تھی
سکوت آبادِ ہستی میں سراپا اک ترنم تھی

ترے جلوے ہیں وجہ زینتِ چشمِ بشر ابتک
غبارِ قبر تیرا رونقِ اہلِ نظر اب تک

تو زارِ جہاں میں تو وفا کا ساز تھی گویا
کہ سازِ عشق کی اک جاندار آواز تھی گویا

سپہر حکمرانی کا تجھے ماہ مبیں کہتے
حکومت کی جہاں افروز خاتم کا نگیں کہتے

دلِ غمدیدہ کے حق میں تو اک سازِ مسرت تھی
جہانگیر ابن اکبر کا تو اک خوابِ محبت تھی

تری نکہت سے پتہ پتہ جنگل کا لہکتا تھا
تری خوشبو سے قطرہ قطرہ راوی کا مہکتا تھا

تجھے باغِ حرم کی بلبلِ رنگیں نوا کہتے
تجھے فطرت کی اک محبوبہ شیریں ادا کہتے

بہارِ آفرینش تھی شبابِ زندگانی تھی
جواں فطرت کا اک کھویا ہوا خواب جوانی تھی

تو جانِ عاشقی کانِ وفا شانِ حکومت تھی
تری سب سے بڑی تعریف یہ ہے ایک عورت تھی

زمانہ جانچتا رہتا ہے سچے آشناؤں کو
ہمیشہ یاد رکھیگا تری خالص وفاؤں کو

ہوئی مر کر بھی خوابیدہ تو شوہر ہی کے پہلو میں
جگہ پائی جہانگیر ابن اکبر ہی کے پہلو میں

تیری ایجاد کو حاصل ہوئی ایسی جہانگیری ہے ابتک عورتوں کے ہات میں تیری جہانگیری

چمن میں بلبلیں برسات میں جب گیت گاتی ہیں جوانانِ چمن کو رس بھرے نغمے سناتی ہیں
ہزاروں پھول کھل جاتے ہیں جس دم لالہ زاروں میں جب آجاتی ہے بارش سے روانی جوئباروں میں
سپہر نیلگوں پر جب ستارے جگمگاتے ہیں کسان اپنے گھروں کو لوٹ کر کھیتوں سے آتے ہیں
سرِ شام اِک خموشی ہوتی ہے طاری مکانوں میں پرندے جاکے سو جاتے ہیں جس دم آشیانوں میں
سویرے جب ہزاروں ننھی چڑیاں چہچہاتی ہیں ہوا کی چھیڑ پر مخمور کلیاں مسکراتی ہیں

غرض دُنیا میں اِک اِک رسم جس دم رنگ لاتی ہے
زمینِ شہدرہ تیرے لئے آنسو بہاتی ہے

اختر شیرانی

کیفیات

نالۂ دل نارسا فریاد بے تاثیر ہے یا الٰہی کیا محبّت کی یہی تقدیر ہے
جبہ سائی تیرے در کی سچ مگر کیا فائدہ اب کہاں مٹتی ہے پیشانی میں جو تحریر ہے
رہروانِ جادۂ عمرِ رواں غافل نہ ہوں ذرّہ ذرّہ خاک کا ہر لحظہ دامنگیر ہے
کیا شکایت راستے کی راہبر کا کیا قصور اپنے حق میں خود ہی پائے ناتواں زنجیر ہے
بے زبانی کی مصیبت کس طرح آساں ہوئی ہر نگاہِ یاس محسوسات کی تصویر ہے
جبہ سائی کے سوا کچھ کام ہی میرا نہیں ساری پیشانی میں شاید اِک یہی تحریر ہے
ہے نمایاں ہر طرف صنّاعیِ قدرت کا رنگ آنکھ ہو تو ذرّہ ذرّہ عالمِ تصویر ہے
مَیں نے مانا زادِ راہِ مرگ حسرت کچھ نہیں یہ بھی کیا کم ہے کہ پہلو میں کسی کا تیر ہے
زندگی میری بجز رنجِ محبت کچھ نہیں اس کو جس پہلو سے دیکھو ایک ہی تصویر ہے
دیکھ لے آسودگانِ خاک کس راحت میں ہیں زندگی ہادؔی فقط اِک دردِ دامنگیر ہے

ہادی

سوئے اتفاق

(گزشتہ سے پیوستہ)

آج سے دس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جب بہارِ عمر آرزوؤں کے شگوفوں اور تمناؤں کے پھلوں سے لبریز تھی۔ مجھے ابھی اپنی صنعت کے ابتدائی مدارج طے کرنے تھے۔ اور ذہن اس حالت میں تھا جب معمولی سے معمولی واقعہ کے تاثراتِ اولین تقریباً تقریباً بقائے دوام کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ مجھے سپہر آرا سے عشق ہوا۔ پہروں کو ٹھے پر کھڑا رہنا۔ چھپ چھپ کے بے معنی اور مبہم سے اشارے کرنا۔ کسقدر لغو معلوم ہوتا ہے لیکن اس عمر میں یہی چیزیں بہترین دلچسپی کا باعث تھیں۔ آخر کار یہ غیر شاعرانہ مدارج طے ہو گئے۔ اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ایک عورت سے جذبات انگیز ملاقات کی۔ پہلی دو تین ملاقاتوں کا تذکرہ جو میرے لئے سرمایہ مسرت تھا۔ شاید آپ کی سماعت کے لئے ناخوشگوار ہو۔ اس لئے اس حصے کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اس کی شکل و صورت — میں ابتک اس کا صحیح بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اسے غیر معمولی قسم کی عورت سمجھتا تھا۔ یا شاید اس میں غیر از معمول بات واقعی موجود تھی۔ اس کے نقش سڈول نہ تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی خوش مزاجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لئے جاذبِ نظر تھے۔ اس کے چہرے میں سب سے دلچسپ اور محبوب چیز اس کے سرخ لب تھے۔ جو ہر وقت ہنسی سے متاثر نظر آتے تھے۔ اس کی عادت تھی کہ اکثر باتوں کے جواب میں اپنے لبوں کو کچھ طنزیہ سے انداز میں متبسم بنا دیا کرتی۔ کبھی تو ایسا کرنا بے انتہا خوبصورت معلوم ہوتا کبھی اس کی وجہ سے میرے دل میں اپنی ذلت کا ایک بوجھ سا احساس پیدا ہو جاتا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اور پتلیوں کا رنگ بھورا تھا۔ وہ بھورا رنگ نہیں جو عام حالتوں میں کم و بیش ہر شخص کی پتلی میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ شوخ اور گہرا مجھے ان آنکھوں کی طرف دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ کبھی اس قسم کی کوشش کرتا، تو یوں معلوم ہوتا گویا کسی گہرے سمندر میں غرق ہوتا چلا جا رہا ہوں۔

ایک سال گذر گیا۔ میں نے اس سے کہا مجھ سے

ط فسٹ امپریشنس

شادی کر لو۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے مُسکرائی۔ اور میرے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں پھر مجھے پیار کرنے لگی۔ میں چپ ہو گیا۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے اُسے پھر کہا۔ "مجھ سے شادی کر لو۔"

اُس نے اپنی بھوری آنکھیں دوسری طرف پھرا لیں۔ اور اس کی گھنی پلکوں کا سایہ اس کے تمتماتے ہُوئے رخساروں پر پڑنے لگا۔ پھر بولی۔ "بھولے شاہزادے تم یہ توقع کیوں رکھتے ہو۔ کہ میں ساری عمر تم سے محبّت کرونگی۔ محبت ایک چنگاری ہے جو ہر شخص کے دل میں دبی ہُوئی رہتی ہے۔ بعض حالتوں میں یہ چنگاری سلگ اٹھتی ہے۔ لیکن فوراً ہی بُجھ جاتی ہے۔ اسے زندگی کہا جاتا ہے۔ بعض حالتوں میں یہ چنگاری شعلوں کی طرح لپکتی ہے۔ اور بجلی کی طرح چشم زدن کے لئے انسان کی ہستی کو منوّر کر جاتی ہے۔ اسے بھی زندگی کہا جاتا ہے۔"

میری معصومیت اس حقیقت کو برداشت نہ کر سکی۔ میں نے پُوچھا۔ "تو کیا محبت ایک دو سال قائم رہتی ہے۔"

وہ ہنسی اور میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اور اس انداز سے دیکھنے لگی۔ جس کا مقابلہ کرنا میرے امکان کی حدود سے باہر تھا لیکن آج اس کی دل آویزی کا طلسم ذرا سے عرصے کے لئے چکنا چور ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "جاؤ۔ تم مجھے فریب دے رہی ہو۔ تم مجھ سے دغا کر رہی ہو۔"

وہ بے انتہا سنجیدہ ہو گئی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔ "فریب تک گوارا تھا۔ لیکن دغا نہیں۔ پھر ایسا لفظ کبھی استعمال نہ کرنا۔ دغا۔ یہی وہ لفظ جس میں قرونِ وسطیٰ کے تمام گناہوں کا نچوڑ جمع کر دیا گیا ہے۔ یہی وہ پہلا واحد گناہ ہے جس کی آغوش میں باقی تمام گناہوں نے پرورش پائی ہے۔ یہی وہ زہر ہے جو انسان کے جسم کو نہیں بلکہ اس کے ذہن کو ملیامیٹ کرتا ہے۔"

میں حیران ہو گیا۔ مجھے قطعاً معلوم نہ تھا۔ کہ اس کا مطالعہ اس قدر وسیع ہے۔ آج وہ مجھے کچھ اجنبی سی معلوم ہوتی تھی۔

یکایک اس نے پہلو بدلا۔ اور اپنی آواز میں محبّت کی حرارت پیدا کر کے کہنے لگی۔ "پیارے جتنی کوئی تم سے معمولی عورت سو سال میں محبّت کرتی میں نے ایک رات میں کی ہے۔ تم نہیں جانتے ہو کہ جن لوگوں کے ذہن کافی طور پر نشوونما پا چکتے ہیں، ان کی محبّت ایک جذبہ نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک اضطراری کیفیّت ہوتی ہے۔ اس اضطراری کیفیت کے دوران میں وہ اپنی تمام شادابیوں اور نزہتوں کو محبوب کے قدموں

پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ اس پر اپنی فردوس قلب کے تمام دروازے کھول دیتے ہیں۔ تاکہ محبت کی اس انتہائی شیرینی کو ایک دفعہ چھولے۔ جو ہمارے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ اور غائب ہو جاتی ہے۔ غائب ہو جاتی ہے اور آجاتی ہے۔"

میں نے کہا "تو کیا اس سے یہ مراد ہے کہ تمہاری محبت کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ کب ختم ہو جائیگی۔ آہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دُنیا میں اس طرح کی عورتیں بھی موجود ہیں۔ تو میں شروع سے نسل انسانی کو حقارت سے دیکھتا"

اور میرے آنسو گرنے لگے۔

اس نے میرا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا۔ اور کہنے لگی۔ "پیارے میں تمہاری محبت کے لائق نہیں مرد ماں کی آغوش میں پلکر جوان ہوتا ہے۔ تو وہ مردانگی سیکھتا ہے۔ اسے شعریت اور تہذیب کی تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے میں میں تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔ لیکن کوشش کروں گی کہ جب تمہاری بیوی آئے، تو وہ تمہارے اکھڑپنے کو زائل شدہ پائے۔"

اس دن میں اُٹھکر چلا آیا۔ اور میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ اب میں اس سے نہ ملونگا لیکن اس کا خیال آتے ہی یہ ارادہ اس طرح کافور ہو جاتا۔ جس طرح سُورج کی شعاعوں کے سامنے شبنم اُڑ جاتی ہے۔ یاد رکھو کہ جب کسی عورت میں دو باتیں جمع ہو جائیں کہ اس کی طبیعت رسمیاتِ عہد سے گریز کرے۔ اور ساتھ ہی اپنے طریقِ زندگی میں جدّت پیدا کرے۔ تو یہ مجموعہ بے انتہا خطرناک ہوگا۔ رسمیات کی نفی اس قدر خطرناک نہیں جتنی جدت کے اثبات کے ساتھ مل کر ہو جاتی ہے۔

ایک رات جب چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی۔ اور شعاعِ ماہتاب کی لہریں اپنے ساتھ میرے دل میں جذبات کا ایک رقص پیدا کر رہی تھی۔ میں اس کے ہاں گیا۔ دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔ اور میرے کانوں میں کسی مرد کی باتوں کی آواز آئی۔ جھانک کر دیکھا۔ ایک خوبرو جوان جس کا چہرہ غُصّے کے مارے سرخ ہو رہا تھا سپہر آرا کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پستول تھی۔ سپہر کے لب خُشک تھے۔ اس کا چہرہ اس طرح سُکڑا ہُوا تھا جس طرح کسی شخص کا چہرہ بیماری کے دوران میں نقاہت کی شدت سے سکڑ جاتا ہے۔ لیکن تم باور نہ کرو گے۔ وہ حقیقت میں ہنس رہی تھی۔

نوجوان نے خطرناک سکون سے کہا۔ "میں تمہیں کچھ نہ کہونگا۔ اس شخص کا نام بتاؤ۔ جس کے ساتھ

تم بھاگ کر آئیں۔ اس شخص کا زندہ رہنا میری مردانگی کیلئے مستقل طعنہ ہے۔"

وہ چپ رہی۔

نوجوان نے پھر کہا۔ "سنا! مجھے اس کا نام بتاؤ وہ کون تھا؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی مٹھیاں کس لیں۔ پیشانی پر رگیں ابھر آئیں۔ اس نے پستول کو زمین پر پھینکدیا۔ اور سپہر کی طرف ہیبتناک سرعت سے بڑھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سپہر کا گلا پکڑلیا۔ اور اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہنے لگا۔ ہرچند کہ تم ایک عورت ہو اور میری بیوی ہو۔ یا شاید کبھی بیوی تھیں۔ کیونکہ اب میں تمہیں بیوی کے نام سے پکارنا۔ بیوی کے لفظ کے لئے انتہائی ننگ سمجھتا ہوں لیکن میں جھنجوڑ جھنجوڑ کر تمہارے اس پتھریلے سکون کو برباد کر دونگا۔ تمہارے لبوں پر سے اس دائمی مسکراہٹ کے انداز کو نوچ لونگا۔ جس سے تم دلوں کو برباد کرتی ہو۔"

میں تصویر حیرت بنا سن رہا تھا۔ گویائی اور توانائی دونوں مفقود تھیں۔ شاید اگر سپہر کوئی چیخ مارتی تو میں اس کی مدد کو کبھی نہ جاتا۔ کیونکہ میرے دل میں اس کے خلاف رشک بغاوت کا علم بلند کئے ہوتے کھڑا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا۔ کہ یہ ایک بیاہی ہوئی عورت تھی۔ جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ چلی آئی تھی۔ اور پھر مجھے فریب دے رہی تھی۔ لیکن سپہر خاموش رہی۔ یہ خاموشی ناقابلِ برداشت تھی۔ کاش وہ کوئی آواز نکالتی۔ کاش وہ رحم کی التجا کرتی۔ لیکن نہیں۔ وہ چپ رہی۔ اور اس کے لب اس طرح ایک طنزیہ سے انداز میں بگڑی ہوئی مسکراہٹ کا نقشہ پیش کرتے رہے۔ میں پھلانگ مار کر کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اور نوجوان کو شانوں سے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے بپھرے ہوتے شیر کی طرح اپنی پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ کوٹ کے بٹن کھول دئے۔ اور کہا۔ "نشانہ باندھو۔"

وہ میرے رویّہ کو دیکھ کر کچھ متعجب سا ہو گیا۔

فتح میری تھی۔

میں نے اپنے انتہائی توثیق کے لہجے میں کہا۔ "مجھے مارو۔ اور تم ایک بیگناہ کا خون اپنی گردن پر لوگے۔ میں تمہاری تمام باتیں سنتا رہا ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں وہ شخص نہیں جس کے ساتھ یہ بھاگ کر آئی ہے۔ میں اس کی فریب کاری کا ایک تازہ شکار ہوں۔ میرے سامنے اس نے اپنے آپ کو دوشیزہ ظاہر کیا۔ اور میں نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ میرے خیال میں اس عورت کے لئے ذرا سی جسمانی یا ذہنی

تکلیف برداشت کرنا انسانیت کے لئے باعث ننگ ہے۔ تم اسے بھول جاؤ۔ عین اس طرح جیسے کوئی شخص ایک پریشان خواب دیکھ کر بھول جاتا ہے۔ تم ایسے شخص کے ڈھونڈھنے کی کوشش نہ کرو۔ جو اسے بھگا کر لایا تھا۔ عورت کے لئے اور خاصکر ایسی عورت کے لئے جان کو خطرے میں ڈالنا حماقت کا آخری درجہ ہے۔"

نوجوان کے ہاتھ سے پستول گر پڑی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ نوجوان ظہیر تھا۔

اور تم یقین کرتا۔ کہ پھر اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ تالی بجا کر کہہ رہی تھی۔

" شاباش! شاباش میرے نقرر شاباش۔"

ریاض خاموش ہوگیا۔ علامی طاہر نے تصویر کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگے۔" سبحان اللہ ایسی ایسی عورتیں بھی دنیا میں ہوتی ہیں۔"

عآبد

غزل

مَیں جدھر دیکھتا ہوں تو نظر آتا ہے مجھے
عرصۂ حشر بھی نیرنگ تماشا ہے مجھے

دِل بگڑتا ہے مرا اور بھی ناصح چپ رہ
ہر نصیحت تیری تحریکِ جنوں زا ہے مجھے

کل جفا جو تجھے شاید کوئی موقعہ نہ ملے
آج ہی کیوں نہ ستالے جو ستانا ہے مجھے

غیر کہتا ہے اگر مجھ کو بُرا کہنے دو
تم بُرا کہتے ہو اس بات کا شکوا ہے مجھے

وہ نہ گر آج بھی آئے تو یہ سمجھونگا ضرور
وعدۂ شام بھی اِک وعدۂ فردا ہے مجھے

قمر

وجدانیات

(۱)

جمال سحر کار اُس کا۔ شباب زر نگار اس کا
بہار زندگانی ہے یہ جسم نو بہار اس کا

اسے معلوم ہے اپنی دل آرائی دل افروزی
نگاہوں سے جھلکتا ہے غرورِ آشکار اس کا

شمیم حسن کا مخزن ہے زلفِ مشکبار اس کی
معطر ہو گیا پیراہنِ گوہر نگار اس کا

بہار نزہت گلشن ہے اِک رنگیں مثال اس کی
فروغ جلوۂ مہتاب ہے آئینہ دار اس کا

ابھی تک دل ہمارا کامرانِ شادمانی ہے
ابھی نا آشنائے غم ہے عشق خامکار اس کا

وُہ آئیں یا نہ آئیں دل کو مایوسی نہیں ہوتی
کمال مصلحت ہے یہ جنونِ انتظار اس کا

محبت عابدِ مجبور کی وقف کشاکش ہے
یہ خوئے بیقرار اس کی یہ عشقِ خاکسار اس کا

---

(۲)

میرے دل پر داستانِ عاشقی تحریر ہے
زندگی میری کتاب حُسن کی تفسیر ہے

ایک مَیں ہوں اور بیتابی کی لاکھوں صورتیں
شومیِ تقدیر ہے محرومی تدبیر ہے

آپ مل کر کیا گئیں آرام دل کا کھو گیا
کیا یہی خواب سکونِ قلب کی تعبیر ہے

عابد

لمعات

بہارِ غم بہارِ جاوداں معلوم ہوتی ہے
بس اِک ناسور چشمِ خونچکاں معلوم ہوتی ہے

جبیں کا داغ اب روشن نہیں ہوتا نہیں ہوتا
جبیں اب ہم کو ننگِ آستاں معلوم ہوتی ہے

ہراِک نقشِ قدم میں ایک جنّت ہے نگاہوں کی
تِری رفتار موجِ گلفشاں معلوم ہوتی ہے

نہ وہ آتے ہیں فرقت میں نہ موت آتی ہے فرقت میں
مِری ہر ایک محنت رائیگاں معلوم ہوتی ہے

خُدا چاہے تو حاصل ہو مجھے بھی وصل کی دولت
وہ دولت جو نصیبِ دُشمناں معلوم ہوتی ہے

مِری رگ رگ میں لطفِ زندگی کی موج رقصاں ہے
طبیعت بادۂ غم سے جواں معلوم ہوتی ہے

مصیبت لاکھ ہو میرا قدم رہ سے نہیں ہٹتا
محبّت بے نیازِ این و آں معلوم ہوتی ہے

شرابِ حُسن پینے سے نہیں تھکتی نہیں تھکتی
نظر میری حریصِ گلرخاں معلوم ہوتی ہے

ہراِک شے میں تڑپ ہے کاوشِ دردِ محبت کی
ہراِک شے عاشقی کی رازداں معلوم ہوتی ہے

چلی آتی ہیں موجیں لطفِ مضموں کی مِرے دِل میں
طبیعت ایک بحرِ بیکراں معلوم ہوتی ہے

کہاں سے آئیں یہ رنگینیاں اشعارِ اکبر میں
ہمیں عابد[1] کی یہ طرزِ بیاں معلوم ہوتی ہے

اکبر

---

[1] اُستاذی حضرتِ عابد

میری داستان حیات

(مسلسل)

بیسواں باب

کالج کی تعلیم اور اس کے طریقے

کالج میں داخل ہونے کی جدّو جہد کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اب میں ریڈکلف میں جس وقت چاہتی داخل ہو سکتی تھی لیکن کالج میں داخل ہونے سے قبل یہ مناسب سمجھا گیا۔ کہ میں مسٹر کیتھ سے ایک سال اور تعلیم حاصل کروں۔ پس ۱۹۰۰ء کے اختتام سے پہلے میرا کالج میں داخل ہونے کا خواب، اصلیت کی شکل اختیار نہ کر سکا مجھے ریڈکلف میں داخلے کا پہلا دن یاد ہے۔ میرے لئے یہ دن دلچسپیوں سے لبریز تھا۔ کئی سالوں سے میں اسی دن کی متوقع رہی تھی مجھے ایک زبردست قوت نے جو میرے احباب کی ترغیب اور میرے دلی اصرار سے زیادہ مضبوط تھی۔ یہ تحریک کی تھی۔ کہ میں اپنی طاقت کا مقابلہ ان لوگوں کے معیاروں کے مطابق کروں۔ جو دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ میں جانتی تھی۔ کہ میرے راستے میں مشکلات حائل ہیں۔ لیکن میں انہیں مغلوب کر لینے کی خواہشمند تھی۔ میں نے اس دانا رومی کے الفاظ دل پر نقش کر لئے تھے۔ جس نے یہ کہا تھا۔ کہ روما سے شہر بدر کئے جانے کے تو فقط یہی معنی ہیں کہ اندرونِ شہر کی بجائے اس سے باہر زندگی بسر کروں۔" علم کی شاہراہ سے بدر ہو کر مجھے فقط اتنا ہی خسارہ تھا۔ کہ میں اپنا علمی سفر ایسے دیہاتی راستوں سے اختیار کرنے پر مجبور تھی۔ جن پر کثرت کے ساتھ آمد و رفت نہ ہو۔ میں جانتی تھی کہ کالج میں بہت سے علم کے ایسے چور راستے موجود ہیں۔ جہاں میں ان لڑکیوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر سکتی تھی۔ جو میری طرح تخیل، موانست اور علمی جدو جہد میں مصروف تھیں۔ میں نے خدا کا نام لے کر اپنے مطالعہ کو اشتیاق کے ساتھ جاری کیا۔ ایک نئی دُنیا اپنی شانِ رعنائی اور اپنے علمی کو ساتھ لئے ہُوئے مجھ پر منکشف ہو رہی تھی۔ اور میں نے تمام اشیاء کو معلوم کرنے کی قابلیّت کو اپنے ہاں موجود پایا نفس کے عجائب خانے میں کسی اور ذی رُوح کی مانند مجھے بھی آزادی

اور مساوات حاصل تھی۔ اس کے اندر جو جو نظارے اطوار اور شادی غمی کی کیفیات موجود ہیں۔ اور جنہیں اصلی دُنیا کا زندہ اور صحیح ترجمان ہونا چاہئے۔ وہی کیفیات مجھے بھی محسوس ہوتی تھیں۔ لیکچروں کے ہال کمروں میں حکما اور مشاہیر کی رُوح پائی جاتی تھی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پروفیسر حکمت کے زندہ مجسمے ہیں۔ اس وقت کے بعد اب تک اگر اس کے خلاف میرے خیالات میں کچھ تبدیلی واقع ہُوئی ہے تو مَیں اسے کسی پر آشکار نہیں کروں گی۔ مجھے جلد ہی یہ معلوم ہونے لگا۔ کہ کالج دراصل وہ پُر افسانہ درسگاہ نہیں، جو میرے تخیل میں تھی۔ میرے بہت سے خواب، جو میری ناتجربہ کاری کے باعث دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اپنی شانِ دلآویزی کھوکر روزِ روشن میں بے حقیقت ہو چکے تھے۔ مَیں نے رفتہ رفتہ یہ معلوم کرنا شروع کیا کہ کالج کے داخلے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ ایک دقت جو مجھے اس وقت سے اب تک محسوس ہو رہی ہے وقت کی قلت تھی۔ اس سے پیشتر مَیں اپنے دل کے ساتھ غور و فکر میں مصروف رہتی تھی۔ مَیں کسی شام کو بیٹھ کر اپنی رُوح کے اندرونی نغموں میں مگن رہا کرتی تھی۔ یہ کیفیت اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جبکہ کسی کے پاس فراغت کی گھڑیاں ہوں۔ اور اس حالت میں کسی مرغوب شاعر کا کلام ان روحانی تاروں کو چھیڑ کر وجد میں لاسکے۔ جو اس سے قبل خاموش پڑی رہی ہوں۔ لیکن کالج میں اپنے خیالات کے ساتھ ہمکلام ہونے کی فرصت کہاں؟ وہاں بظاہر انسان تحصیل علم کے لئے جاتا ہے نہ کہ تخیل میں غوطے کھانے کے لئے جب کوئی شخص ان علمی دروازوں میں داخل ہوتا ہے تو اسے اپنی عزیز ترین مسرتوں یعنی اپنے تخیل اور تفریح کی کتب کو باہر ہی باہر سرسراتے ہُوئے درختوں کے پاس الوداع کہہ کر آنا پڑتا ہے۔ مجھے اس خیال سے یہ معلوم کرکے تسلی حاصل ہونی چاہئے تھی کہ مَیں آئندہ کی تفریح کے لئے علم کا ذخیرہ جمع کر رہی ہوں۔ لیکن چونکہ مَیں ناعاقبت اندیش تھی۔ اس لئے مَیں اپنی موجودہ خیالی خوشیوں کو دولتِ علم کے اُس خزانے پر ترجیح دے رہی تھی جو کسی ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔ کالج کے پہلے سال میں میرے مضامین فرانسیسی، جرمن، تواریخ، انگریزی مضمون نویسی اور ادبیات تھے۔ مَیں نے فرانسیسی میں کارنیلی، مولیئر، ریسین، الفریڈ ڈی موسیٹ، اور سینٹ بیو کی بعض تصانیف کو عبور کیا۔ اور جرمن میں گوئٹے اور شلر کی تصانیف کو پڑھا مَیں نے سرعت کے ساتھ سلطنت رومۃ الکبریٰ کے زوال سے لیکر اٹھارھویں صدی کی تاریخ تک تمام حصے کا مطالعہ کر ڈالا۔ انگریزی علم ادب میں ملٹن کی نظموں اور اس کی تصنیف "ایریو پیگٹیکا" کا تنقیدی پہلو سے مطالعہ کیا۔ بسا اوقات مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ مَیں نے کالج میں ان حیرت انگیز کام کی دقتوں کو کس طرح مغلوب کیا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ

جماعت کے کمرے میں مجھے عملی طور پر تنہائی میں ہی بیٹھنا پڑتا تھا۔ پروفیسر تقریر کرتے وقت مجھ سے اس قدر دور ہوتا تھا۔ گویا وہ ٹیلیفون کے ذریعہ باتیں کر رہا ہے۔ اس کے لیکچر میرے ہاتھ پر جتنی سرعت کے ساتھ ممکن ہوتا تھا دستی ہجا کے ذریعے ظاہر کئے جاتے تھے۔ اس طریق سے جماعت کے ساتھ چلنے کی دوڑ میں پروفیسر کی شخصیت کا بیشتر حصّہ مجھ سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ الفاظ میرے ہاتھ پر ان شکاری کتّوں کی سی تیزی کے ساتھ دوڑ لگاتے تھے۔ جو کسی خرگوش کا تعاقب کر رہے ہوں اور جسے وہ اکثر پکڑ نہیں سکتے۔ لیکن اس لحاظ سے میں ان لڑکیوں کے مقابلے میں چنداں پیچھے نہیں رہتی تھی۔ جو لیکچر سُن کر اس کے اشارات قلمبند کرتی تھیں۔ میرا مدعا یہ ہے۔ کہ اگر انسانی نفس الفاظ کو سُننے اور انہیں مشین کی طرح اندھا دھند کاغذ پر لکھنے کے کام میں مشغول ہو تو میرا خیال ہے۔ کہ وُہ زیر بحث مضمون یا ادائیگیِ مطلب کی طرف چنداں متوجہ نہیں ہو سکتا۔ میں لیکچر کے دوران میں اس کے نوٹ کیسے قلمبند کر سکتی تھی۔ جبکہ میرے ہاتھ گویا اسے سننے میں مشغول تھے۔ بالعموم میں بعد میں گھر جا کر لیکچر کا جس قدر حصّہ یاد آتا تھا لکھ بھی لیتی تھی۔ روزمرّہ کے مضامین، مشقیں، تنقید اور امتحانی پرچوں ششماہی اور سالانہ امتحانات کے جوابات کو اپنے ٹائپ رائٹر پر چھاپ لیتی تھی۔ جس سے پروفیسروں کو میری قابلیت معلوم کرنے میں کوئی دقّت محسوس نہ ہوتی تھی۔ جب میں نے لاطینی علم عروض کا مطالعہ شروع کیا۔ تو میں نے بحر کی علامات کا ایک طریق ایجاد کر کے اپنے پروفیسر کو سمجھایا۔ جس سے شعر کے مختلف بحر اور اوزان مجھ پر ظاہر ہو سکتے تھے۔ میں نے ٹائپ کی مختلف مشینیں آزمانے کے بعد ہمینڈ کی مشین کو اپنے کام کی خاص ضروریات کے مطابق نہایت موزوں پایا ہے۔ اور میں نے اسی کا استعمال اب تک جاری رکھا ہے۔ اس مشین کے ذریعے حروف منقولہ کی پھرکیوں کا استعمال ہو سکتا ہے۔ اور بیک وقت مختلف پھرکیوں کے ذریعے سے مختلف حروف کے مجموعوں، مثلاً یونانی، فرانسیسی یا ریاضی کی علامات لگا کر بموجب ضروریاتِ تحریر اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس مشین کے بغیر میں کالج میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ مختلف مضامین کی مطلوبہ کتب میں بہت کم ایسی ہیں جو اندھوں کے لئے طبع ہوئی ہیں۔ اسی لئے میں مجبوراً ان کے مفہوم کی خاطر اپنے ہاتھ پر ان کا ہجا کرانے کی محتاج تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے دوسری لڑکیوں کی نسبت اپنے اسباق کی تیاری کے لئے زیادہ وقت درکار ہوتا تھا۔ اس میں دستی ہجا اور تحریر کا حصّہ مقابلۃً زیادہ طولانی ہے۔ اور مجھے اس باب میں بعض ایسی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جن سے دوسری لڑکیاں محفوظ تھیں۔ بعض دن ایسے بھی آتے تھے کہ تفصیلات پر پوری پوری مطلوبہ توجہ صرف کرنے سے میرا مزاج برہم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں اس خیال سے آمادہ جنگ ہو جاتی تھی کہ مجھے

تو چند ابواب کے پڑھنے پر گھنٹوں صرف کرنے ہونگے۔ جب کہ اسی اثنا میں باہر دوسری لڑکیاں اچھل کود، نغمہ سرائی اور ہنسی کھیل میں مصروف ہیں۔ لیکن اس کے بعد معاً میں اپنی زندہ دلی کو بحال کر کے اس ناشکری کے تصوّر کو دل سے نکال ڈالتی تھی بہرحال جس کسی کو صحیح علم حاصل کرنا ہے اسے مشکلات کی کٹھن پہاڑی پر تن تنہا سفر کرنا ہوگا۔ اور چونکہ اس علمی چوٹی پر پہنچنے کی کوئی شاہراہ تو ہے نہیں، لہٰذا مجھے بالخصوص وہاں تک پہنچنے کے لئے اپنی ہی کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی راہ نکالنی پڑتی تھی۔ میں اس سفر میں بسا اوقات پیچھے پھسل پڑتی تھی، کبھی گر پڑتی اور کبھی کھڑی ہو جاتی تھی۔ پھر بھی کبھی کسی سدِّ راہ کے ساتھ ٹکر کھا کر بدمزاج ہو جاتی۔ لیکن جلد ہی سنبھل کر صحیح الخیال ہو جاتی تھی۔ میں کوشش کر کے چلتی تھی۔ پھر ترقی کرنے لگتی جس سے مجھے کچھ حوصلہ ہو جاتا۔ میں اور زیادہ مشتاق ہو کر بلندی پر چڑھ جاتی۔ اور مجھے علم کا وسیع افق نظر آنے لگتا تھا۔ ہر کشمکش کو ایک فتح تصوّر کرنا چاہیے چنانچہ ایک اور کوشش سے میں چمکدار بادل کی بلندی پر چڑھ گئی۔ اور آسمانِ علم کی نیلگوں گہرائی سے گزر کر اپنی خواہش کی بلند فضا پر پہنچ گئی۔ اس تمام کشمکش میں میں پھر بھی تنہا سفر نہیں کر رہی تھی۔ مسٹر ولیم ویڈ اور مسٹر ای ایلن پرنسپل پینسلونیا نابینا مدرسہ نے میرے لئے بہت سی ابھرے ہوئے حروف کی کتب بہم پہنچائیں۔ ان کی خبرگیری میرے حق میں اسقدر امداد اور حوصلہ افزائی کا موجب رہی۔ کہ خود انہیں اس کا علم مجھ سے زیادہ نہیں ہُوا۔ ریڈکلف میں دوسرے سال کے قیام میں میں نے انگریزی مضمون نگاری انجیل بحیثیت انگریزی ادب امریکہ اور یورپ کا نظامِ حکومت ہورَیس کا منظوم کلام اور لاطینی کامیڈی[۱۵] کا مطالعہ کیا۔ مضمون نویسی کی جماعت سب سے پُرلطف تھی۔ اس کے لیکچر ہمیشہ دلچسپ مسرت افزا اور ظریفانہ ہوتے تھے۔ کیونکہ اس شعبہ کے لیکچرار مسٹر چارلس ٹاؤنسینڈ کوپلینڈ تمام ان لیکچراروں کے مقابلے میں جن سے میں مستفید ہوئی۔ علم ادب کو اپنی جدّتِ طبع اور پوری قوّت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ گھنٹہ بھر کے لیکچر میں ہمیں تمام ماہرینِ ادب کے خیالات کے بہترین نچوڑ سے جو ایک دائمی رعنائی کو اپنے ساتھ لئے ہُوتے تھا کسی قسم کی فضول تشریح اور توضیح کے بغیر سرشار ہونے کا موقع ملتا تھا۔ جس سے ان نفیس خیالات کا سرور طبیعت پر چھا جاتا تھا۔ انجیل کے پُرانے عہد نامے کی سُریلی گرج کے لطف میں تمام رُوح شریک ہوتی تھی۔ اس کے بعد انسان ایک ایسے مسرت آمیز احساس کے ساتھ گھر جاتا ہے کہ اسے اس تکمیل کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جس میں جسم اور رُوح ایک غیرفانی خوش آہنگی اور موافقت کے ساتھ ابدی زندگی

---

[۱۵] کامیڈی اس ناٹک کو کہتے ہیں جسکا انجام شادمانی ہو۔ (مترجم)

گزار رہے ہوں۔ نہالِ زمانہ کی قدیمی شاخ پر حقیقت اور حسن کا پھول ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتا ہے۔

یہ سال زندگی کا سب سے زیادہ مسرت افروز زمانہ تھا۔ کیونکہ میں نے وہ مضامین پڑھے جس میں مجھے خاص دلچسپی تھی یعنی اقتصادیات۔ ملکہ الزبیتھ کے عہد کا علم ادب شیکسپیئر (زیرِ نگرانی پروفیسر جارج کٹریج صاحب) اور تاریخ فلسفہ، جسے پروفیسر جوزایا رائیس پڑھاتے تھے۔ فلسفہ کے مطالعہ سے ہمیں عہدِ قدیم کی روایات اور دوسری اقسامِ خیال سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ جو اس کے بغیر ہمیں اجنبی اور نامعقول دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن میری توقع کے خلاف کالج ایسی جگہ ثابت نہیں ہوتی۔ جسے حکمائے یونان کا ایک ہمہ گیر مرکز کہا جا سکے۔ کالج میں ہمیں مشاہیرِ عالم سے ملاقات نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہم ان کی زندہ موجودگی کا احساس کر سکتے ہیں۔ گو ان کا وجود وہاں چھایا ہوتا ہے لیکن دراصل وہ مومیائی مصری کی طرح ہے۔ ہمیں علم کی شگاف دار دیواروں سے ان کو باہر نکال کر ان کی تجزی تحلیل اور چیر پھاڑ کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے روبرو ایک حقیقی ملٹن یا یسعیاہ نبی کھڑا ہے۔ اور وہ محض ایک ہوشیاری اور چالاکی سے بنائی ہوئی نقل نہیں ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت سے عالم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کہ علم ادب کی بڑی بڑی تصانیف سے ہمارا مسرور ہونا، اس امر پر موقوف نہیں کہ ہم ان کا پورا پورا ادراک کر سکیں۔ بلکہ وہ ہماری ہمدردی کی گہرائی پر منحصر ہے۔ دقت یہ ہے کہ ان تصانیف کی محنت سے انجام دی ہوئی تشریح کا بہت کم حصہ ذہن میں باقی رہتا ہے۔ نفس ان حصوں کا تحفظ اسی طرح چھوڑ دیتا ہے جیسے کوئی ثمردار شاخ اپنے حد سے زیادہ پختہ میوے کو نیچے گرا دے یا ہمارے لئے کسی پھول کو مع اس کی جڑ، ٹہنی دوسرے حصوں اور اس کے نمو کے تمام عمل کے معلوم کر لینا آسان ہے لیکن با ایں ہمہ یہ ممکن ہے کہ ہمیں اس پھول کے حسن کا کوئی اندازہ نہ ہو۔ جب کہ آسمان کے تلے شبنم نے اسے ابھی ابھی غسل کرایا ہو۔ میں نے بار بار بے صبری کے ساتھ دل سے یہ سوال کیا ہے۔ کہ "میں کیوں فضول تشریحات ادب میں الجھتی رہوں؟" یہ تشریحات میرے فضائے خیال میں ادھر سے اُدھر اس طرح چکر لگاتی ہیں۔ جیسے اندھے پرندے ہوا میں اپنے بے اثر بازوؤں کے ساتھ پر مارتے ہوں۔ میرا اس سے یہ مدعا نہیں کہ میں اپنی زیرِ مطالعہ مشہور تصانیف کے مکمل ادراک اور علم حاصل کرنے پر اعتراض کر رہی ہوں۔ میں فقط اُس لاانتہا ہی تشریح اور عقل حیران کر دینے والی تنقید پر معترض ہو رہی ہوں۔ جو فقط ایک ہی سبق سکھاتی ہے یعنی یہ کہ "جتنے مُنہ اتنی باتیں۔" البتہ جب پروفیسر کٹریج

جیسا علّامہ شیکسپیر کے کلام کی تشریح کرے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں۔ پروفیسر ممدوح دراصل شیکسپیر کو آنکھوں کے سامنے لاکر زندہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مَیں چاہتی ہوں کہ جن باتوں کے جاننے کی مجھ سے توقع کی جاتی ہے ان میں سے نصف کو برطرف کر دوں۔ کیونکہ تھکا ماندہ دماغ اس علمی خزانے کا لطف نہیں اُٹھا سکتا، جس کے حاصل کرنے میں اسے حد سے زیادہ محنت صرف کرنی پڑے۔ میرا خیال ہے کہ ایک ہی دن میں چار یا پانچ مختلف کتابیں پڑھ لینا دشوار ہے، جو مختلف زبانوں اور مختلف مضامین کے متعلق ہوں۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی وہ مقصد بھی نظر سے اوجھل نہ ہو۔ جس کے لئے ہم مطالعہ کر رہے ہوں۔ جب کوئی شخص تحریری امتحان کا تصوّر دل میں لئے ہُوئے سرعت اور گھبراہٹ کے ساتھ مطالعہ کرے تو اس کا دماغ نادر خیالات کے ایک ایسے ذخیرے سے لبریز ہو جاتا ہے۔ جس کا چنداں فایدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت میرے دماغ کی بھی یہی کیفیت تھی کہ اِس میں مختلف خیالات کا ایک انبار تھا۔ جسے ترتیب دینے کی کوشش کرتے وقت مجھے تقریباً ناکامی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ جب مَیں اُس خطۂ قلب میں داخل ہوتی تھی۔ جہاں میرے نفس کا تعلّی جزو حکمرانی کرتا ہے۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیش محل میں کُتّا گھس آیا۔ ہزاروں متفرقاتِ علم میرے دماغ میں اس طرح آنے شروع ہوتے تھے۔ جیسے آسمان سے اولے گریں۔ جب مَیں ان سے بچنے کی کوشش کرتی تو مضامین کے بھُوت اور طرح طرح کے کالجی عفریت میرا پیچھا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دق ہوکر میرا جی چاہتا تھا۔ (اگرچہ یہ خواہش قابلِ معافی ہے) کہ مَیں ان تمام علمی بتوں کو جن کی پرستش کرتی رہی ہوں۔ زمین پر دے ماروں اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ میری کالجی زندگی میں امتحانات کا ہوّا سب سے زیادہ ڈراؤنا تھا۔ اگرچہ مَیں کئی مرتبہ اُس سے دوچار ہوئی۔ اور مَیں نے اسے زمین پر بہتیری پٹخنیاں دیں۔ لیکن پھر بھی وہ بھُوت اُٹھ کھڑا ہوتا اور مجھے اپنی زرد رو ہیبت سے دھمکیاں دیتا تھا۔ حتیٰ کہ بوب ایکرز[1] کی مانند میری بہادری "میری انگلیوں کے سروں پر سے پھُوٹ پھُوٹ کر نکلنے لگتی تھی۔" کڑی آزمائش کے ان ایام کی ابتدا سے پیشتر کئی دن تک دماغ میں مضامین کے مخفی اور متعلق قواعد اور ناقابلِ ضبط تواریخ کا مواد ٹھونسنا پڑتا تھا۔ یہ سب ایک بد ذائقہ طعام ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی

[1] انگریزی ڈراما نویس شیریڈن کے ایک ناٹک میں ایک ڈرپوک، مغرور لڑاکے اور مسخرے کیریکٹر کا نام ہے۔ عبارت بین الواوین اسی کیریکٹر کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں (مترجم)

بھرمار کرتے کرتے میرا جی چاہتا تھا کہ میں کتب اور سائنس سمیت سمندر کی گہرائی میں ڈوب مروں۔ بالآخر جس وقت کا دھڑکا ہوتا ہے وہ آن پہنچتا ہے۔ اگر تم نے اس کی تیاری کی ہو تو تم ایک خوش قسمت انسان ہو کہ اپنے ان خیالات کو اپنی مدد کے لئے بروقت نکال کر اس عظیم کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تم ان خیالات کو اپنے پاس بلانے کی غرض سے اپنا بگل بجاتے ہو۔ مگر اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ تب انسان نہایت حیران ہو کر غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہے۔ کہ عین اسوقت جبکہ ہمیں اپنے حافظے اور قوتِ امتیاز کی مدد درکار ہوتی ہے یہ تو پر لگا کر اُڑ جاتی ہے۔ جن امور کے تحفظ میں تم نے بے انتہا محنت صرف کی ہو، وہ عموماً عین اس آڑے وقت میں جواب دے جاتے ہیں۔ اور پاس نہیں پھٹکتے۔

مثلاً سوال کیا جاتا ہے کہ "ہسؔ اور اس کے کارناموں کا مختصر حال لکھو۔" ہم سوچتے ہیں کہ "یہ کون شخص تھا۔ اور اس کے کارنامے کیا تھے؟ تعجب ہے کہ نام تو آشنا معلوم ہوتا ہے۔" ہم تاریخی امور کے ہیزانیہ میں ادھر اُدھر بہتیرا نظر دوڑاتے ہیں۔ جس طرح درزی کسی تھیلے میں ریشم کی کوئی کترن تلاش کرتا ہے۔ اور وہ اسے نہیں ملتی۔ وہی حالت ہماری ہوتی ہے۔ ہمیں یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ شخصیت، جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، ابھی اگلے روز ہی ہماری نظر سے گزری تھی۔ جبکہ ہم تاریخ کے حصۂ "اصلاح" کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لیکن اب وہ کہاں غائب ہے؟ ہم علمِ تاریخ کے متفرق حصوں پر نظر دوڑاتے ہیں یعنی انقلاب، قتلِ عام، طریقِ حکومت وغیرہ لیکن ہسؔ کہیں نظر نہیں آتا۔ ہم ان تمام امور کو جو امتحانی پرچے میں درج نہیں، جانتے ہیں۔ اور اس سے ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے لیکن اس بے حقیقت سی بات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ بالآخر دق ہو کر ہم اپنے ذخیرۂ علم کو دھتکارتے ہیں۔ اور تمام چیزیں باہر نکل آتی ہیں۔ لیجئے آپ کے ہسؔ صاحب ایک کونے میں متانت کے ساتھ کھڑے کچھ سوچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں کہ ہم پر وہ کہاں سے اتنی مصیبت لے آئے تھے۔ عین اسوقت امتحان کے نگران صاحب پکار اُٹھتے ہیں کہ "وقت ہو چکا" ہم ایک نہایت شدید بدمزگی کے ساتھ اس تمام علمی ردی کو جو ہمارے ذہن میں جمع تھی ایک کونے میں ٹھکا کر گھر چلے آتے ہیں۔ اور ہمارے دماغ میں ممتحن کے اس خدائی اختیار کے خلاف انقلاب آمیز خیالات کی ایک گشت شروع ہو جاتی ہے۔ جو اسے امتحان دہندہ کی مرضی کے بغیر سوالات پوچھنے کے لئے حاصل ہے۔

اس باب کے آخری ایک دو صفحات میں بعض استعارے میں نے اس قسم کے استعمال کئے ہیں جن کو پڑھ کر

ناظرین میری ہنسی اڑائیں گے۔ اب بھی یہ استعارے میرے روبرو اکڑ اکڑ کر چلتے اور مجھ پر تمسخر کر رہے ہیں اور اس شیش محل کے گنبد پر اولے برس رہے ہیں ڈراؤنے ہوئے اس پر زرد رو ہو کر ٹکٹکی لگا رہے ہیں۔ ان استعاروں کی تحلیل کہاں تک کیجائے۔ انہیں مجھ پر ہنسنے دیجئے۔ ان الفاظ کا استعمال تو میرے لڑکھڑانے والے خیالات کی فضا کو جس میں میری زندگی بسر ہوتی رہی ہے ایسی خوبی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ اب میں ایسے الفاظ کو آخری مرتبہ دیکھ کر ان کا دفتر تہ کئے دیتی' میں اور متانت کو اپنا شعار کرکے' یہ کہے دیتی ہوں' کہ اب میرے کالج خیالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہ تذکرہ محض اس فضا کے بموجب تھا' جو کالج کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ میں ابھی ریڈ کلف میں اپنے مستقبل کا انتظار کر رہی تھی' کہ ان ایام کے اردگرد افسانیت کا ایک روشن حلقہ چھا گیا تھا' جو اب مدھم پڑ چکا ہے۔ لیکن افسانہ پن سے ہٹ کر اصلی دنیا میں قدم رکھتے وقت جو انقلاب کا زمانہ آیا۔ اس میں مجھے بہت سی چیزوں کا علم حاصل ہوا۔ اگر میں اس تجربہ کی آزمائش نہ کرتی' تو یہ واقفیت مجھے ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ ان اشیاء میں سے ایک تو صبر و تحمل کی قیمتی سائنس ہے جو یہ ہے کہ ہمیں اپنی تعلیم اس طرح حاصل کرنی چاہئے جیسے ہم کسی ملک میں سیر کر رہے ہوں۔ ہمارے دلوں کو ہر قسم کے اثرات قبول کرنے کے لئے کشادہ رہنا چاہئے۔ ایسا علم' غائب روح کو گہرے خیالات کے بے آواز مدوجزر کے ساتھ بھرپور کر دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علم ایک طاقت ہے۔ "نہیں' بلکہ میں کہونگی کہ علم تو ایک سامانِ راحت ہے۔ کیونکہ وسیع اور گہرے علم کے ذریعے اصلی مقاصدِ زیست' باطل مقاصد سے اور بلند اشیاء پست چیزوں سے الگ الگ تمیز کی جاتی ہیں۔ اُن خیالات اور کارناموں کو معلوم کرنا جو انسانی ترقی کو متاثر کرنے والے ہیں۔ دراصل انسانیت کے قلبِ واحد کی اس آواز کو سننا ہے۔ جو صدیوں سے دھڑکتا چلا آتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان تمام حرکات میں آسمان کی طرف بلند ہونے کی کوشش کا اثر نہیں پاتا' تو وہ زندگی کی ہم آہنگ صداؤں کی طرف سے بہرا ہے۔

اکیسواں باب

کتابی تعلیم کی ابتدا اور انتہا

میں نے اس وقت تک اپنی زندگی کے واقعات ایک کا خاکہ سا کھینچا ہے۔ لیکن میں نے یہ نہیں بتلایا کہ نہ فقط مسرت اور دانائی کی خاطر بلکہ اُس تمام علم کی خاطر

جو دوسرے لوگوں کو اپنی آنکھوں اور کانوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ مَیں کہاں تک کتابوں کی محتاج رہی ہوں درحقیقت میری تعلیم میں کُتب کی وقعت، دوسروں کی تعلیم کے مقابلے میں اس قدر زیادہ رہی ہے کہ اس کا بیان مَیں اس وقت سے شروع کرتی ہوں۔ جب سے میں نے پڑھنے کی ابتدا کی، مَیں نے اپنی سب سے پہلی مسلسل کہانی مئی ۱۸۸۷ء میں پڑھی تھی۔ جبکہ میری عمر سات برس کی تھی۔ اور اس دن سے آج تک، جو واقفیت مطبوعہ شکل میں میری تشنۂ علم انگلیوں کے سروں تک پہنچی، اسے مَیں نے جذب کر لیا۔ جیسا کہ مَیں نے بیان کیا ہے۔ میری تعلیم کے ابتدائی سالوں میں، میرا مطالعہ باقاعدہ نہیں رہا تھا۔ اور نہ مَیں نے کسی ضابطے کی پابندی کے بموجب پڑھا تھا۔

پہلے پہل میرے پاس صرف چند اُبھرے حروف کی کتابیں تھیں یعنی مبتدیوں کی "ریڈریں"، بچوں کے لئے چند کہانیوں کا مجموعہ اور زمین کے متعلق ایک کتاب "ہماری دُنیا" تھی۔ یہی میرا تمام ذخیرہ تھا۔ لیکن میں نے ان کو بار بار پڑھا حتیٰ کہ الفاظ اُنگلیوں سے دب کر اتنے پُرانے ہو گئے۔ کہ وہ پڑھے نہیں جا سکتے تھے بعض اوقات مس سلیون صاحبہ مجھے پڑھ کر سُنایا کرتی تھیں یعنی میرے ہاتھ پر چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور نظموں کا ہجا کر دیتی تھیں۔ جنہیں مَیں سمجھ سکتی تھی۔ لیکن مَیں اس طریق کی بجائے از خود پڑھنے کو ترجیح دیتی تھی۔ کیونکہ جن چیزوں سے مَیں لطف اُٹھاتی تھی۔ انہیں بار بار پڑھنا پسند کرتی تھی۔ بوسٹن کی سیر کے دوران میں مجھے یہ اجازت تھی کہ دن کا کچھ حصہ انسٹی ٹیوشن کے کتب خانہ میں صرف کروں اور ایک الماری سے دوسری الماری تک گشت لگا کر جو کچھ میری اُنگلیوں کے تحت میں آئے اُسے ضبط کر لوں۔ خواہ مَیں ایک صفحے پر دس لفظوں میں سے ایک یا دو لفظ ہی سمجھ سکوں۔ تاہم مَیں پڑھتی ضرور تھی۔ الفاظ کا وجود ہی میرے لئے نادر تھا۔ لیکن مَیں جو کچھ پڑھتی تھی اس کا کوئی اندازہ ہوشمندی کے ساتھ نہیں کرتی تھی۔ تاہم اس زمانے میں میرا ذہن بہت ہی اثر پذیر ہو گا۔ کیونکہ بہت سے الفاظ اور جملے کے جملے مجھے حفظ یاد ہو جاتے تھے ــــ جن کے معانی کا مجھ کو ذرا سا بھی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ بعد ازاں جبکہ مَیں بولنے اور لکھنے لگی۔ اس وقت یہی الفاظ اور جملے بالکل قدرتی طور پر دورانِ گفتگو میں نکل پڑتے تھے۔ اور اس سے میرے احباب میرے ذخیرۂ الفاظ کی کثرت پر تعجب کرتے تھے۔ مَیں نے بہت سی کتابوں کے منتخب حصے پڑھے تھے۔ کیونکہ مَیں سمجھتی ہوں کہ ان ابتدائی دنوں میں شاید مَیں نے ایک بھی کتاب مکمل نہیں پڑھی تھی۔ مَیں نے نظم کا بہت سا حصہ کسی نافہم طریق پر پڑھا تھا۔ تا آنکہ مجھے ایک کتاب "چھوٹا نواب فونٹ لرائے" ملی، یہی وہ پہلی قابلِ قدر کتاب تھی

جسے میں نے سمجھ کر پڑھا تھا۔ ایک دن میری اُستانی نے مجھے کتب خانہ کے ایک کونے میں مشہور ناول "سُرخ چھٹی" کے صفحے اُلٹتے ہُوئے پایا، اس وقت میری عمر تقریباً آٹھ برس کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُستانی صاحبہ نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ کہ تم "ننھے موتی کو پسند کرتی ہو" اور اُنہوں نے بعض الفاظ کی تشریح کی تھی۔ جو میری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ اس کے بعد اُنہوں نے مجھے بتلایا۔ کہ ایک چھوٹے لڑکے کے متعلق ایک نہایت خوبصورت کہانی ان کو معلوم ہے۔ جو مجھے "سُرخ چھٹی" سے زیادہ پسند آئیگی۔ اس کہانی کا نام "چھوٹا نواب فونٹ لرائے" تھا۔ اور اُنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اسے آئندہ موسم سرما میں مجھے پڑھ کر سنائیں گی۔ لیکن ہم نے اس قصّے کو اگست سے پہلے شروع نہیں کیا۔ کیونکہ ساحلِ سمندر پر میرے قیام کے ابتدائی چند ہفتے نئے ولولوں اور نئی نئی دریافتوں سے اسقدر لبریز تھے۔ کہ میں کتابوں کا وجود ہی بھول گئی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لئے میری اُستانی صاحبہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بوسٹن میں چند دوستوں سے ملنے چلی گئیں۔ جب وہ واپس آئیں تو ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا "کہ چھوٹا نواب فونٹ لرائے" کی کہانی کا مطالعہ شروع کیا۔ مجھے وہ جگہ اور وقت بخوبی یاد ہے۔ جبکہ ہم نے اس دلچسپ بچوں کی کہانی کے ابتدائی ابواب کو پڑھنا شروع کیا تھا۔

اگست کی ایک گرم سہ پہر تھی۔ اور ہم سے کچھ فاصلے پر، دو شاندار چیڑ کے درخت تھے۔ ہم ان درختوں سے بندھے ہُوتے ایک جھولے دار بستر پر بیٹھی تھیں۔ ہم دوپہر کے کھانے کے بعد جلد جلد برتن صاف کر چکی تھیں تاکہ ہمیں اس کہانی کے پڑھنے کے لئے سہ پہر کا زیادہ سے زیادہ حصّہ مل سکے۔ جب ہم لمبی گھاس میں سے جلد جلد جھولے دار بستر کی طرف گئیں، گھاس کے ٹڈے ہمارے ارد گرد جھنڈ بنا کر پھُدکتے ہُوئے ہمارے لباس پر آبیٹھے اور مجھے یاد ہے کہ اُستانی صاحبہ نے اس امر پر اصرار کیا تھا؛ اگرچہ یہ اصرار در اصل تضیع اوقات تھا کہ بستر پر بیٹھنے سے قبل مجھے ان تمام ٹڈوں کو پکڑنا چاہیے۔ بستر میں چیڑ کے سوزن نما پتے بھرے ہُوئے تھے۔ کیونکہ اُستانی صاحبہ کی غیر حاضری میں اس کا استعمال کسی نے نہیں کیا تھا گرم سُورج کی روشنی سے ان درختوں کی تمام خوشبو باہر نکلی پڑتی تھی۔ ہوا صحت بخش تھی۔ اور اس میں سمندری نباتات کی خوشبو پائی جاتی تھی۔ قصّہ خوانی سے پیشتر مس سلیون صاحبہ نے قصہ کے اُن تمام امور کو واضح کیا۔ جنہیں میں نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اور جوں جوں ہم نے پڑھنا شروع کیا، وُہ مشکل الفاظ کی تشریح کرتی گئیں۔ ابتداً میں بہت سے الفاظ سے ناآشنا تھی۔ اور اسی وجہ سے بار بار پڑھائی میں رکاوٹ واقع ہوتا تھا۔ لیکن جونہی میں قصّے کے حالات پر حاوی

ہوئی پھر تو میں اس میں مشتاقانہ اتنی محو ہوئی کہ بعض الفاظ کو معانی کی غرض سے خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ اور جب اُستانی صاحبہ بعض ضروری تشریحات کرنے پر اصرار بھی کرتی تھیں تو میں نہایت بے صبری کے ساتھ اس خیال سے انہیں سُنتی تھی کہ وہ کب ختم کریں اور میں کہانی پڑھوں، جب ان کی اُنگلیاں تھک کر مزیدار الفاظ کے ہجا کرنے سے قاصر ہو گئیں۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اپنی معذوریوں کا شدید احساس ہُوا۔ میں نے کتاب ہاتھ میں لے لی۔ اور اس کے حروف کو ایک شدت کی خواہش کے ساتھ جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی ٹٹولنا شروع کیا۔ بعد ازاں میرے گہرے اشتیاق کو دیکھ کر مسٹر اینگنوز نے اس قصے کو اُبھرے حروف میں تیار کرا دیا۔ اور میں نے اسے بارہا پڑھا۔ حتےٰ کہ کتاب مجھے تقریباً ازبر یاد ہو گئی۔ اور میرے تمام بچپن کے زمانے میں " چھوٹا نواب فونٹ لرائے " میرا پیارا ساتھی رہا۔ میں نے ان تفصیلات کو بیان کرنے میں قدرے بے لطف طوالت سے اس لئے کام لیا ہے کہ وہ بالعموم میرے ابتدائی مطالعہ کی غیر معین، تغیر پذیر اور دھندلی یاد کے ساتھ مقابلہ کرنے پر روشن دکھائی دیتی ہیں۔ میری کتاب بینی کی صحیح دلچسپی کی ابتدا اسی قصے سے ہوتی ہے۔ میں نے اگلے دو سالوں کے عرصہ میں گھر پر اور بوسٹن کے آتے جاتے بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ وہ کونسی کتب تھیں۔ میں نے انہیں کس ترتیب کے ساتھ پڑھا تھا لیکن میں اتنا جانتی ہوں۔ کہ ان کتب میں "یونانی بہادر" لافونٹین[51] کے "اخلاقی قصے" ہاتھورن[52] کا "فسانۂ عجائب" "انجیلی قصے" "شیکسپیر کی کہانیاں" مصنفہ لیمب[53] "بچوں کی انگلستان کی تاریخ" مصنفہ ڈکنز[54] "الف لیلہ" "سوز فیملی رابنس" "حاجی کا سفر"[55] "رابنسن کروسو"[56] "چھوٹی عورتیں" اور ایک دلچسپ قصہ

[51] لافونٹین۔ مشہور فرانسیسی شاعر اور افسانہ نویس۔ اس کے قصے بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ پیدائش ۱۶۲۱ء تاریخ وفات ۱۶۹۵ء (مترجم)

[52] نیتھنیل ہاتھورن (۱۸۰۴ء - ۱۸۶۴ء) امریکہ کا نامور افسانہ نویس ہے (مترجم)

[53] چارلس لیمب (۱۷۷۵ء - ۱۸۳۴ء) انگریزی انشا پرداز۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر میں محرر رہا۔ اس نے سب سے پہلے شیکسپیر کے ڈراموں کو نثر میں لکھا۔ (مترجم)

[54] چارلس ڈکنز۔ اسکا ذکر کتاب ہذا میں آچکا ہے۔ (مترجم)

[55] جان بنین (۱۶۲۸ء - ۱۶۸۸ء) انگریزی واعظ کی مشہور استعارہ نما تصنیف ہے (مترجم)

[56] دانیال ڈیفو (۱۶۶۱ء - ۱۷۳۱ء) کی مشہور تصنیف ہے جس میں ایک سیاح کا کسی غیر آباد جزیرے میں پہنچکر تنہائی میں رہنے تمام سامان زیست کو مہیا کرنے کا حال درج ہے (مترجم)

"ہیڈی" تھا۔ جسے میں نے جرمن زبان میں بھی پڑھا تھا۔ میں نے ان کتب کو مطالعہ اور کھیل کود کے درمیانی وقفوں میں پڑھا تھا۔ جس سے مجھے اور بھی گہری مسرت حاصل ہوتی تھی۔ میں نے ان کتابوں کو غائر نظر سے نہیں دیکھا۔ اور نہ ان کی تحلیل کی تھی۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ تصانیف اچھی تھیں یا بُری اور نہ میں نے کبھی طرزِ کلام، یا تصنیف کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا تھا۔ یہ کتب اپنے خزانے میرے آگے پیش کر دیتی تھیں۔ اور میں انہیں اسی طرح قبول کرتی تھیں۔ جس طرح انسان سُورج کی روشنی یا دوست کی محبت کو قبول کر لیتا ہے۔

میں "چھوٹی عورتوں" کو بمقابلہ دوسری کتب کے اس لئے زیادہ پسند کرتی تھی کہ اس کے ذریعے مجھے ان لڑکوں اور لڑکیوں کی ہمنشینی میسر آتی تھی۔ جو دیکھ اور سُن سکتی ہیں۔ چونکہ میری زندگی کئی طریق سے ایک محدود زندگی تھی۔ اس لئے مجھے اس کے سوائے چارہ نہ تھا کہ بیرونی دُنیا کے حالات معلوم کرنے کے لئے کتاب کے صفحات کو اُلٹ پلٹ کروں میں نے "حاجی کا سفر" پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ اسے ختم کیا۔ یہی حال "اخلاقی قصوں" کا تھا۔ میں نے لافونٹین کی کتاب کا پہلے تو انگریزی ترجمہ پڑھا تھا۔ اور بعد ازاں قدرے بیدلی کے ساتھ اس کا لطف اُٹھانا چاہا پھر اس کتاب کو فرانسیسی میں پڑھنے سے میں نے معلوم کیا کہ باوجود الفاظ کی روشن تصاویر اور مُصنّف کی عجیب و غریب قادر الکلامی کے میں نے اسے چنداں پسند نہیں کیا، مجھے اس کا سبب معلوم نہیں کہ وہ قصّے جن میں حیوانات سے انسانوں کی طرح بات چیت کرائی جاتی ہے۔ مجھے کیوں پسند نہیں آتے تھے۔ ان میں حیوانات کے مضحکہ انگیز سوانگ تو تمام توجہ کو کھینچے رکھتے ہیں۔ لیکن اخلاقی نتیجہ ذہن میں اُترنے نہیں پاتا۔ مزید براں لافونٹین شاذ و نادر ہی ہماری اعلیٰ اخلاقی قوت سے اپیل کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہماری قوائے عقلیہ اور خود پسندی کو متحرک کرتا ہے۔ اس کے تمام قصوں میں یہی خیال جاری و ساری رہتا ہے کہ انسانی فنا تمامتر خود پسندی کا نتیجہ ہے۔ اور اگر عقل کے ذریعہ سے خود پسندی کی رہنمائی اور روک تھام کیجائے تو اس کا نتیجہ راحتِ نفس ہوگا۔ جہانتک میں سمجھ سکتی ہوں خود پسندی تمام برائیوں کی جڑ ہے لیکن میرا یہ خیال غلط ہو سکتا ہے کیونکہ میرے مقابلے میں لافونٹون کو انسان شناسی کے زیادہ مواقع ملے ہونگے۔ میرا اعتراض ہجو آمیز اور درشت صفت قصّوں پر نہیں بلکہ اس امر پر ہے کہ حقائق ضروریہ بندروں اور لومڑوں کے ذریعے کیوں بتائے جائیں۔ مذکورہ کتب میں "جنگل کی کہانی" اور "وحشی حیوانات" مجھے بہت پسند ہیں مجھے ان حیوانات سے جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں۔ ایک خاص دلچسپی ہے۔ کیونکہ انسانی کارٹون (نقل)

ہونے کی بجائے وہ اصلی جانور ہیں۔ کتاب پڑھنے سے انسان کو ان کے باہمی میل و حرب سے ہمدردی اور ان کی خوشیوں سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہم ان کی مصائب سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی اخلاقی نتیجہ اخذ ہو سکے تو وہ اسقدر لطیف ہوتا ہے کہ بے خبری کے ساتھ دل میں اُتر جاتا ہے۔ قدامت کے تصور کی طرف میرا دل فطری طور پر مسرت کے ساتھ لپکتا تھا۔ مَیں یونانِ قدیم پر فریفتہ تھی۔ مَیں عالمِ خیال میں یونانی دیوتا اور دیویوں کو زمین پر چلتے پھرتے اور انسانوں کے ساتھ بات چیت کرتے دیکھتی تھی۔ اور مَیں اپنے دل ہی دل میں خفیہ طور پر ان دیوتاؤں کے مندر بناتی تھی جن سے مجھے اُنس تھا۔ بحری پریوں بہادروں اور نیم دیوتا جنس کی مخلوق کے ساتھ مجھے واقفیت اور محبت تھی۔ لیکن تمام کے ساتھ نہیں، کیونکہ میڈیا اور جیسن[۵۱] کی وحشت انگیز بے رحمی اور حرص میرے نزدیک ناقابلِ معافی تھی۔ اور مَیں حیران ہوتی تھی کہ دیوتاؤں نے انہیں بدکرداری کی کیوں اجازت دی۔ اور پھر اس پر انہیں سزا بھی نہیں دی گئی، یہ معمہ اب تک حل نہیں ہوا۔ مَیں اکثر اس خیال سے حیران ہوتی ہوں کہ جب خدا کی زمین پر گناہ کا اس قدر دور دورہ ہے۔ تو اس پر خدائے قدوس کیوں خاموشی اختیار کئے رکھتا ہے۔ مجھے الیٹیڈ[۵۲] کے ذریعے یونان واقعی ایک بہشت دکھائی دیتا ہے۔ مَیں ٹرائے[۵۳] کا اصل افسانہ پڑھنے سے پیشتر ہی اس سے آشنا ہو چکی تھی۔ قواعدِ زبان کی سرحد عبور کرنے کے بعد یونانی الفاظ سے عجائبات کے تمام خزانے کھلوانے کے لئے مجھے چنداں دقت پیش نہیں آئی۔

(باقی آیندہ)

خادم محی الدین

---

۵۱ ایک قدیم یونانی قصے میں جیسن شاہ پیلیس کا بھتیجا تھا، چچا نے اس کی سلطنت غصب کر لی۔ پیلیس نے جیسن کو کولچس کی مملکت سے ایک سنہری کھال لانے پر سلطنت واپس دینے کا وعدہ کیا۔ یہ سنہری کھال کولچس میں ایک درخت پر آویزاں تھی۔ اس کے نیچے ایک اژدھا اس کی حفاظت کرتا تھا۔ جیسن نے ایک جہاز آرگو نامی تیار کرایا۔ اور چند ہمراہی ساتھ لیکر بہت سے خطرات میں سے گزرا۔ اور کولچس پہنچا۔ سنہری کھال کا حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن بادشاہ کی لڑکی میڈیا نے جیسن کو ایسے داؤ اور منتر بتائے کہ اس نے یہ مہم سر کی۔ میڈیا سے شادی کر کے شادکام ہوا۔ اور اسے ملکہ بنا کر اپنے تخت پر بیٹھا۔ (مترجم)

۵۲ یونانی نابینا شاعر ہومر کی نظمِ رزمیہ کا نام ہے۔ اس نظم میں جس قصے کا ذکر ہے وہ "ٹرائے" کا محاصرہ ہے۔ جو اس وجہ سے ہوا تھا۔ کہ یونانی بادشاہ کی حسین بیوی کو جسے سپارٹا سے پیرس نامی ٹرائے کا شہزادہ اڑا لے گیا تھا، دوبارہ حاصل کیا جائے (مترجم)

۵۳ ایشیائے کوچک میں قدیم شہر جو یونانی روایات میں مشہور ہے۔ جسے اب بنارباشی کہتے ہیں (مترجم)

قواعد و مقاصد

انجمن اربابِ علم

(۱) انجمن کے مقاصد حسب ذیل ہونگے :۔

الف۔ ملک میں صحیح اُردو زبان کی ترویج ۔

ب۔ سررشتہ ہائے تعلیم کی مجوزہ اُردو کتابوں پر بحیثیت صحت زبان تنقید۔

ج۔ اردو اخبارات و رسائل کو جج کے طور پر زبان کی فروگزاشتوں پر توجہ دلانا۔

د۔ اُردو زبان میں مفید تصانیف شائع کرنا۔

ہ۔ ملک کے اُردو اخبارات و رسائل ، اور ہر قسم کی مفید تصانیف کے شمار و اعداد کی رپورٹ سالانہ شائع کرنا۔

و۔ سررشتہ ہائے تعلیم، یونیورسٹیوں اور گورنمنٹ کو اردو کی ترقی کے متعلق مفید مشورے پیش کرنا۔

ز۔ اُردو کے اچھے مصنّفین، شعرا اور حامیوں کی بلا امتیاز مذہب ممکن امداد کرنا۔

ح۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا اور ایک جامع اُردو لغات کی ترتیب کے لئے امکانی کوشش کرنا۔

ط۔ اُردو رسم الخط کو فروغ دینا۔

ی۔ اُردو شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) کو باضابطہ بنا کر رائج کرنا۔

ک۔ اُردو زبان کو ملک کی مشترکہ قومی زبان (لنگوا فرینکا) بنانے کی غرض سے اس کی نظم و نثر میں

ذیل کی تجاویز کو کامیاب بنانا۔

(۱) اُردو کی عام تحریروں سے عربی، فارسی اور سنسکرت وغیرہ کے ان الفاظ کا استعمال کم کرکے جو غیر مانوس اور ناخوشگوار ہیں۔ ہندی کے سادہ اور رسیلے الفاظ کے استعمال سے اسے عام فہم بنانا۔

(۲) اُردو شاعری میں بلینک ورس (بے قافیہ نظم) کو رواج دینا اور مقفّٰی نظموں میں ہمقافیگی کی غیر ضروری پابندیوں کو کم کرنا۔

(۳) اُردو شاعری میں دوسری زبانوں اور خاصکر ہندی کے خوش آیند اوزان کو رائج کرنا۔

(۴) اُردو شاعری میں مُلکی خیالات، تلمیحات اور تشبیہات کو رائج کرکے اسے اصلی معنی میں ملکی شاعری بنانا۔

(۵) اُردو نظم کو غیر مفید اور مخرب اخلاق خیالات سے پاک کرکے مُلک و قوم کے لئے مفید بنانا۔

(۶) اُردو شاعری میں ایسی نظموں کو رواج دینا جس میں شاعر نے محبوب مخاطبِ عورت کو قرار دیا ہو۔

(۷) مستقبل کی عام ہندوستانی زبان کے مطابق اُردو کی گرامر تیار کرنا۔

(۸) اُردو کی نو آموز شعرا۔ انشا پردازوں اور مصنّفین کی رہبری کرنا۔

ہمارے ہاں ہر قسم کے
(عکسی تصاویر کے)
ہاف ٹون بلاک
نہایت اعلیٰ پائیدار اور واجبی نرخوں پر تیار ہوتے ہیں ایک دفعہ آرڈر بھیجکر ہمارے کام کی آزمائش کریں
تجارتی نرخنامہ اور کام کے نمونے مفت طلب فرماویں
المشتہر
پکٹوریل انگریونگ کمپنی بیرون موری دروازہ لاہور

قواعد و ضوابط

۱۔ ہزار داستان کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی آخری تاریخ ہے۔

۲۔ ہزار داستان کا مقصد اولین افسانہ نویسی کا فروغ ہے لیکن علمی و ادبی مضامین بھی معیار پر پورے اتریں تو درج کئے جائینگے۔

۳۔ مذہبی مضامین اور خاصکر دلشکن مذہبی مضامین درج نہیں ہو سکتے۔

۴۔ جواب طلب خطوط کے ہمراہ ایک آنہ کا ٹکٹ ارسال کیا جائے۔

۵۔ کوئی ایسا اشتہار شائع نہ ہوگا جو خلاف تہذیب ہو۔ اشتہارات کے لئے خط و کتابت مینجر اشتہارات سے ہونی چاہئے

۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی تین روپے چار آنہ۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جاتا۔ اس کیلئے دس آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔

۷۔ ناپسندیدہ مضامین کا ہم ذمہ نہیں لیتے۔

۸۔ ہزار داستان کی ضخامت کم از کم ۸۰ صفحے ماہوار ہے۔

۹۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ نرخنامہ اشتہارات حسب ذیل ہے۔

پیمانہ صفحہ	ایک اشاعت	دو اشاعتیں	چھ اشاعتیں	بارہ اشاعتیں
پورا صفحہ	[illegible]	۱۲ روپے	۳۲ روپے	۶۰ روپے
نصف صفحہ	[illegible]	[illegible]	۱۸ روپے	۳۲ روپے
چوتھائی صفحہ	[illegible]	[illegible]	۱۰ روپے	۱۸ روپے

مینجر رسالہ ہزار داستان چیمبرلین روڈ۔ لاہور

انجمن ارباب علم پنجاب

کا

ماہوار رسالہ

ہزار داستان

مرتّبہ

سیّد عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی وکیل (مدیر اعزازی) - محمد ہادی حسین قریشی بی اے (آنرز) (مدیر)

زیر نگرانی

خان بہادر شیخ عبد القادر بی - اے بیرسٹر ایٹ لا - صدر انجمن

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ایم ایس سی ڈی ایس سی - - نائب صدر

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی رکن انجمن

بلیغ الملک علامہ تاجور نجیب آبادی سیکرٹری

دارالاشاعت ادب لطیف حسن لین . روڈ لاہور

نمبر شمار	فہرست اسمائے گرامی حضرات اراکین مجلس ادبا و مجلس انتظامیہ و مربیان	رقم چندہ
		عـــہ
۱	ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی سی آئی ای سرپرست	صہ
۲	خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا صدر مجلس انتظامیہ	صہ
۳	ڈاکٹر شانتی سروپ صاحب بھٹناگر ایم۔ایس۔سی	صہ/
۴	ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا۔ نائب صدر	صہ/
۵	راجہ نریندر ناتھ صاحب ایم اے ایم ایل سی بیرسٹرایٹ لا۔ صدر مجلس شعرا۔	عاہ/
۶	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی	عہ/
۷	خواجہ دل محمد صاحب ایم۔اے پروفیسر اسلامیہ کالج نائب صدر مجلس شعرا۔	عہ/
۸	لالہ کشوری موہن مترا ایم اے پروفیسر دیال سنگھ کالج نائب صدر مجلس ادبا۔	صہ/
۹	رائے صاحب لالہ رگھو ناتھ سہائے بی اے ہیڈماسٹر دیال سنگھ ہائی اسکول رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۰	لالہ گلبہار سنگھ ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج رکن مجلس انتظامیہ	عاہ/
۱۱	شیخ نیاز محمد صاحب ایم اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس ادبا۔	صہ/
۱۲	مرزا محمد سعید صاحب ایم اے آئی ای ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج موہن لعل روڈ لاہور صدر مجلس ادبا۔	صہ/
۱۳	سید محمد یحییٰ صاحب رئیس کوچہ گھیاں ڈبی بازار لاہور رکن مجلس انتظامیہ	ہے/
۱۴	سردار اودے سنگھ صاحب شائق بی۔اے ایل ایل بی وکیل فیروزپور رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۵	شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی فائنل سیکرٹری رکن مجلس انتظامیہ	عاہ/
۱۶	پنڈت میلا رام صاحب وفا ایڈیٹر اخبار بھیشم رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۷	شیخ سراج الدین صاحب آذر ایم اے ایم او ایل پروفیسر اسلامیہ کالج نصیر کاٹیج پرانی انارکلی لاہور رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۸	ابوالمعانی حضرت اختر شیرانی ایڈیٹر انتخاب رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۹	مولانا محمود شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۰	پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی	عہ/
۲۱	لالہ برج نرائن صاحب ایم اے پروفیسر سناتن دھرم کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۲	مسٹر محمد یوسف خاں سلیم بی۔اے پروفیسر کرسچین کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۳	شیخ عبدالحمید صاحب ولاوری بی۔اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۴	مولانا تاجور نجیب آبادی سیکرٹری	عہ/
۲۵	مولانا سید اولاد حسین صاحب شاداں لکھنوی پروفیسر اورینٹل کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۶	میاں بشیر احمد صاحب بی۔اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر ہمایوں رکن مجلس انتظامیہ	ہے/
۲۷	شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس انسپکٹر مدارس لاہور رکن مجلس ادبا۔	عاہ/
۲۸	مولانا غلام محی الدین خانصاحب بی اے ایل ایل بی وکیل لاہور	عہ
۲۹	رائے بہادر مسٹر بھگوتی پرشاد ورما سپرنٹنڈنگ انجینیر لائل پور سرپرست	صہ
۳۰	قاضی فضل حق صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج ممبر مجلس ادبا۔	عاہ
۳۱	مسٹر بھارت چندر ربانی اے ایل ایل بی وکیل ممبر مجلس ادبا۔	عہ

اندھی۔ بہری اور گونگی عورت کی

خود نوشتہ سوانحعمری

میری داستان حیات

مارچ ۲۶ء کے اخیر تک کتابی صورت میں طبع ہو جائیگی

امریکہ کے مشہور مصنف مارک ٹوین کا قول ہے۔ کہ انیسویں صدی کی سب سے دلچسپ ہستیاں دو ہیں ایک نپولین اور دوسری ہیلن کیلر۔ یہی ہیلن کیلر "میری داستان حیات" کی وہ کامیاب مصنفہ ہے۔

جس کی آنکھیں نہیں۔ مگر دیکھ سکتی ہے
جو کانوں سے بہری ہے۔ مگر سن سکتی ہے
جو گونگی ہے۔ مگر بول سکتی ہے

جناب شیخ خادم محی الدین صاحب بی۔اے بی ٹی نے مصنفہ کی خاص اجازت سے اس کی کتاب دی سٹوری آف مائی لائف کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اور جس کا کچھ حصہ "ہزار داستان" میں باقاعدہ شائع بھی ہوتا رہا ہے۔ اب مارچ کے اخیر تک مکمل کتاب کی صورت میں شائع ہو جائیگی۔ کتاب میں امریکہ کے مشہور مصنفوں اور ہیلن کیلر کی کئی ہاف ٹون تصویریں بھی ہونگی۔ اور سب سے زیادہ قابل دید وہ تصویر ہوگی جس پر مصنفہ نے اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھ کر بھیجا ہے۔

شائقین کو چاہئے کہ ابھی سے اپنا نام درج رجسٹر کرائیں تاکہ کتاب کے شائع ہوتے ہی وہ انہیں ارسال کر دیجائے۔

آرڈر بھیجنے کا پتہ:- **مینجر ہزار داستان چیمبرلین روڈ۔ لاہور**

ہزار داستان

جلد (۸) | فہرست مضامین بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر (۲)

فہرست تصاویر

محمد حسین آزاد

(مدت ہوئی لاہور میں ایک انجمن "ینگ مین محمڈن اسوسی ایشن" کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ جس کی فرمائش پر خان بہادر شیخ عبدالقادر نے ادب اردو کے اساتذۂ حال کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ تیار کیا تھا۔ اور یہ مضامین وقتاً فوقتاً انجمن مذکور کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ ذیل کے صفحات انہی میں سے ایک مضمون کا رواں ترجمہ ہیں) ہادی

مولانا محمد حسین آزاد جن کی ادبی کارگزاریوں سے میں آج کی تقریر میں بحث کرنا چاہتا ہوں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ غالباً پنجاب کا کوئی نوجوان، عام اس سے کہ وہ طالب علم ہو یا فارغ التحصیل ہو چکا ہو، ایسا نہ ہوگا جو ابتدائے عمر ہی سے آپ کے نام نامی سے واقف نہ چلا آیا ہو۔ ہم سب کی طالبعلمانہ زندگی کا وہ دور جس کی یاد ہمیں بیحد عزیز ہوتی ہے، محمد حسین آزاد اور اُن کی تصنیفات سے ایک ایسے مستحکم رشتے میں مربوط ہے جو کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ پنجاب کے باہر آپ کو ایسی عام شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ اور اگر کسی قدر شہرت حاصل ہوئی بھی ہے تو آپ کی وہ قدر و منزلت نہیں کی گئی جس کے آپ حقدار تھے۔ بہرحال پنجاب پر آپ کے حقوق کچھ اسی حیثیت سے نہیں کہ آپ ایک ایسے جلیل القدر انشا پرداز تھے۔ جن کی تحریروں نے ادبِ اُردو پر نہایت گہرا اثر کیا۔ بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ آپ کا نام ڈاکٹر لیٹنر۔ اور کرنل ہالرائڈ جیسے فضلائے اکمل کے پہلو بہ پہلو اشاعتِ تعلیم کے اُن سرگرم علمبرداروں کی فہرست میں ہے۔ جن کے احسان کا معاوضہ پنجاب کبھی نہ ادا کر سکیگا۔ اس کے علاوہ آپ ان معدودے چند بزرگوں میں تھے جو یوں تو اگلے وقتوں کے ماحول کے تربیت یافتہ اور پرانے خیالات کے لوگ تھے لیکن جب نئی تعلیم کا چرچا ہوا، تو اُن کی دوررس نگاہوں نے اُن مصالح کا جو اس کی تحصیل میں مضمر تھے۔ فوراً اندازہ کر لیا۔ اور انہوں نے جہاں تک ہو سکا۔ اس کی ترویج اشاعت میں مدد دی۔ خصوصاً لاہور پر آزاد کے حقوق بیحد و حساب ہیں۔ کیونکہ یہ وہ جگہ تھی، جسے آپ نے اپنا وطن مالوف بنایا۔ یہی آپ کی تعلیمی مصروفیتوں کا مرکزِ عمل تھا۔ اور اسی کی خوشگوار فضا میں آپ نے اپنی بہترین ادبی خدمات انجام دیں۔ ان وجوہ کی بنا پر محمڈن ینگ مین ایسوسی ایشن کے لئے یہ امر نہایت زیبا اور مستحسن ہے کہ اُس نے موصوف کے نام کو عہدِ جدید کے اُن اعاظم اُدبا

کی ذیل میں جن کے کارناموں کی نسبت مدّت ہوئی ایک سلسلۂ خطبات کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ شامل کر کے اُن کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام مولانا حالی کا تھا۔ اور اُن کے کارناموں سے بحث کرنے کی خدمت میرے ہی سپرد کی گئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ کہ ابکے جو موضوع میرے لئے تجویز کیا گیا ہے اُس میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ تنوع اور تفصیل کی گنجائش ہے۔ اور جو کچھ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مجھے اُس کے اعادے کی ضرورت نہ پیش آئیگی۔ کیونکہ ان دو مصنّفین کی ادبی زندگیاں ایک دوسری سے اساسی طور پر مختلف ہیں۔ مولانا حالی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اُن کا حقیقی جوہر کمال شاعری ہے۔ اور بحیثیت نثر نویس کے انہیں کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد سب سے پہلے ایک اعلےٰ درجے کے نثر نویس ہیں، اور اسکے بعد کچھ اور گو نظم میں بھی اُنکی بعض چیزیں ایسی ہیں جو تعریف کے قابل ہیں۔ تاہم ان کی بنا پر اُنہیں "اقلیم سخن کے تاجداروں" میں جگہ نہیں دیجا سکتی۔ جو اشتہار اس جلسے کے متعلق شائع کئے گئے ہیں اُن کے پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ سکرٹری صاحب نے مجھ سے مشورہ کئے بغیر آپ کو اس توقع باطل میں مبتلا کر دیا۔ ہے۔ کہ میں مولانا آزاد سے اولاً بحیثیت شاعر اور ثانیاً بحیثیت

نثر نویس کے بحث کرونگا۔ میں آغاز کلام سے پہلے ہی آپ کی خدمت میں عرض کر دوں کہ میرا ارادہ ہرگز ایسا نہیں ہے سیکرٹری صاحب نے صرف یہی نہیں کیا کہ مجھ پر آزاد کے دعوئ شاعری کا فیصلہ کرنے کی مزید ذمہ داری عاید کر دی ہے۔ جس کے قبول کرنے کا نہ مجھے پہلے خیال تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ اس پر طرّہ یہ کہ وہ لفظ "شاعر" کو لفظ "نثر نویس" سے زیادہ اہم سمجھنے کے عام مغالطے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اشتہار کی عبارت میں "شاعر" کو "نثر نویس" پر بعینہٖ اسی طرح تقدّم کا شرف بخشا ہے۔ جس طرح آجکل جلسوں میں قدرتی طور پر پہلے "لیڈیز" اور اس کے بعد "جنٹلمین" سے خطاب کیا جاتا ہے! بہر حال یاد رکھنا چاہئے کہ ہر مصنّف کی کوئی نہ کوئی امتیازی خوبیاں ہوتی ہیں۔ جو صرف اُسی کا حصّہ ہوتی ہیں۔ اور کوئی مصنّف جس وقت اپنی حدود سے باہر نکلکر دوسروں کی حدود میں مداخلت کرنا چاہتا ہے تو پھر اُس کی وہ حیثیت نہیں رہتی۔ اس لئے اگر کسی مصنّف کی نسبت یہ کہا جائے، کہ وہ ایک شعبۂ ادب میں کامیاب ہے، اور دوسرے میں نہیں، تو اس سے اس کی کسر شان نہیں ہوتی۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ ایک طرف جتنی زیادہ توجہ ہوگی اتنی ہی دوسری طرف کم ہوگی۔ مثال کے طور پر انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ ٹینی سن ہی کو لیجئے۔ نظم میں اُن کا کتنا بڑا رتبہ ہے! لیکن اُن کی نثر اعلےٰ درجے کی نثر کے

معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اسی طرح اُن کے بلند پایہ معصر
طامس کارلائل کی نسبت کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اگر شعر
کہنے کی کوشش کرتے بھی تو مشکل تھا کہ کوئی شاندار
کامیابی حاصل کر سکتے اور اسے اُن کی انتہائی معاملہ شناسی
کہئے کہ وہ اس طرف ملتفت ہی نہیں ہوئے۔ غرض میرا خیال
ہے کہ مولانا آزاد نثر کے مردِ میدان ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے
کہ اس میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ تاہم اس سے یہ لازم
نہیں آتا۔ کہ شاعری اُن کے حیطۂ قدرت سے خارج تھی
یہ محض اُن کے گرد و پیش کے حالات اور اتفاقاتِ وقت
کا نتیجہ تھا۔ کہ انہوں نے شعر گوئی کی بجائے نثر نگاری کو
پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ورنہ انہیں فطرت نے شاعر ہونے
کی صلاحیت بھی کچھ کم ودیعت نہ کی تھی۔ میرا عقیدہ ہے۔
کہ اگر وہ اپنے وقت سے ایک صدی پہلے پیدا ہوتے تو
اُردو کے شاعروں میں بھی اتنا ہی امتیاز حاصل کرتے، جتنا
انہوں نے نثر نگاروں میں کیا ہے۔ جن حالات میں اُن
کی پرورش ہوئی ہے۔ اُنکا تقاضا تو یہی تھا۔ کہ اُن کا رجحان
شاعری کی طرف ہوتا۔ اُن کی پیدائش دلّی میں ایسے وقت
ہوئی ہے جبکہ شعرائے متاخرین کا زمانہ تھا۔ جمہور کا مذاق
شاعری کی نشوونما کے لئے موافق تھا۔ اور ذوق و غالب کے
معرکوں کی گرم بازاری تھی ان حالات کے ماتحت ہر کس و ناکس
شاعری کا شوق لیکر پیدا ہوتا تھا۔ جیسے آئے دن کے
مشاعرے اور شعراء کی ہم نشینی کے موقعے اور بھی ترقی دیتے
تھے۔ پھر آزاد جن کے انداز و اطوار جوانی کے بعد بھی جیسا کہ ہمیں
اُنکے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن کی شاعرانہ فطرت کی غمازی
کرتے تھے۔ ان سے متاثر ہوتے بغیر کیونکر رہ سکتے تھے؟
لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اُردو کی شاعری اپنی پرانی
پابندیوں اور قدیم رواج کی زنگ آلود زنجیروں میں مقیّد
رہ کر جس معراج تک پہنچ سکتی تھی پہنچ چکی تھی۔ اس کے ساتھ
ہی وہ اُس قدامت پسندی اور اسلاف پرستی سے بھی
بخوبی واقف تھے۔ جو اُن کے اہل مُلک کی گھٹی میں پڑی
ہے۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ ان پابندیوں سے
آزاد ہو کر زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق کوئی نئی چیز
مُلک کے سامنے پیش کی گئی، تو اسے قبول عام حاصل ہونا
معلوم۔ علاوہ بریں قدیم اسلوبِ سخن کی وقعت اُن کے
دل میں اتنی کم نہ تھی۔ اور وہ اُن خصوصیات کی قدر شناسی
سے جنہیں مدتوں سے داخلِ محسنات سمجھا جاتا تھا۔ ایسے
عاری نہ تھے۔ کہ اُن کی طبیعت اس راہ سے انحراف کرنا
گوارا کرتی یا وہ اُن بیل بوٹوں کی جو اس کے کنارے
سالہا سال کی روئیدگی اور ہزاروں شاعروں کے خونِ جگر
سے پیدا ہوئے تھے۔ کاٹ چھانٹ پسند کرتے۔
دوسری طرف انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جہاں اشعار کے
انبار در انبار مجموعے بآسانی دستیاب ہو سکتے ہیں،

وہاں نثر کی کوئی ایسی کتاب ہاتھ لگنی مشکل ہے جو ادبی لحاظ سے کسی خوبی کی حامل ہو۔ اور اہلِ زبان کے روزمرّہ میں لکھی گئی ہو۔ یوں تو اکّا دکّا قصّے کہانی کی کتابیں تھیں۔ یا قرآن و حدیث اور طبّی کتابوں کے کچھ ترجمے موجود تھے۔ مگر اُنکی عبارت بھی یا تو ایسی ادق اور علمی و اصطلاحی تھی۔ کہ عام لوگوں کیلئے اس کا سمجھنا دشوار تھا یا ' ایسے طرز کی تھی۔ جو محاورۂ حال سے بالکل مختلف تھا۔ اور اس لئے اُن سے کسی عملی فایدے کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ اسوجہ سے آزاد نے ایک نئی راہ کی داغ بیل ڈالی۔ خوش قسمتی سے زمین زرخیز تھی، جو بیج اُنہوں نے اور اُن کے ہمخیال حاضرین نے بوئے، وہ پھل لائے۔ اور اُن کا نتیجہ وہ سرسبز و شاداب پیداوار ہے جو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اور جس کے پھلنے پھُولنے کی بشرطِ آبیاری آیندہ بھی امید ہے۔ یہ نئی راہ اختیار کرنے کے لئے اُنہیں اپنے طبعی رجحانات سے یقیناً بے اندازہ کشمکش کرنی پڑی ہوگی اور جس ایثار سے کام لے کر اُنہوں نے اپنے مذاق کے خلاف اپنی قوتوں کو صرف کیا۔ وہ بیحد قابلِ تعریف ہے مُلک و قوم کے فایدے کی خاطر اپنی طبیعت کے تقاضے اور شخصی رجحانات کو اس طرح پس پشت ڈال دینا یقیناً ایک ادبی شہادت ہے۔ اور مولانا آزاد جنھوں نے اپنی پسندِ طبع سے اعراض کرنے کے علاوہ ادبی مشاغل کے

مقابلے میں اپنی صحت کی بھی پروا نہ کی۔ حتٰے کہ اخیر عمر میں وہ اپنی جوانی کا ایک بگڑا ہُوا نقشہ ہوکر رہگئے۔ اور وں سے کہیں زیادہ اس عظیم الشان درجے کے مستحق ہیں۔ خیر موخرالذکر ایثار کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئیگا۔ سردست ہم اُن کی بعض تصانیف سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے بیحد افسوس ہے کہ بدقسمتی سے اس مُلک میں ہمیں اپنے مشاہیر کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے متعلق اتنا مواد نہیں مل سکتا کہ ہم اُن کی زندگی کے اُس ضروری حصّے کا جس میں اُن کے تمام اوصاف کی نشو و نما ہوتی ہے۔ بالتفصیل ذکر کر سکیں۔ اشخاص مذکور خود یہ کمی پُوری کر دیں۔ تو اور بات ہے۔ ورنہ ہمارے یہاں کی اکثر و بیشتر سوانحعمریاں تمہیدی واقعات سے یا تو بالکل معرّا ہوتی ہیں۔ یا اُن کی طرف فقط اجمالی اشارات پر قناعت کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کسی شخص سے اُس وقت روشناس کیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنی عملی زندگی شروع کر چکا ہو، بالفاظ دیگر ارتقا کا ایک ایسا حادثہ جو ظہور میں آ چکا ہے ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ اسباب و علل جن کے ماتحت وہ رونما ہوا، وہ موثرات جو اس شخص کی سیرت کی تشکیل میں بروئے کار آئے۔ اور وہ مدارجِ نشو و نما جن سے یکے بعد دیگرے گزر کر وہ اپنے منتہائے ترقی پر پہنچا۔ ہماری نظروں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔

مثلاً اگر مَیں کوشش کروں، تو آزاد مرحوم کی شبیہ آپ کے سامنے اس طرح پیش کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے، کسی قدر انبوہ ریش، میانہ قد بلکہ پست قد، سیدھے سادے کپڑے پہنے ہوئے، سر ایک پگڑی ہے، جو ایک ایسی جگہ پیدا ہونے کا پتہ دیتی ہے جہاں آجکل لوگ اسے بارِ دوش سمجھنے لگے ہیں، اور اور اس پر ہلکی پھلکی ٹوپیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ پان کھانا ہوا لاہور کی سڑکوں پر چلا جا رہا ہے۔ اور اگر مَیں ذرا زیادہ کوشش کروں، تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تصویر منہ سے بول اُٹھے، یعنی مرحوم کی وہ باتیں جن میں بذلہ سنجی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی لیکن شائستگی اور تہذیب کے ساتھ، اور جو روتوں کو ہنساتی تھیں لیکن کسی کی تضحیک نہ کرتی تھیں۔ اور کسی کے جذبات کو صدمہ نہ پہنچاتی تھیں، یا اُن کی وہ پُر مغز تقریریں جو اُس متانت اور سنجیدگی کے لہجے میں ادا ہوتی تھیں، جو ایک عالم کے شایانِ شان ہے۔ آپ کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ یا زیادہ سے زیادہ مَیں یہ کر سکتا ہوں کہ ایک قدم اور آگے بڑھاؤں، اور آپ کو اُن کے گوشۂ خلوت میں لیجاؤں۔ جہاں آپ اُنہیں نئی اور پُرانی کتابوں کے انباروں میں محصور، مطالعہ میں محو، یا قلم دانتوں میں دبائے فکرِ تحریر میں غرق دیکھ سکیں۔ لیکن اگر مَیں یہ چاہوں کہ اس نو عمر لڑکے کی صورت و سیرت کا نقشہ آپ کے پیش نظر کر دوں، جو بڑا ہو کر اس تصویر کا جس سے مَیں ابھی آپ کو روشناس کرا چکا ہوں، اصل بنا، اور جس کے ناصیۂ حال پر آیندہ شان نگاہوں کو خداداد جوہر طبع کے آثار نظر آتے ہوں گے یا اگر مَیں یہ کوشش کروں کہ وہ طفلانہ شوخیٔ طبع جو بعدہٗ اس ہر دلعزیز بذلہ گوئی اور دلخوش کن ظرافت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ مطالعہ کا ذوق و شوق جس کا نتیجہ تبحرِ علمی کی صورت میں رونما ہوا بیان کروں تو یہ ایک مشکل امر ہے بہر حال اگر تخیل کا رنگ و روغن کسی طرح اس تصویر کے خطّ و خال کو مکمل کر سکتا ہے۔ تو مَیں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھوں گا۔ بَیں بعض ایسی صورتوں میں کہ ناکافی معلومات کی وجہ سے کسی شخص کی زندگی کا خاکہ نامکمل رہ جاتا ہو، اپنی طرف سے اضافہ کر دینے کو جائز سمجھتا ہوں۔ کوَنٹ کوَیر جن کا شمار آجکل کے مشہور ماہرانِ طبیعی میں ہوتا ہے۔ اس طریقے پر عمل کرتے ہیں، اور اس میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ اگر اُنہیں کسی ایسے جانور کے، جو کسی منقطع النسل نوع سے تعلق رکھتا ہو، کوئی آثارِ باقیہ ہاتھ آجائیں، تو وہ اپنی قوتِ تخیل سے کام لے کر اُس کی ترکیب جسمانی کا مکمل نقشہ تیار کر سکتے ہیں۔ ان کے بعض اس قسم کے تخیلی نقشوں کا پُرانے وقتوں کے جانوروں سے، جن کا ذکر تاریخ اور قصّوں کی کتابوں میں آتا ہے۔

مقابلہ کر کے دیکھا گیا ہے، اور وہ ایک ایک جزئی تفصیل میں اُن سے مشابہ پائے گئے ہیں۔ اگر کونٹ کو وبیر کی سی قوّتِ مشاہدہ میسّر آجائے، تو یہ بتانا بالکل سہل ہوجاتے کہ کسی شخص کی شکل وصورت اپنی عمر کے کسی حصّے میں کیسی تھی بہرحال مجھے اس کا دعویٰ نہیں، اس لئے مَیں اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں، کہ محمد حسین آزاد نے اپنی نسبت جو اشارے کہیں کہیں اپنی تحریروں میں کئے ہیں، اُن کو پیش نظر رکھ کر ایک خاکہ تیار کر دوں اور اُس میں اپنی طرف سے رنگ بھر کر جہانتک ممکن ہو تصویر کی فروگزاشتیں پوری کر دوں۔

آزاد نے اپنے والد کا جا بجا تذکرہ کیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ استعداد اور بامذاق آدمی تھے۔ اور شیخ ابراہیم ذوق کے دوستوں اور مدّاحوں میں تھے۔ اپنے بیٹے کی ابتدائی تعلیم میں اُنہوں نے نہایت غور و پرداخت سے کام لیا۔ حتےٰ کہ جب تک اُس نے سخن فہمی کی قابلیّت نہیں پیدا کر لی کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہونے دیا۔ کہ مبادا شعر وسخن اُس کے لئے تفریح کا مشغلہ ہو کر رہ جائے۔ جب ذرا تعلیم میں ترقی ہوئی تو اپنے ہمراہ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں لے جانے لگے۔ یہ ایسی صحبتوں میں شریک ہونا اور اپنے وقت کے اُستادوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھنا سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ اور آزاد نے جو علمی ذوق اپنے والد کی توجّہ اور شفقت کی بدولت اوائل عمر ہی میں پیدا کر لیا تھا، جو فروغ بھی حاصل کرتا کم تھا۔

(باقی دارد)

شیخ عبد القادر

وجدانیات

موجہائے جلوۂ ایمن کہاں
اب وہ حسنِ زندگی دشمن کہاں

آہ وہ مہکے ہوئے پھولوں کے ہار
وصل و عشرت کی شب روشن کہاں

رحم شیون پر انہیں آتا مگر
دل حریفِ ذلّتِ شیون کہاں

مسکرا دیتے ہو اب شکووں پہ تم
اب وہ اندازِ خمِ گردن کہاں

ہائے وہ عہدِ محبت کی غزل
آہ وہ اندازِ آتش زن کہاں

اس گل خوبی سے تھی ساری بہار
اب فروغ نزہت گلشن کہاں

پی چکے صہبائے رنگیں پی چکے
کیفہائے چشم جادو فن کہاں

چشمِ پرنم کی بہاریں ہو چکیں
حسرتِ رنگینیِ دامن کہاں

دل کی تاریکی غریقِ نور ہو
ساقیا وہ بادۂ روشن کہاں

بجلیوں سے عشق ہے عابد مجھے
اب غمِ بربادی خرمن کہاں

عابد

پُرانی دِلّی کا آخری چراغ

(۱)

جنھوں نے ۱۸۸۰ء میں دہلی کا چاندنی چوک دیکھا ہے۔ اُنھوں نے سُبھاگی کا بھاڑ ضرور دیکھا ہوگا۔ آج وہ بھاڑ نظر نہیں آتا۔ نہ شام کے وقت اُس کا دُھواں ساحرانہ انداز سے آسمان کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ پوربی عورتوں کا جمگھٹا۔ وہ غریبوں کا ہجوم۔ وہ بچّوں کا شور و غل جس پر سے گوش نواز نغموں کی موہنی قربان کی جاسکتی ہے۔ یہ سب عہدِ ماضی کی بھولی ہوئی کہانی ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک عالیشان دُکان کھڑی ہے۔ جہاں امیروں کے تانگے اور موٹر آکر رُکتے ہیں۔ کبھی وہاں سبھاگی کا بھاڑ گرم ہوتا تھا۔ اور غریب لوگ آکر اناج بھنواتے تھے۔ سبھاگی بدشکل عورت تھی۔ عمر بھی چالیس سے کم نہ ہوگی۔ اُس کی آواز سے ڈر آتا تھا۔ رات کو کسی ویران جگہ میں دیکھ کر اُس پر چڑیل کا شبہ ہونا بالکل قدرتی تھا۔ مگر چاندنی چوک میں وہ ایسی شان کی زندگی بسر کرتی تھی جیسی راج محلوں میں رانیوں کو بھی نصیب نہ ہوگی۔ اُس کے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا۔ نہ مخملی اور اطلسی لباس تھے۔ بھاڑ جھونکنے سے اُسے بمشکل تمام اسی قدر یافت ہوتی تھی جس سے جسم و رُوح کا تعلق قائم رہ سکے۔ اس سے زیادہ کمائی اُس کے لئے ناممکن تھی۔ مگر اُس کے پاس ایک چیز ایسی تھی، جو نہ شاہی محلوں میں ہے، نہ خزانوں میں۔ اُس کے پاس دل کا اطمینان اور راحت کی نیند تھی۔ جسے نہ چور چرا سکتا تھا۔ نہ بادشاہ چھین سکتا تھا۔ وہ اُنیسویں صدی میں رہتے ہوئے چودھویں صدی کی زندگی بسر کرتی تھی جیسے کسی کے چاروں طرف آگ کے جانسوز شعلے بھڑک رہے ہوں۔ مگر وہ سرد و شیریں پانی کے چشمہ کے کنارے بیٹھا اس کی جان بخش و رُوح پرور لہروں سے کھیل رہا ہو۔ اور اسے اس امر کی کوئی پروا نہ ہو۔ کہ میرے چاروں طرف موت منڈلا رہی ہے۔ سمجھتا ہے۔ یہاں پانی ہے۔ اس پر آگ کے شعلوں کا اثر نہ ہوگا۔ ادھر کا رُخ کریں گے، تو آپ ہی سرد ہوجائینگے۔ میرا کیا بگاڑ لینگے۔ یہی حالت سبھاگی کی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کی چالیس بہاریں اسی بھاڑ اور اس سے متعلقہ جھونپڑے میں بسر کی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر اس کے تنِ مردہ میں جان آجاتی تھی۔ دہلی بدل گئی، چاندنی چوک بدل گیا۔ مکان بدل گئے، یہانتک کہ دہلی

کے رسم و رواج تک تبدیل ہو گئے۔ لیکن سبھاگی اور اُس کے بھاڑ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اگر قدرت کے قاعدے تبدیل ہو جاتے، اور زمین کی کچی مٹی کو اپنے نگلے ہوئے مُردے اُگلنے کی اجازت ہو جاتی، تو وہ پہچان نہ سکتے، کہ یہ وہی دِلّی ہے۔ مگر سبھاگی کے بھاڑ میں آ کر اُن کے پاؤں رُک جاتے اور وہ اپنی رُوح کی کامل قوت سے چلّا اٹھتے کہ یہ وُہی دِلّی ہے۔ سچ پوچھو تو یہ سبھاگی کا بھاڑ نہیں تھا نئی دِلّی کے مردہ جسم میں پرانی دِلّی کی رُوح روشن تھی۔ یہ جھونپڑا نہیں تھا۔ دلّی کی تاریک روشنی میں قدیم ہندوستان کا دیا جل رہا تھا۔ آج وہ سادگی کی رُوح، وہ قناعت کی جان کہاں ہے؟ وہ گئے گزرے زمانہ کی آخری یادگار کہاں چلی گئی۔ کس دیس کو؟ دِلّی کے بازار اس کا جواب نہیں دیتے پہلے مندر گیا تھا۔ اب دیا بھی نظر نہیں آتا۔

سبھاگی کا جھونپڑا امیرانہ فلک بوس عالیشان عمارتوں کے درمیان گھرا ہوا اس طرح کھڑا تھا جیسے غرور و تکبر کے درمیان حقیقی خوشی کھڑی مسکرا رہی ہو۔ اُسے کسی سے ڈاہ نہ تھا۔ بلند اٹاریوں کو دیکھ کر اُس کے دِل میں جلن نہ ہوتی تھی۔ اُس کے لئے وہ جھونپڑا اور وہ بھاڑ ہی سب کچھ تھا۔ تیس سال گزرے، جب اُس کا بھڑبھونجا اُسے بیاہ کر لایا تھا۔ جب سے وہ یہیں تھی۔ اُس نے عہد کیا تھا کہ یہاں سے مر کر ہی نکلوں گی۔ مرتے وقت اُس کے شوہر نے کہا تھا میں تجھے لینے آؤنگا۔ یہ بات سبھاگی کے دل میں بیٹھ گئی تھی عام عورتیں اس بات کو بے معنی اور لایعنی کہکر بھول جاتیں مگر سبھاگی پُرانے زمانے کی ناتعلیم یافتہ عورت تھی۔ وہ اپنے خاوند کے عہد کو کس طرح بھول جاتی۔ یہ اس کے سوامی کا بچن تھا۔ سوچتی تھی کون جانے، وہ کس وقت آجائے۔ اُس کی رُوح اس جھونپڑے کو۔ اس بھاڑ کو ڈھونڈیگی۔ میرا نام لے لے کر پکاریگی۔ پُرانے زمانے کا بھڑبھونجا نئی دِلّی میں گھبرا جائیگا۔ اگر یہ جھونپڑا ذرا بھی بدل گیا، تو وُہ پہچان نہ سکیگا۔ سمجھیگا سبھاگی نے بیوفائی کی۔ محبت کا دِیا ہوا کے جھونکوں سے بُجھ گیا۔ اور یہ وہ خیال، وہ جذبہ تھا جس کے لئے سبھاگی عورت ہو کر تمام جہان کی مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔ جسم بدصورت تھا۔ مگر اس کے اندر دھڑکنے والا دل کیسا خوبصورت تھا۔ لوہے کی کان میں سونے کا ڈلا چھپا تھا۔ مگر زمانے کی کم نگاہی نے اُسے شناخت نہ کیا۔

(۲)

اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ اور بدل جانیوالی دُنیا میں نہ بدلنے والی سبھاگی اُسی طرح اپنے پردیسی پیا کا رستہ دیکھتی رہی۔ مگر اُسے اس کی سُدھ نہ آئی۔ یہانتک کہ چاندنی چوک کے متمول تاجروں کی ہوسناک نگاہیں سبھاگی کے جھونپڑے کی طرف اٹھنے لگیں۔ ایسے اشتیاق

سے کوئی عاشق جانباز اپنے طرحدار محبوب کی طرف بھی نہ تاکتا ہوگا۔ سوچتے تھے کیسی عمدہ جگہ ہے۔ یہاں دکان بنے تو سینکڑوں روپیہ کرایہ آئے۔ کئی امیروں نے کوشش کی۔ تھیلیاں لیکر سبھاگی کے پاس پہنچے۔ مگر سبھاگی نے بے نیازی کی شان سے اُن کی طرف دیکھا۔ اور کہا "یہ جھونپڑا نہ بیچونگی یہاں میرا سوامی بیٹھا گیا ہے۔ مجھے لینے آئیگا۔ تو کہاں ڈھونڈیگا۔ یہ جھونپڑا نہیں تیرتھ راج ہے۔ اسے بیچدوں تو میرا بھلا کس جگ میں ہوگا۔"

ایک تاجر نے کہا "سبھاگی! وہ اب واپس نہ آئیگا انہونی بات بھی کبھی ہوئی ہے۔ تو یہ آس چھوڑ دے۔"

سبھاگی نے جواب دیا "پر اُسکا بچن کیسے جھوٹا ہو جائیگا۔ وہ لفظ میرے کانوں میں ابتک گونج رہے ہیں۔"

ایک اور ظاہردار نے کہا "اس عمر میں اتنی محنت کیوں کرتی ہے۔ جھونپڑا بیچ دے اور بھگوان کا بھجن کر۔"

سبھاگی نے جواب دیا۔ "یہ جھونپڑا گیا۔ تو بھجن کی سدھ بھی جاتی رہیگی۔ جس نے پیا کو بھلا دیا۔ وہ بھگوان کو خاک یاد رکھے گی۔"

ایک مُنہ پھٹ نے کہا۔ "تو سٹھیا گئی ہے۔ روپے لے، اور چین کی بنسری بجا۔ ساری عمر بھاڑ جھونک جھونک کر طبیعت سیر نہیں ہوئی کیا؟"

سبھاگی بولی۔ "یہ تو جنم کا کام ہے۔ مرنے پر ہی چھٹے گا۔ چار دن کے آرام کی خاطر اپنا گھر کس طرح بیچدوں۔"

"مگر اس گھر میں ہے کیا؟"

"مرنے والے کی یادگار ہے۔"

"تو تو باولی ہوگئی ہے۔"

"بھگوان اسی طرح اٹھالے۔ یہی پرارتھنا ہے۔ تم اپنے روپے اپنے پاس ہی رہنے دو۔ میرے لئے یہ بھاڑ ہی سب کچھ ہے۔"

"ہم تمہیں اور مکان دے دینگے۔"

"پرائی چیز اپنی کیسے بن جائیگی۔"

"اُس میں ہر طرح کا آرام ہوگا۔ یہ مکان تو کسی کام کا نہیں۔"

"اپنا بچہ بدصورت بھی ہو۔ تب بھی پیارا ہی لگتا ہے۔"

اسی طرح ترغیب نے بیسیوں حملے کئے۔ مگر قناعت کے سامنے کوئی پیش نہ گئی۔ جس طرح پانی کی لہریں چٹان سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔

(۳)

یہ جدوجہد کئی سال جاری رہی۔ جو کم حوصلہ تھے اُنہوں نے سمجھ لیا کہ بڑھیا بھاڑ نہ دیگی۔ مگر سیٹھ جانکی داس نے ہمت نہ ہاری۔ اُن کی دو دکانیں تھیں۔ اور یہ بھاڑ ان دونوں کے درمیان تھا۔ اردگرد فانوس جلتے تھے۔ درمیان

میں مٹی کا دیا ٹمٹماتا تھا۔ یہ دیا سبھاگی کے لئے زندگی کا سہارا
تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کی رُوح پر مسرت کا نشہ چھا جاتا تھا
مگر جانکی داس اُسے دیکھتے تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آتا
سوچتے یہ جگہ مل جائے، تو دکان کی شان نکل آئے۔
ہزاروں جوان مرتے ہیں، اس بڑھیا کو موت بھی نہیں
آتی۔ مگر بڑھیا سے ملتے، تو نہایت مروت سے پیش آتے
اور حلیمی سے بات چیت کرتے۔ سبھاگی سمجھتی تھی کہ سیٹھ
صاحب جیسا خیر خواہ آدمی ساری دلّی میں نہ ہوگا۔ تلوار پر
مخمل کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ سبھاگی درختوں کے روکھے سوکھے
پتّے اور ٹوٹی پھوٹی ٹہنیاں چُننے گئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔
چاروں طرف سُورج کی کرنیں ناچتی تھیں۔ سبھاگی نہایت
آرام و اطمینان سے پتّے اکٹھے کر رہی تھی۔ کہ یکایک آسمان
پر گھٹا چھا گئی۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سبھاگی نے
جمع کئے ہُوئے پتّے کپڑے میں باندھے اور شہر کی طرف
روانہ ہُوئی۔ لیکن تین میل کا فاصلہ طے کرنا آسان نہ تھا۔
بارش نے بڑھیا کو آلیا۔ مینہ برسنے لگا۔ مگر یہ مینہ نہ تھا۔
سبھاگی کی بدنصیبی تھی۔ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی
اور سوچنے لگی شام کو کیا کرونگی۔ یہ پتے بھی بھیگ گئے۔
تو بھاڑ کیسے گرم ہوگا۔ اور بھاڑ نہ گرم ہوا تو کھاؤں گی کیا۔
ہاتھ اٹھا اٹھا کر پرارتھنا کی کہ ذرا بارش تھم جائے، تو گھر
پُہنچ جاؤں۔ مگر بادلوں نے سبھاگی کی نہ سُنی۔ وُہ آسمان کے
رہنے والے تھے۔ اُنہیں زمین والوں سے کیا غرض تھی۔
جل تھل ایک ہوگیا۔ اُس دن کی بارش، بارش نہ تھی۔ قہرالٰہی
تھا۔ آٹھ گھنٹے وہ پانی برسا کہ چاروں طرف شور مچ گیا۔
جمنا میں باڑھ آگئی۔ ہزاروں غریبوں کے مکان گر گئے۔
گائے بیل اس طرح بہے جاتے تھے جیسے گھاس پھوس
کے تنکے ہوں۔ اُن کو بچانے والا کوئی نہ تھا۔ اور یہ پانی
باہر ہی تک محدود نہ تھا۔ شہر کے گلی کوچوں میں بھی لہراتا
پھرتا تھا۔ جن کے مکان پکّے تھے وہ قدرت کے اِس
تماشے پر ہنستے تھے۔ غریب لوگ روتے تھے اور پانی
کہتا تھا آج برس کے پھر نہ برسوں گا۔

بُڑھی سبھاگی ایک درخت پر بیٹھی چاروں طرف
دیکھتی تھی۔ اور حسرت کے ٹھنڈے سانس بھرتی تھی۔ اُس
کے ارد گرد پانی ہی پانی تھا۔ کوئی آدمی آدمزاد دُور تک
دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور اُس کے جمع کئے ہوئے پتّے کسی
بدنصیب کے خوابوں کی طرح پانی میں منتشر ہو کر پتہ نہیں
کہاں چلے گئے تھے۔ کس مقام کو؟ مگر سبھاگی کو اس کی
پروا نہ تھی۔ اُس کے دل میں ایک ہی خواہش تھی۔ ایک ہی
آرزو کہ کسی طرح اپنے بھاڑ پر پُہنچ جاؤں۔ پتہ نہیں اُس
کا کیا حال ہوگیا۔ پانی تلے غرق ہوچکا ہوگا۔ مٹی کا ایک
تودہ رہ گیا ہوگا۔ اگر اُس کے بس کی بات ہوتی۔ تو وہ اسی وقت

وہاں پہنچ جاتی۔ مگر پانی راستہ روکے کھڑا تھا۔ اُس وقت سبھاگی نے ایک فاختہ کو دیکھا۔ جو اُس درخت کی ایک ڈالی پر بیٹھی تھی اُس نے سوچا۔ کہ اگر میں فاختہ ہوتی تو اُڑ کر گھر چلی جاتی اور پانی میرا کیا بگاڑ لیتا۔ اتنے میں فاختہ نے پر کھولے۔ اور تھوڑی دیر میں نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ یہ دیکھ کر سبھاگی نے سوچا۔ پتہ نہیں یہ فاختہ کہاں گئی ہے۔ کس طرف، کس دیس کو؟ شاید میرے بھاڑ کی طرف ہی گئی ہو۔ اُس نے چاہا کہ میں بھی بھاگ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ مگر جھک کے نیچے دیکھا تو آدھا درخت ابھی تک پانی میں ڈوبا تھا اور سڑک دکھائی نہ دیتی تھی۔ سبھاگی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو گرم قطرے گرے۔ اور بارش کے سرد پانی میں مل ہو گئے

دوسرے دن سبھاگی درخت سے اُتری اور شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ پانی خشک ہو چکا تھا۔ مگر اُس کے نشان ابھی تک باقی تھے۔ سبھاگی کا بدن سردی سے اکڑا جاتا تھا۔ آنکھوں سے آگ سی نکلتی معلوم ہوتی تھی۔ پاؤں میں سکت نہ تھی۔ مگر وہ پھر بھی چل رہی تھی۔ جیسے شام کو چراگاہ سے گائے بچھڑے کی طرف بھاگتی ہے۔ وہاں لختِ جگر کے پیار کی کشش ہوتی ہے یہاں گھر کی کشش تھی مٹی میں بھی جادو ہے۔ مگر اسے دیکھنے کے لئے چشمِ حقیقت بین کی ضرورت ہے۔ خالی آنکھ سے وہ نظر نہیں آتا۔

سبھاگی چاندنی چوک میں پہنچی۔ تو اُس کا دل بیٹھ گیا۔ نہ وہ جھونپڑا باقی تھا نہ بھاڑ۔ اُن کے بجائے مٹی کا تودہ اور گھاس پھوس کا انبار پڑا تھا سبھاگی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ شام کو لوگوں نے دیکھا۔ تو وہ جھونپڑا کھڑا کر رہی تھی۔ اور دوسرے دن بھاڑ بھی تیار ہو گیا۔ سبھاگی پھولی نہ سماتی تھی۔ اُس کے پاؤں زمین پر نہ لگتے تھے۔ اکڑ اکڑ کر چلتی تھی۔ اُس نے اپنا اُجڑا ہوا گھر بسا لیا تھا۔ جس میں اُس کا شوہر اُسے بیاہ کر لایا تھا۔

(۴)

بھاڑ بن گیا۔ مگر گرم ہونا اُس کی قسمت میں نہ تھا سبھاگی بیمار ہو گئی۔ بخار آنے لگا۔ سیٹھ جانکی داس نے کہا۔ "سبھاگی۔ یہ تجھے کیا ہو گیا؟

سبھاگی۔ "برکھا کی رات کی سردی کھا گئی"۔

جانکی داس۔ اور پھر دوسری رات بھی تو تُو آرام سے بیٹھی جھونپڑا نہ تیار ہوتا تو کونسی تباہی آجاتی۔

سبھاگی نے حیران ہو کر سیٹھ صاحب کی طرف دیکھا۔ اور درد سے کراہ کر کہا۔ سر چھپانے کو جگہ بھی تو نہ تھی۔

جانکی داس۔ "تو میرے ہاں چلی آتی۔ تو کیا ہرج تھا۔ ہم تمہارے پڑوسی ہیں کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں"۔

سبھاگی۔ "یہ تو تم سے آشا ہی ہے"۔

جانکی داس۔ سبھاگی! تم بناوٹ سے کام لیتی ہو۔ میری مانو تو اب بھی میرے مکان میں اُٹھ چلو۔ وہاں تمہاری ہر طرح سے خبر گیری ہوگی۔ کیوں کیا ارادہ ہے؟

سبھاگی کے دل میں پہلے تو خیال آیا۔ کہ چلی جاؤں میرے بُڑھاپے میں چار دن آرام کے گزر جائینگے۔ مگر پھر جھونپڑے کی محبت نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ ساتھ ہی خاوند کے آخری لفظ یاد آ گئے۔ آہ سرد بھر کر بولی "سیٹھ جی اس جھونپڑے سے مَیں نہ نکلوں گی۔ میرا جنازہ نکلے گا۔"

جانکی داس۔ "اچھا تو یہ کہو مرنے کی ٹھانی ہے۔

سبھاگی۔ اگر موت ہی بھاگ میں لکھی ہے تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ پر یہ جھونپڑا تو نہ چھٹے گا۔

جانکی داس نے چند منٹ تک سکوت کیا۔ اور اس کے بعد یکایک اُن کے دل میں کوئی خوشگوار خیال آ گیا جیسے بعض وقت تاریکی یاس میں شعاع امید نظر آجاتی ہے آہستہ سے بولے۔ بہت بہتر! مگر مجھے اتنی اجازت دو کہ تمہارے دوا دارو اور کھانے پینے کا انتظام کر دوں نہیں مجھے تم سے ہمیشہ کے لئے گلہ رہیگا۔"

سبھاگی سادہ لوح عورت تھی۔ اُس نے نئے زمانہ کے چھل نہ دیکھے تھے۔ وہ اس عہد کی عورت تھی۔ جب زبان دل کی ترجمانی کرتی تھی۔ سیٹھ صاحب کی شیریں بیانیوں نے اُس کا دل موہ لیا۔ اُس نے سطح آب پر کھلے ہوئے کنول کے پھول دیکھے۔ مگر اُن کے نیچے جو ناگ تھا اُس کی طرف اُس کا دھیان نہ گیا۔ اُس نے جذبہ شکر گزاری سے تھرتھراتی ہوئی آواز سے کہا۔ "نارائن تمہارا بھلا کرے۔ مَیں اس کا بدلہ نہ دے سکونگی۔"

سیٹھ جانکی داس نے ایسی جانکاہی اور کوشش سے علاج کیا کہ کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ کرتا ہوگا۔ رات کو دو دو مرتبہ اُٹھ کر پرسش حال کے لئے آتے۔ اور روپیہ پیسہ تو پانی کی طرح بہا دیا۔ اُنہیں اس کی پروا نہ تھی۔ اُن کا خیال تھا، بڑھیا کسی طرح صحتیاب ہو جائے، تو بھاڑ کی جگہ ملنا چنداں دشوار نہ ہوگا۔ اور ہُوا بھی یہی۔ چھ ماہ کے بعد سبھاگی تندرست ہوئی تو اُس کا بال بال سیٹھ صاحب کا مقروض تھا اُن کا روپیہ اُس کے جھونپڑے کو نہ خرید سکتا تھا احسان نے خود اُسے بھی خرید لیا۔ اب سبھاگی پہلی سبھاگی نہ تھی۔ کبھی وہ سیٹھ جانکی داس کے آگے سے اکڑ کر نکل جاتی تھی۔ مگر آج اُن کے سامنے اُس کی آنکھیں نہ اُٹھتی تھیں۔ کیونکہ اب اُن میں مروّت آ بیٹھی تھی۔ جس کام کو سختی نہ کر سکی تھی اُسے نرمی نے کر دیا۔ سبھاگی سیٹھ جانکی داس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ اور رونے لگی۔ لیکن سیٹھ صاحب نے اُسے اس طرح عزت سے اُٹھا لیا۔ گویا وہ اُن کی اپنی ماں تھی۔

چند دن کے بعد چاندنی چوک کے تاجروں نے حیرت کے ساتھ سُنا۔ کہ سبھاگی نے اپنا جھونپڑا سیٹھ جانکی داس

کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ یہ خبر معمولی نہ تھی۔ لوگ فرطِ تعجب سے چونک پڑے۔ اُن کو اس خبر پر یقین نہ آتا تھا۔ ستانت سے سر ہلا کر کہتے تھے۔ یہ بھی سیٹھ صاحب کی چال ہے۔ بڑھیا جیتے جی جھونپڑا نہ چھوڑیگی۔ بعضے کہتے تھے سیٹھ صاحب نے سیوا کی تھی، میوہ پالیا۔ بعض کہتے تھے، یہ خبر سرے سے ہے ہی غلط۔ لیکن جب جھونپڑا اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ اور کھدائی کا کام شروع ہوگیا، تو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ سیٹھ صاحب بازی لے گئے۔

(۵)

سبھاگی سادہ لوح ضرور تھی۔ لیکن بیوقوف نہ تھی سیٹھ جانکی داس کی سرگرمیوں کے معنے سمجھنے میں اُسے دیر نہ لگی۔ اُس نے ساری عمر کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا تھا۔ نہ کسی کا بارِ احسان اُٹھایا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی کمائی کھانے کی خوگر تھی۔ اُس نے آجتک کسی کے سامنے آنکھیں نہ جھکائی تھیں۔ خود غریب تھی لیکن اُس کی آن امیروں سے بڑھ کر تھی۔ اس بیماری نے اُس کا یہ اثاثہ لُٹا دیا۔ اُس کی جان بچ گئی، مگر غیرت جاتی رہی سبھاگی اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہُوئی۔ اب چاندنی چوک میں وہ متانت کی چال چلنا اُس کے لئے دشوار ہوگیا۔ اُس کا دل کہتا تھا۔ اس داغ سیاہ نے کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ کندھے احسان کے بار تلے دبے جاتے تھے۔ چند دن تذبذب میں گُزرے۔ لیکن ہر شام کو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اُس کے دل کا اندھیرا۔ سینہ کا بار زیادہ ہوگیا ہے۔ جیسے مقروض کا قرض روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ذہنی اذیت برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن ہوگیا۔ ایک دن سیٹھ صاحب کے سامنے جاکر بولی۔ سیٹھ صاحب تم نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔ میرا بال بال تمہیں آشیرباد دے رہا ہے۔ مجھ میں یہ قرض اُتارنے کی ہمت نہیں۔ ایک غریب مجورنی کیا کرسکے گی۔ پر پھر بھی مجھے معلوم تو ہو۔ کہ میری بیماری پر کتنا خرچ ہوگیا۔"

سیٹھ صاحب کا کلیجہ دھڑکنے لگا جس وقت کا انتظار تھا وہ آپہنچا تھا۔ اُنہوں نے بہی کھولکر حساب کیا۔ اور اپنے دل کی دھڑکن کو دبا کر کہا۔

"ساڑھے چار سو"

"ساڑھے چار سو؟" سبھاگی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہوگیا۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے ساری دُنیا گھوم رہی ہے۔ چند لحہ تک وہ چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی۔ اور اس کے بعد آہ سرد بھر کر بولی۔ " یہ قرض کیسے اُترے گا؟"

جب ہمیں کوئی سخت بات کہنا ہوتا ہے تو ہم زبان کے حلیم بن جاتے ہیں۔ سیٹھ صاحب نے بھی

نہایت شیریں لہجہ میں جواب دیا۔"جھونپڑا بیچ دو۔ قرض اتر جائیگا۔"

سبھاگی کی آنکھوں میں مروت تھی۔ یہ سنگدلانہ تجویز سُن کر وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اُس کے جانے پر خالی جگہ دیکھ کر غُصّہ نے اپنا عمل دخل بٹھا لیا۔ جیسے خالی مکان میں بھوت آبستے ہیں۔ سبھاگی نے شرربار نگاہوں سے سیٹھ صاحب کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔" زبان سنبھال کے بول جھونپڑے کی طرف نگاہ بھی اُٹھائی، تو آنکھیں نکال لونگی۔"

سیٹھ صاحب ہنسے، اس ہنسی میں بے رحمی و سفاکی کے وہ عنصر شامل تھے جو قصابوں کے دلوں میں بھی نہ ہونگے۔ گویا سیٹھ صاحب نے زبان حال سے کہا "جو کچھ کہنا ہے کہہ لو۔ پر اب تمہارا جھونپڑا تو گیا۔"

تھوڑی دیر بعد بولے۔" تو سبھاگی! میرا روپیہ لوٹا دو۔ میں تمہارا جھونپڑا نہیں لینا چاہتا۔"

سبھاگی نے غرور سے گردن بلند کی۔ جیسے کسی نے ناگن کو چھیڑ دیا ہو۔ اور غُصّہ سے پھنکارتے مارتی ہوئی بولی۔" اگر کسی بھڑبھونجے کی بیٹی ہوں تو تمہاری کوڑی کوڑی ادا کر دونگی۔ پر یہ جھونپڑا تمہارے ہاتھ نہ بیچوں گی۔"

جانکی داس۔" بہت اچھا۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ کون تمہیں تھیلیاں کھول دیتا ہے۔"

سبھاگی۔" میرا بھگوان مر تو نہیں گیا۔"

جانکی داس۔" بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگر تمہارا جھونپڑا بچ جائے، تو مجھے کچھ کم خوشی نہ ہوگی۔ مجھے تو اپنا روپیہ چاہیئے۔"

سبھاگی۔" مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارے دل میں کپٹ بھرا ہے۔"

جانکی داس۔" کلجگ کا زمانہ ہے۔ اب نیکی کرنا بھی پاپ ہو گیا۔"

سبھاگی۔" پر تم سے نیکی کرنے کو کہا کس نے تھا؟"

جانکی داس۔" مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آیندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ ابکے بخش دو۔"

سبھاگی۔" میں سمجھی تھی تُو نیک آدمی ہے۔ پر آج آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔"

جانکی داس۔" چلو یہی غنیمت ہے۔"

سبھاگی۔" پر تمہیں جھونپڑا نہ ملے گا۔ سوچتے ہوگے دونوں دُکانیں ملا کر محل بنا لونگا۔ اس سے مُنہ دھو رکھو۔"

اب جانکی داس کو بھی غُصّہ آگیا۔ ذرا ترش ہو کر بولے۔" دیکھتا ہوں کون مائی کا لال مجھے روک جاتا ہے ایک ماہ کے اندر اندر اس جھونپڑے کا نام و نشان تک باقی نہ رہیگا۔"

غریب کی زبان بہت چلتی ہے۔ سبھاگی نے جو کچھ جی میں آیا کہا۔ اور اپنے جھونپڑے میں جا کر رونے لگی کبھی اپنے بھاڑ کو دیکھتی کبھی جھونپڑے کی کچی دیوار کو' اور زار زار روتی۔ جیسے لڑکی سسرال کو جاتے وقت ماں باپ سے ملکر

روتی ہے۔اُس وقت اُس کے دل میں کتنا رنج ہوتا ہے سینہ پر کیسا بار۔اُسے دُنیا کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ یہی حالت سبھاگی کی تھی۔ اپنے جھونپڑے کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر اُس کے دل میں بھالے چُبھ رہے تھے۔اسی طرح تین چار دن گزر گئے۔

چوتھے دن ایک آدمی شمبھو ناتھ نے آکر کہا۔سبھاگی! اب تیری طبیعت کیسی ہے؟

سبھاگی۔" بھگوان کا شکر ہے۔"

شمبھو ناتھ۔" سُنا ہے سیٹھ جانکی داس نے تیرے لئے بہت خرچ کیا ہے۔

سبھاگی۔" بھیّا! اُس پاپی کا میرے سامنے نام نہ لو۔"

شمبھو ناتھ۔" شہر میں تو بڑا جس ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں اُس نے سبھاگی کو بچالیا ہے۔ آدمی کا ہے کو ہے دیوتا ہے۔"

سبھاگی۔" میرا بس چلے تو منہ جھلس دوں۔"

شمبھو ناتھ۔" اصلی بات کیا ہے؟"

سبھاگی۔" ایسا کمینہ آدمی ساری دلّی میں نہ ہوگا۔ چار پیسے خرچ کر کے کہتا ہے۔ساڑھے چار سو اٹھ گئے۔ مَیں نے سوچا ساری عمر خدمت کرتی رہونگی۔ پر اس کی آنکھیں تو اس جھونپڑے پر ہیں۔ اب کہتا ہے یا روپیہ واپس کر دو یا جھونپڑا بیچ دو۔ کیسا اندھیر ہے۔

شمبھو ناتھ۔" یہ سب کلجگ کا اثر ہے۔"

سبھاگی۔" پر بھیّا۔ تم سے سچ کہتی ہوں۔ یہ جھونپڑا اُسے تو نہ دُونگی۔"

شمبھو ناتھ نے ذرا ہمدردانہ لہجہ میں پُوچھا۔مگر کیا کروگی۔ نالش کر دیگا۔"

سبھاگی لاجواب ہوگئی۔ اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جو بیکسوں کا آخری سہارا ہے۔ یکایک اُس نے سر اُٹھایا اور رازداری کے لہجہ میں آہستہ سے بولی۔ تم ہی نہ خرید لو۔ مَیں تمہارے ہاتھ آج ہی بیچ دیتی ہوں۔"

شمبھو ناتھ" سبھاگی! تم نے خوب سوچا۔"

سبھاگی۔" دانت کھٹّے ہو جائینگے۔ منہ دیکھتا رہ جائیگا

اس کے بعد خرید و فروخت کی بات چیت ہونے لگی۔ بہار مرلے زمین تھی۔ دو سو روپیہ مرلہ پر معاملہ طے ہوگیا۔"

سبھاگی کے سینہ سے بوجھ ہٹ گیا۔مگر پھر طبیعت پر افسردگی طاری ہوگئی۔ جیسے کوئی بیوپاری اپنے سودے میں کامیاب ہو کر پھر کسی فکر میں محو ہو جاتا ہے۔ اور اس فکر میں اُس کی خوشی جگنو کی چمک کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ رات انہی تفکرات میں گزر گئی۔ دوسرے دن وہ کچہری میں تھی۔ اور کچہری کا آدمی اُس سے کہہ رہا تھا

"بڑھیا! یہاں انگوٹھا لگا دے۔"

(۶)

سبھاگی نے یہ لفظ سُنے۔ مگر ٹھیک ایسے جیسے کوئی

خواب میں دُور کی آواز سُنتا ہے۔ اور اُس کا مطلب کچھ سمجھتا
ہے کچھ نہیں سمجھتا۔ اُس نے بے خبری کے عالم میں انگوٹھا
آگے کر دیا۔ عدالت کے آدمی نے اُس پر سیاہی لگا دی۔ اور
اُسے پکڑ کر اُس کا نشان کاغذ پر لگا دیا۔ اُس کو کیا معلوم تھا۔
کہ یہ سیاہی مَیں نے کاغذ پر نہیں پھیری۔ اپنے مستقبل کی
خوشی پر پھیر دی ہے۔ اتنے میں شمبھو ناتھ نے آٹھ سو روپے
گن کر اُس کی جھولی میں ڈال دئے۔ سبھاگی کی آنکھیں روشن
ہوگئیں۔ مگر یہ روشنی چراغ کی لو تھی۔ جو بجھنے سے پہلے ایک
دفعہ ہنستی ہے۔ اور اس کے بعد اتھاہ تاریکی میں غائب ہو
جاتی ہے۔ عدالت سے باہر آکر سبھاگی کو صورت حال کا صحیح
احساس ہوا۔ اتنے روپے اگر اُسے پہلے مل جاتے، تو اپنے
جھونپڑے میں جاکر شاید سو دفعہ گنتی۔ اور پھر زمین میں دبا
دیتی۔ لیکن اب کہاں جاتے۔ اُس نے بہت سوچا چاروں
طرف دیکھا لیکن کوئی مامن نظر نہ آیا۔ وسیع گنجان آباد دُنیا
میں وہ تنہا بیکس تھی۔ اُس کا کوئی اپنا نہ تھا۔ اُس کے پاس
روپے تھے لیکن روپے رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ اُس کو کسی سہارے
کی ضرورت تھی۔ اندھی بہری دُنیا کے طوفان میں کون اُس
کا ہاتھ تھامے گا۔ کس چھت تلے جاکر پناہ لیگی۔ ایک جھونپڑا
تھا برسوں کا مونس و غمخوار۔ اُس میں نصف جوانی اور نصف
بڑھاپے کے دن گزارے تھے۔ غریب بچے بیکس عورتیں
سب آکر اُس سے اناج بھنواتے تھے۔ یہ اس کے رشتہ دار
تھے۔ آج سب بچھڑ گئے۔ آج اُس کے گھر کے دروازے
اُس پر بند ہو گئے۔ بیچاری کہاں جائے۔ کس طرف۔ کدھر؟
لوگ کچہری سے نکلتے، تو تیزی سے شہر کی طرف چلے جاتے
اُن کے گھر ہونگے۔ مگر سبھاگی کا گھر کہاں ہے؟ اُس کے
پاس محل نہ تھا عالیشان مکان نہ تھا۔ ایک پھوس کا جھونپڑا
اور کچّا بھاڑ۔ ظالموں نے وہ بھی چھین لیا۔ سبھاگی رونے
لگی۔ اُس کے دلخراش نالوں نے راہگیروں کے دل
ہلا دئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

شام کا وقت تھا۔ سبھاگی سیٹھ جانکی داس کی
دُکان پر پہنچی۔ اور ڈرتے ڈرتے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔
جیسے کوئی گداگر ہو۔ اب اس میں وہ حوصلہ وہ جرأت نہ تھی
جس کی ساری دلّی میں دھاک بندھی ہوئی تھی۔ جب وہ
گھر والی تھی۔ اب بے گھر۔ جس کا دُنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔
سیٹھ جانکی داس نے اُسے دیکھا تو آنکھوں میں پانی آگیا۔
غرور کے لاکھوں دشمن ہیں۔ بے بسی کا ایک بھی نہیں۔ اب
اُنہیں کس پر غصّہ آتا؟ ایک بھکارن پر؟ وہ ایسے اوچھے،
اس قدر ذلیل نہ تھے۔ اُٹھ کر باہر آگئے اور بولے "سبھاگی!"

سبھاگی نے روپے زمین پر اُلٹ دئے۔ اور کہا۔
یہ تمہارے روپے ہیں۔ انہیں سنبھال لو۔ یہ تم کو مبارک
ہوں۔ تم نے ساڑھے چار سو کہا تھا۔ یہ آٹھ سو ہیں۔ میرا
جھونپڑا میرے ہاتھ سے گیا۔ پر تمہارے کلیجہ میں تو ٹھنڈ

پڑ گئی۔"

سہاگی کے لفظ نہیں تھے زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔ سیٹھ صاحب بیتاب ہو گئے۔ وہ آگے بڑھے کہ سہاگی کے پاؤں میں گر کر معافی مانگیں۔ انہیں اب معلوم ہوا کہ یہ میں نے کیا کیا ہے۔ اس غریب بڑھی کے دل میں گھر کا ایسا پیار ہو گا۔ یہ انہیں آج معلوم ہوا۔ مگر سہاگی وہاں نہ تھی۔ البتہ اس کے روپے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ یہ روپے نہ تھے سہاگی کی حسرتیں تھیں۔ خون سے شور بور۔

آدھی رات کو سہاگی اپنے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ مگر اس طرح خاموشی سے جیسے کوئی چور ہو۔ پھونک پھونک کر پاؤں دھرتی تھی۔ کوئی سن نہ لے۔ کوئی دیکھ نہ لے کبھی وہ اس جھونپڑے کی رانی تھی۔ آج پردیسن۔ جس کا اس پر کوئی حق نہ تھا۔ اس نے چراغ جلایا۔ سب کچھ وہیں پڑا تھا۔ ایک پیتل کی تھالی ایک لوٹا۔ دو کٹوریاں، ایک چارپائی بس یہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ آج وہ ان سے وداع ہونے آئی ہے۔ وہ نئے زمانہ کی عورتوں میں سے نہ تھی، جو اپنے مکان کو چھوڑتے وقت ایک قطرہ اشک بھی نہیں بہاتیں، نہ ان کے دل پر اس حسرتناک موقعہ پر کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ وہ پرانے زمانہ کی ناتعلیم یافتہ جاہل عورت تھی۔ جس کے لئے گھر چھوڑنا اور دنیا کو چھوڑنا دونوں برابر تھے۔ وہ اپنی چیزوں کو لپٹ لپٹ کر روئی۔ گویا وہ بے جان اشیا نہ تھیں۔ جیتی جاگتی سکھیاں تھیں۔ جن کی جدائی کا خیال اس کا خون سرد کئے دیتا تھا۔ اس وقت اس کا دل رو رہا تھا۔ صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا سب کچھ وہیں پڑا ہے۔ اسی طرح۔ صرف سہاگی نہ تھی۔ مکان موجود تھا لیکن مکین کا پتہ نہ تھا۔ سیٹھ جانکی داس کی چال کامیاب ہو گئی۔ وہ جگہ شمبھو ناتھ سے انہوں نے خرید لی۔ یہ پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا۔ سہاگی سیٹھ صاحب کے ہاتھ یہ جگہ دو ہزار کو بھی نہ بیچتی۔ انہوں نے سہاگی کی بہت تلاش کرائی لیکن کچھ سراغ نہ ملا۔

مگر سہاگی کہاں تھی؟ شہر سے باہر جمنا کے کنارے جنگل میں۔ وہ اسی رات بھاگ گئی۔ اب اسے شہر سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی ایسی جگہ جا رہے۔ جہاں کوئی واقفکار شناسا نظر نہ آئے۔ وہ آدمی کے سایہ سے بھاگتی تھی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اب اس کے کان انسانی آواز کے بھوکے نہ تھے۔ نہ اس کے لئے دنیا میں امید کا دلنواز نغمہ باقی رہا تھا۔ بھوکی پیاسی دیوانہ وار چلی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کہاں؟ شاید وہاں جہاں انسانی ہمدردی کی صدائے شیریں اور امید کا خیال موہوم بھی نہ ہو۔ وہ اب ایسی جگہ چاہتی تھی جہاں کوئی خوشی کوئی مسرت، کوئی چمک نہ ہو۔ رات کے اندھیرے میں سہاگی پتھروں سے ٹکراتی جھاڑیوں سے الجھتی، گڑھوں میں گرتی

پڑتی، اس طرح چلی جاتی تھی جس طرح اُڑتے ہوئے پنچھی کا سایہ چلا جاتا ہے۔ اور اُسے روکنے کی کسی میں طاقت نہیں ہوتی۔ وہ آدمی اور آدمی کے خیال دونوں سے دُور بھاگ رہی تھی۔ جنگل کے خونخوار درندے اُسے آدمی سے کہیں رحمدل اور مروّت پسند معلوم ہوتے تھے۔ سوچتی تھی۔ یہ جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہیں دیتے۔ بغل میں چھری رکھ کر مُنہ سے میٹھی میٹھی باتیں نہیں بناتے۔ انہیں خوشامد کرنا نہیں آتا۔ یہ انسان سے ہزار درجہ اچھے ہیں۔

اسی طرح سبھاگی جنگل اور اپنی قسمت کے اندھیرے میں بڑھتی چلی جاتی تھی۔ کہ بھوک پیاس اور سردی نے اس کی طاقتوں پر غلبہ پالیا۔ اور اُس کے پاؤں رُک گئے۔ اور وہ کسی بدنصیب کے نصیب کی طرح اندھیرے میں جنگل کی زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ گیدڑوں کی مہیب آوازیں رات کو اور بھی خوفناک بنائے دیتی تھیں اور سبھاگی اپنے جھونپڑے کو یاد کرکے رو رہی تھی۔ مگر اس کے آنسوؤں کو دیکھنے والا سوائے آسمان کے تاروں کے اور کوئی نہ تھا۔

یہاں سبھاگی نے پندرہ دن کاٹے۔ درختوں کے پھل کھاتی جمنا کا پانی پیتی اور رنج و غم کے گیت گاتی یہاں تک کہ اُس کا دل اُچاٹ ہوگیا۔ اور وہ پھر اپنے پُرانے شہر کو واپس ہوئی۔ لیکن شہر کے قریب آکر اُس کا دل بیٹھ گیا۔ "کہاں جاؤں؟ کیسے جاؤں؟ اب میرا اس شہر میں کیا کام ہے۔ لوگ دیکھینگے تو کیا کہیں گے" آخر ارادہ کیا کہ رات میں جاؤں گی۔ کوئی دیکھنے نہ پائے مگر رات بہت دیر میں آئی۔ بدنصیبوں سے وقت کو بھی دُشمنی ہے۔

سبھاگی اپنے جھونپڑے کے پاس پہنچی۔ تو اس پر بجلی سی گر پڑی۔ وہاں جھونپڑا نہ تھا۔ نہ اُس کا بھاڑ نظر آتا تھا۔ زمین کھُدی ہوئی تھی چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔ سبھاگی نے ایک نعرہ مارا۔ اور زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہوا، جیسے چاندنی چوک کی تمام روشنیاں بُجھ گئی ہیں۔ اور آسمان کے تاروں نے اندھیرے کی چادر میں مُنہ چھپا لیا ہے یکایک اُسے خیال آیا "میرا خاوند مجھے لینے آئے گا تو کیا کہیگا۔ کہاں ڈھونڈیگا۔"

صبح کے وقت وہاں اُس کی لاش پڑی تھی۔ اُسکا بچن جھوٹا نہ نکلا۔ اُس نے دُنیا چھوڑ دی۔ مگر اپنا جھونپڑا نہ چھوڑا۔ نئی دلّی میں پُرانی دلّی کا ایک ہی چراغ روشن تھا وہ بھی بُجھ گیا سیٹھ جانکی داس کئی دن گھر سے باہر نہ نکلے۔

سُدرشن

نُور جہاںؔ کا مزار

(ذیل کی دو نظمیں انجمن ارباب علم کے جلسہ منعقدہ شملہ میں پڑھی گئی تھیں)

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے　　کہتے ہیں یہ آرام گہ نور جہاں ہے
مُدّت ہوئی وہ شمع تہ خاک نہاں ہے　　اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جس کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اس کی شب دیجور کا عالم

اے حُسنِ جہاں سوز، کہاں ہیں وہ شرارے　　کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے؟　　ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشق دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے　　غالیچہ سر فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے　　دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو۔ مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذِ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر　　یہ دور زمانہ کے اُلٹ پھیر یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر　　اے گردش ایّام، یہ اندھیر یہ اندھیر

ماہِ فلکِ حُسن کو یہ بُرج ملا ہے
اے چرخ تری ہیچ نوازی کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی، یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر آرام لیا کرتے ہیں اس روضہ میں آ کر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے تیتر اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے جو نازکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے
جو گُل رُخ و گُل پیرہن و غنچہ دہن تھے شاداب گُل تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گُل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے جو پیکرِ ہستی کے لئے روحِ رواں تھے
محبوبِ دلِ خلق تھے جاں بخشِ جہاں تھے تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دُنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

محروم

شملہ

رشکِ فردوس ہے محروم! فضا شملے کی
نفسِ حور سے بڑھ کر ہے ہوا شملے کی

چہرۂ شاہدِ فطرت نہیں مستور یہاں
نہیں اے ذوقِ نظر! پردے کا دستور یہاں

راجہ اندر کا اکھاڑا ہے یہ کہسار نہیں
سبز پریوں کے ہیں انبوہ۔ یہ اشجار نہیں

اس کی رفعت کا بھلا کس سے ہو اندازہ ٹھیک
ہونگی جنّت کی فضائیں کہیں اس کے نزدیک

نگہِ شوق جدھر اُٹھ کے چلی جاتی ہے
مخملی فرش بچھا زیرِ قدم پاتی ہے

کیا خبر کیسا ہو نیرنگِ تماشائے بہار
کہ خزاں میں ہے یہاں منظر زیبائے بہار

چشمِ مشتاق کو سامان تماشا ہیں بہم
شجر و سبزہ و گل انجمن آرا ہیں بہم

بے تکلف ہے یہاں عشوۂ عریانِ بہار
خلوتِ ناز ہے یہ بزمِ عروسانِ بہار

حیرت افزا ہیں بہت چیل کے اشجارِ بلند
ان کی توصیف کو درکار ہیں افکارِ بلند

کوئی دیکھے تو ذرا ان کی فلک فرسائی
بے ستوں کب ہے یہ سقفِ فلکِ مینائی

تازگی جلوۂ انوارِ سحر میں ہے یہاں
طفلِ معصوم اُٹھے نیند سے جیسے خنداں

منظرِ شام نیا لطف دکھا دیتا ہے
سایۂ زلفِ حسیناں کا پتا دیتا ہے

قمقمے دامنِ کہسار سے تا دامنِ چرخ
جن کی طلعت سے ہے ممنونِ ضیا دامنِ چرخ

نظر آتے ہیں ستاروں سے زیادہ روشن
روبرو ان کے ستارے ہیں دِیے بے روغن

سامنے ان کے نہ کیوں ماند ہوں سارے تارے
ٹکڑے بجلی کے ہیں یہ اور وہ بچارے تارے

جس طرف دیکھئے اِک نور نظر آتا ہے
جو شجر ہے شجرِ طور نظر آتا ہے

سبق آموز ہے کیا خوب یہاں کی بستی
ہر بلندی کی بغل میں ہے برابر پستی

دھوپ چھاؤں کے مناظر بھی غضب ڈھاتے ہیں
رنگ نیرنگیِ دوراں کا دکھا جاتے ہیں

سایۂ ابر کہیں۔ جلوۂ خورشید کہیں
عالمِ یاس کہیں، پرتو امید کہیں

سایہ و نور کا باہم یہ بدل کر چلنا
یاس و امید کے جادو کا ہے یکسر چلنا

پھر کبھی شملے کی تعریف میں لکھیں گے کچھ اور
اب تو بدلا ہے خیالات نے پہلو بے طور!

تلوک چند محروم

غزل

منت اُس بیداد گر کا ہم پہ احساں ہو گیا
نالۂ جانکاہ خود ہی آفتِ جاں ہو گیا

ہے دلِ روشن تو کیا دشوار ہے منزل رسی
راہبر ہر ذرۂ ریگِ بیاباں ہو گیا

حالِ دل سن کر وہ اس انداز سے ہنسنے لگے
بے حقیقت خندۂ چاکِ گریباں ہو گیا

دیکھئے کیا آج ہوتا ہے مآلِ انتظار
جان کا آزار طولِ شامِ ہجراں ہو گیا

دیکھنا حیرت فروشی حسنِ جاناں کی کہ میں
دیکھتے ہی صورتِ آئینہ حیراں ہو گیا

لیکے ہم جا پہنچے کیا تحفہ پئے حورانِ خلد
ایک دل پہلو میں تھا وہ نذرِ خوباں ہو گیا

کس کے جلووں سے ہوا روشن چراغِ آرزو
کون بزمِ ناز میں شمعِ شبستاں ہو گیا

عشق کب رکھتا ہے باقی ظاہر و باطن میں فرق
بڑھتے بڑھتے چاکِ دل چاکِ گریباں ہو گیا

مدعائے دل بیاں کرنے گئے تھے ہم مگر
مانعِ گفتار رعبِ حسنِ جاناں ہو گیا

منحصر تم ہی پہ حیرانی نہ تھی کچھ اے کلیم
ذرہ ذرہ وادیِ ایمن کا حیراں ہو گیا

پورن سنگھ ہنر

میری داستانِ حیات

(گزشتہ سے پیوستہ)

اعلیٰ شاعری خواہ یونانی میں ہو، خواہ انگریزی زبان میں ہو۔ اپنی شرح کے لئے ایک جواب وہ رُوح سے بڑھ کر اور کسی کی محتاج نہیں ہُوا کرتی، کاش کہ شرح کنندگان کا وہ لشکر جو شعرا۔ کے اعلےٰ کلام کا حلیہ اپنی تخیل، فرمائش اور طولانی حاشیوں کے ذریعے بگاڑ کر اسے مکروہ، اور ملیامیٹ کئے دیتا ہے۔ اس سادہ حقیقت کو ذہن نشین کرے! یہ ضروری نہیں کہ کسی نفیس نظم کی خوبی کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے ہر لفظ کی تشریح کی جائے، یا اس کے الفاظ کی نحوی ترکیب کیجائے۔ مَیں جانتی ہوں کہ میرے عالم اساتذہ نے میری بہ نسبت نظم الیڈ کے بہت زیادہ رُوح پرور خزانے دریافت کئے ہونگے مَیں اتنی حریص نہیں ہوں۔ مَیں اسی پر قانع ہوں کہ دوسرے لوگ مجھ سے بڑھ کر عالم اور دانا ہیں۔ لیکن باوجود اپنے تمام وسیع علم کے وہ میری طرح اس شاندار رزمیہ نظم کے لطف کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔ جب مَیں نے اس نظم کے بہترین حصے پڑھے تو مجھے ایک روحانی قوت پیدا ہونے کا احساس ہُوا۔ جس نے مجھے زندگی کے تنگ و تار حالات سے اُٹھا کر بلند کر دیا تھا۔ مجھے اپنے جسمانی نقائص بھول گئے تھے۔ اور مَیں نے دیکھا کہ میری دُنیا اس سے کہیں بالاتر ہے۔ جس میں ہم رہتے ہیں اور آسمانوں کا طول و عرض اور ان کی تمام وسعت میری وسعت ہے! مَیں اینیڈ کی اتنی دلدادہ نہیں، تاہم اس کی وقعت میرے نزدیک کچھ کم نہیں ہے۔ مَیں نے حتی الامکان شرح اور لغت کی مدد کے بغیر جتنا ہوسکا اس کا مطالعہ کیا۔ اور مَیں نے ہمیشہ ان کے ان واقعات کا جو مجھے مرغوب ہیں، ترجمہ کیا ہے۔ رومہ کا شاعر ورجل جس نے یہ رزمیہ نظم لکھی ہے، بعض اوقات بلا کے نادر مناظر پیش کرتا ہے۔ اس کے پیش کردہ دیوتا، اور انسان، کشمکش، رحم اور محبت کی کیفیات میں سے گزرتے ہیں۔ جس طرح ملکہ الزبتھ کے عہد میں ناٹکوں کی خوشنما پتلیاں سٹیج پر تماشا کرتی نظر آتی ہیں۔ حالانکہ الیڈ میں یہی ایکٹر صرف دو تین دُھندیں بھر کر گانے بجانے میں مصروف

ہو جاتے ہیں۔ ورجل کا طرزِ کلام بعینہ ایسا متین اور پُر لطف ہے۔ جیسے شب ماہتاب میں اپالو[۱] کا نظارہ۔ برخلاف اس کے ہومر کی تصویر کشی کی یہ صورت ہے۔ گویا وہ خوبصورت جوشیلا نوجوان ہے۔ کہ سورج کی کامل روشنی میں کھڑا ہے اور اس کے سر کے بال ہوا سے اس کے رخساروں پر ہلتے نظر آتے ہیں۔ کاغذ کے پر لگا کر اڑنا کتنا آسان ہے! میرے لئے "یونانی شجاعوں" کی سیر سے فارغ ہو کر الیڈ کی فضا کی طرف عبور کرنا ایک دن کا بھی سفر نہ تھا اور نہ یہ سفر چنداں پُر لطف تھا۔ میں جتنا عرصہ گرامر اور لغات کی پیچیدگیوں میں الجھی رہتی تھی۔ یا امتحان کے ان خطرناک گڑھوں میں گری پڑتی تھی جو سکول اور کالجوں کے کارپرداز مشتاقانِ علم کے لئے کھود تے تھے۔ اتنے عرصے میں تو انسان دنیا کے گرد کئی مرتبہ سفر کر سکتا ہے میرا خیال ہے کہ اس قسم کا "حاجی کا سفر" بلحاظ اس کے انجام کے راستی پر مبنی تھا۔ لیکن مجھے کم از کم یہ لامحدود تو ضرور ہی معلوم ہوتا تھا۔ باوجودیکہ مجھے اثنائے مطالعہ میں بہت سے دلخوش کن اور حیران کرنے والے واقعات پیش آتے رہے۔ بہت عرصہ پیشتر اس سے کہ میں انجیل کو سمجھ سکتی۔ میں نے اس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یہ امر نہایت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ کیا مجھ پر بھی ایسا زمانہ گزرا ہوگا۔ جبکہ میری روح انجیل کی نادر نغمہ آفرینیوں کی طرف سے بہری رہی ہو؟ مجھے بخوبی یاد ہے۔ کہ جب اتوار کو اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ تو میں اپنی ایک عزیز رشتہ دار سے یہ کہتی تھی کہ مجھے انجیل میں سے کوئی کہانی پڑھ کر سناؤ! اگرچہ اس عزیز کو یہ خیال نہیں ہوتا تھا۔ کہ میں اسے سمجھ سکوں۔ تاہم وہ میرے کہنے سے یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کا قصہ میرے ہاتھ پر ہجّا کر کے بتاتی تھی۔ کسی نامعلوم وجہ سے وہ مجھے بے لطف معلوم ہونے لگتا تھا۔ ناشناسی زبان اور اس میں بعض امور کے تکرار سے مجھے یہ قصہ اصلی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کنعان کی سرزمین بھی بے حدود دراز تھی۔ پس مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ اور پیشتر اس کے کہ یوسفؑ کے بھائی ان کا خون آلودہ کُرتا لیکر یعقوبؑ کے خیمے میں داخل ہوں اور اپنی جھوٹ موٹ کی بناوٹی کہانی ان سے بیان کریں میں کسی اور ہی ملک کی سیر میں محو ہوتی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ مجھے یونانی قصّے کیوں اتنے دلفریب معلوم ہوتے تھے۔ اور انجیلی قصص کیوں میرے لئے دلچسپی سے خالی تھے۔ شاید اس کا یہ سبب ہو کہ بوسٹن میں مجھے چند

---

[۱] مشہور یونانی دیوتا جو فنون طب، موسیقی، شاعری اور فصیح البیانی کا سرپرست کہلاتا ہے۔ یونانی علم الاوثان میں اس کا ذکر بکثرت آتا ہے۔ (مترجم)

ہیلن ڈاؤ [illegible] سال کی عمر میں

ہیلن ڈاؤ اور حمدو

مس کلر اور ڈاکٹر گراہم بیل

ہیلن کلر موسیقی کا ذوق محسوس کرتی ہے
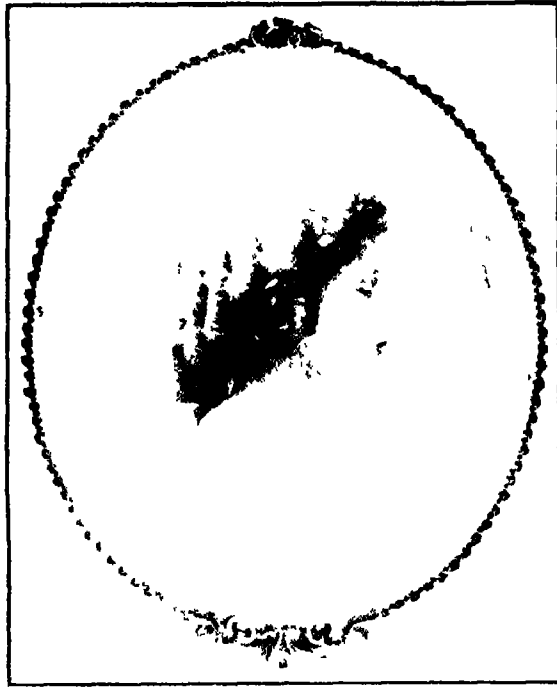
یونانیوں سے آشنا ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔ جو اپنے ملک کے قصوں پر بہت نازاں اور ان کے متعلق اپنا جوش و خروش ظاہر کرتے تھے۔ برعکس اس کے مجھے ایک بھی عبرانی یا مصری سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ یہ لوگ بالکل وحشی ہیں۔ اور ان کے قصے بھی تمام فرضی ہیں اسی وجہ سے ان کے نام عجیب و غریب ہیں۔ اور ان کے قصوں میں تکرار بہت زیادہ ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ مجھے یونانی کنیت کی طرز کے نام کبھی طرفۃ الاسم معلوم نہیں ہوئے۔ بایں ہمہ انجیل کی اس شان و شوکت کو جو بچپن کے بعد مجھ پر روشن ہوئی۔ بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ کئی سالوں تک میں نے اس کا مطالعہ بیش از بیش مسرت اور ناشیہ کے ساتھ لیا ہے۔ اور میں اس کے مقابلے میں اور کسی کتاب کی اتنی شائق نہیں ہوں تاہم انجیل میں بہت سا مواد ایسا ہے جس کے خلاف میری ہستی کی ایک ایک قوت بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ میں اس ضرورت کا خیال کر کے پچھتاتی ہوں جس نے مجھے اس کے مطالعہ پر ابتدا سے آخر تک مجبور کیا۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ علم جو میں نے انجیل کی تاریخ اور اس کے ماخذوں کے متعلق حاصل کیا ہے۔ ان ناگوار تفصیلات کے مقابلے میں جن پر متوجہ ہونے کے لئے مجھے مجبور ہونا پڑا۔ کوئی معاوضہ یا صلہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں مجھ سے پوچھو

تو مسٹر باولز کی تائید کرتے ہوئے میں کہونگی کہ قدیم زمانے کے علم ادب میں سے تمام بھونڈا اور وحشیانہ مواد نکال ڈالنا چاہئے۔ اگرچہ میں ساتھ ہی یہ بھی پسند نہیں کرتی۔ کہ اُن تصانیف عظمٰے کو کمزور کر کے پایۂ صداقت سے گرایا جائے انجیل میں ایستھر[۵] کی کتاب پُر اثر اور رعب آفرین ہے۔ اور اس کے انداز بیان میں بلا واسطہ طور پر سادگی کی ایک شان پائی جاتی ہے کیا اس نظارے سے بڑھ کر اور بھی کوئی پر عظمت سین ہو سکتا ہے۔ جس میں ایستھر اپنے بچپن خاوند

---

[۵] ایستھر یا آستر۔ یہ توریت کا ایک باب ہے اخسویرس بادشاہ ہندوستان سے کوش تک سلطنت کرتا تھا ۱۲۷ صوبے اس کی عملداری میں تھے۔ ایک دن اس بادشاہ کا دل مینوشی سے خوش تھا اس نے حکم دیا کہ اس کی ملکہ وشتی کو شاہی تاج سر پر رکھ کر بادشاہ کے حضور میں لائیں تاکہ اسکا جمال لوگوں اور امیروں کو دکھایا جائے۔ کیونکہ وہ نہایت خوبصورت تھی۔ وشتی نے اس طرح آنے سے انکار کیا۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا اور اُس نے امرائے سے پوچھا کہ وشتی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے انہوں نے خوبصورت کنواریاں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں۔ تاکہ وہ ان میں سے اپنے لئے کوئی نئی ملکہ انتخاب کرے۔ [illegible] میں مردکی یہودی کی بھتیجی لڑکی آستر بھی تھی۔ جو بادشاہ کو بہت پسند آئی اسی اثنا میں ملک کے تمام یہودیوں پر بادشاہ کا غضب نازل ہوا یعنی انہیں قتل کرنے کا مشورہ ہونے لگا۔ آستر نے بادشاہ کے منظور نظر ہونے کی وجہ سے اسے اس فعل سے باز رکھا۔ آستر انجیل کی نیک طینت خواتین میں سے شمار کی جاتی ہے (مترجم)

کے رو برو کھڑی ہوتی ہے۔ اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے غضب سے اسے بچانیوالا اور کوئی نہیں ہے۔ بایں ہمہ نسوانی خوف وخطر پر قابو پاکر وہ اس کے نزدیک آتی ہے۔ وہ شریف ترین جذباتِ حب الوطنی کے ساتھ مملو ہوکر ایک ہی بات کو دہراتی ہے یعنی "اگر میں فنا ہوتی ہوں تو ہو جاؤں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ لیکن اگر میں زندہ رہونگی تو میرے اہلِ وطن زندہ رہیں گے۔" روتھ[لہ] کی کہانی بھی کس قدر مشرقی رنگ کی ہے۔ تاہم اُن سادہ دیہاتی لوگوں کی زندگی، فارس کے دارالخلافے کے رہنے والوں سے کتنی مختلف ہوتی ہے! روتھ اسقدر نمکحلال اور نیکدل عورت ہے کہ ہم اس سے اُنس کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ جبکہ وہ کھیت کاٹنے والوں کے درمیان ہوا سے جھومتے ہوئے کھیت میں استادہ نظر آتی ہے۔ اس کی خوبصورت بے غرض رُوح روشن ستارے کی طرح جو ایک تاریک اور بے رحمی کے زمانے والی رات میں چمکتا ہو۔ درخشاں نظر آتی ہے۔ روتھ جیسی محبت جو گہرے نسلی تعصب، اور متخاصم عقائدِ دین سے بالاتر ہے۔ دُنیا بھر میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ انجیل کے مطالعہ سے مجھے ایک گہرا، اور تسکین بخش احساس یہ ہوتا ہے۔ کہ ظاہری اشیاء ایک عالمِ فانی سے اور باطنی اشیاء ایک عالمِ غیر فانی سے تعلق رکھتی ہیں۔

جب سے مَیں کتاب خوانی کے قابل ہوئی ہوں مجھے ایسا کوئی وقت یاد نہیں جبکہ مَیں شیکسپیر کی دلدادہ نہ رہی ہوں۔ مجھے یہ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ کہ میں نے لیمب صاحب کی تصنیف "شیکسپیر کی کہانیاں" کب پڑھنی شروع کی تھی۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ پہلے پہل میں نے انہیں بچپن کی حیرت اور بچوں کے سے تصورات کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ میکبیتھ کا ڈراما پڑھ کر میں از حد متاثر ہوئی اسے ایک مرتبہ پڑھ لینے سے قصّے کی تمام تفصیلات میرے ذہن نشین ہو چکی تھیں، میں مدتوں تک اس کی جادوگرنیوں اور

لہ روتھ۔ یا روت۔ یہ بھی توریت میں ایک باب کا عنوان ہے الیملک اور اسکی جورو نعومی قحط کے سبب اپنے ملک بیت لحم سے نکلکر موآب کے ملک میں جا بسے۔ ان کے دو بیٹوں نے موآب کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ ان عورتوں میں سے ایک کا نام روت تھا۔ دس برس کے بعد ان دونوں بیٹوں کی وفات پر نعومی اپنی بہو روت کے ساتھ بیت لحم کو لوٹی۔ نعومی کے خاوند کا ایک رشتہ دار الیملک کے گھرانے میں بڑا مالدار زمیندار تھا۔ اس کا نام بوعز تھا۔ روت اس کے کھیت میں بالیں چننے کے لئے جاتی ہے۔ اپنی ساس نعومی کے اشارے سے وہ بوعز کے گھر میں مفلسی سے پناہ لیتی ہے۔ بوعز اس کی سادگی، اور پاکدامنی کے سبب اس کے دامِ الفت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اور اس سے شادی کرلیتا ہے (مترجم)

بھوتوں کو عالم رویا میں دیکھتی رہی ہیں خنجر اور لیڈی میکبتھ
کے ننھے سے ہاتھ کو جس پر خون کا خوفناک نشان اس غمزدہ
ملکہ کی طرح اصلی نظر آتا تھا۔ تصوّر میں بخوبی دیکھ سکتی تھی۔
میکبتھ پڑھ کر معاً میں نے "شاہ لیئر"[۵۱] کا مطالعہ کیا۔
اور میں اس دہشتناک نظارے کو کبھی نہیں بھولوں گی جس
میں گلاسٹر کی آنکھیں نکال ڈالی جاتی ہیں۔ میں اسے پڑھ کر
غضب آلودہ ہوگئی۔ میری انگلیاں بے حس ہوگئیں۔ میں
دیر تک پتھر بن کر بیٹھی رہی۔ میرے سر کے اطراف میں
خون تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اور جسقدر ایک بچہ
محسوس کر سکتا ہے اس قدر نفرت میرے دل میں جمع ہوگئی
شائیلاک[۵۲] یہودی اور شیطان دونوں سے میں بیک وقت
آشنا ہوئی ہونگی۔ کیونکہ ان دونوں کا تسلسل دیر تک میرے
دل میں قائم رہا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ میں ان دونوں کی حالت پر
بہت افسوس کرتی رہی۔ میں نے خفیف سا احساس یہ کیا تھا کہ
یہ دونوں کیرکٹر باوجود ان کی کوشش کے کبھی نیک بن ہی
نہیں سکتے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی اس کام میں ان کی مدد پر
آمادہ نہیں۔ اور نہ کوئی انہیں یہ موقع دینا چاہتا ہے تاہم
اب تک بھی میں انہیں بالکل مردود تصوّر نہیں کرتی ہوں۔
بعض اوقات میں یہ محسوس کیا کرتی ہوں۔ کہ دنیا کے تمام
شائیلاک جوڈا[۵۳] اور شیاطین بدی کے عظیم گردش کرنے والے
چرخے کے شکستہ ڈنڈے ہیں۔ جو کسی نہ کسی وقت تک جڑ کر
چرخے کو مسلم کر سکتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ پہلی مرتبہ شیکسپیر
پڑھکر میرے دل میں ناگوار محسوسات پیدا ہوئے۔ اس کے حیرت انگیز
چمکیلے اور تحسین آفریں ڈراموں نے جو مجھے اب بے حد پسند
ہیں۔ پہلے پہل مجھ پر کوئی اثر پیدا نہیں کیا۔ شاید اس لئے
کہ وہ بچپن کی خوشیوں کو ظاہر کرتے تھے۔ لیکن شاید بچے
کی قوتِ حافظہ سے بڑھ کر اور کوئی شئے متلون نہیں ہوتی
ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کن چیزوں کی یاد سمائیگی
اور کن کی نہیں۔ اس کے بعد اب تک میں نے شیکسپیر کے

---

۵۱ یہ بھی شیکسپیر کی مشہور ٹریجڈی ہے گلاسٹر اسی ناٹک کا کیرکٹر
ہے۔ ٹریجڈی اس ناٹک یا افسانے کو کہتے ہیں۔ جس کا انجام دردناک
ہو۔ کامیڈی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ (مترجم)

۵۲ شیکسپیر انگریزی ڈراما نویس کے ناٹک "وینس کا سوداگر"
میں ایک کیرکٹر کا نام ہے جو اپنی ہوسِ زر اور ظالمانہ قرضخواہی
کے لئے مشہور ہے۔ ایک مقروض سے روپیہ نہ ادا ہونے پر اسکے
جسم کا آدھ سیر گوشت کاٹنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن بالآخر
پورشیا کی مدد سے ناکام رہتا ہے (مترجم)

۵۳ حضرت عیسیٰؑ کا ایک حواری جس نے ان کو یہودی دشمنوں
کے حوالے کیا تھا۔ اور انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر
چڑھا دیا تھا۔ (مترجم)

ناٹک متعدد بار پڑھے ہیں۔ اور ان کے بعض حصص مجھے حفظ بھی ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں بتا سکتی کہ مجھے ان میں سے کونسے اجزا سب سے زیادہ پسند ہیں۔ ان کے متعلق میری مسرت ایسی ہی متغیر رہتی ہے۔ جیسے میری طبیعت کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گیت اور چودہ سطور کی نظمیں میرے لئے ایسی ہی پرمعنی ہیں جیسے اس کے ڈرامے۔ لیکن شیکسپیئر پڑھنے کے شوق کے باوجود اس کے اشعار کا تمام مطلب اس حد تک سمجھانا دشوار ہے۔ جتنا کہ اس کے نقادوں اور شرح کرنے والوں نے بیان کیا ہے میں ان کی شرح کو بھی یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں لیکن اس کا انجام ہمیشہ شکستہ حوصلگی اور گھبراہٹ ہوتا تھا۔ پس میں نے خفیہ طور پر اپنے دل سے عہد کر لیا کہ میں اس قسم کی مزید کوشش کبھی نہیں کرونگی۔ میرا یہ عہد پروفیسر کٹریج کی شاگردی ہی میں شیکسپیئر پڑھنے سے ٹوٹا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دنیا میں اور شیکسپیئر کے کلام میں بہت سی اشیاء ہیں۔ جو میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اور میں اس سے خوش ہوتی ہوں۔ کہ لحظہ بہ لحظہ ان اشیاء پر سے نقاب اٹھتی جا رہی ہے۔ اور حسن اور تخیل کی نئی سے نئی بادشاہت بتدریج میرے پیش نظر ہو رہی ہے۔

نظم سے دوسرے درجے پر مجھے تاریخ مرغوب ہے۔ اس مضمون کی جو کتاب مجھے دستیاب ہوئی، اسے میں نے پڑھ ڈالا۔ خشک سنوں اور واقعات کی فہرست سے لے کر گرینؔ[۵۱] کی دلچسپ اور بے تعصبانہ "تاریخ انگلستان" تک اور فری مینؔ[۵۲] کی "تاریخ یورپ" سے ایمرٹن کی "ازمنۂ وسطیٰ" تک بھی میرے مطالعہ سے گزریں۔ سب سے پہلی کتاب جسے پڑھ کر مجھے تاریخ کے مطالعہ کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ وہ سونٹنؔ[۵۳] کی "تاریخ دنیا" تھی۔ جو مجھے اپنی تیرھویں سالگرہ پر تحفۃً ملی تھی۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ اس کتاب کے واقعات معتبر خیال نہیں کئے جاتے۔ تاہم میں نے اسے اب تک اپنے قیمتی ذخیرۂ اشیاء میں محفوظ رکھا ہے۔ اسی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ انسانی نسلیں کس طرح

---

۵۱ جان رچرڈ گرین۔ نہایت قابل انگریزی مورخ تھا۔ تاریخ پیدائش ۱۸۳۷ء تاریخ وفات ۱۸۸۳ء

(مترجم)

۵۲ ایڈورڈ آگسٹس فری مین (۱۸۲۳ء۔ ۱۸۹۲ء) انگریزی تاریخ دان تھا۔

(مترجم)

۵۳ ولیم سونٹن (۱۸۳۳ء۔ ۱۸۹۲ء) سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ امریکہ میں بود و باش رکھتا تھا۔ اپنے وقت کا قابل مورخ گزرا ہے

(مترجم)

ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل گئیں۔ انہوں نے بڑی بڑی بستیاں بنائیں۔ شہر آباد کئے۔ اور کس طرح چند بڑے بڑے حکمران، یعنی یونانی ٹائٹن[۱] ہر حصۂ زمین کو مغلوب کر کے اسے اپنے پاؤں تلے رکھتے رہے۔ اور ایک قطعی قول کے ساتھ انہوں نے لکھوکھا انسانوں پر راحت کے دروازے کھول دئے۔ اور اتنی ہی اور مخلوق پر اس کے دروازے بند کر ڈالے۔ کس طرح مختلف قوموں نے علم و فن میں ابتدا کی اور آنے والی قوی تر نسلوں کے لئے علم و حکمت کے دروازے کھولے۔ کس طرح تہذیب ایک پست زمانے میں اپنے آپ کو قربان کر کے شمالی دنیا کے شریف تر فرزندوں کے ہاتھ ققنس کی طرح دوبارہ زندہ ہوئی۔ اور کس طرح آزادی، رواداری اور تعلیم کی برکت سے عظیم الشان ہستیوں اور دانا بزرگوں نے تمام دُنیا کی نجات کے دروازے کھول دئے ہیں۔ مَیں اپنے کالج کی پڑھائی کے دوران میں فرانسیسی اور جرمن علم ادب سے کچھ نہ کچھ آشنا ہو چکی ہوں۔ اپنی روزمرہ زندگی اور علم ادب میں جرمن ہمیشہ قوت کو حسن پر، اور حقیقت کو رسم و رواج پر فوقیت اور فضیلت دیتے ہیں۔ وہ جو کام کرتے ہیں۔ اسے گرمجوشی اور ہتھوڑے کی سی قوت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ کلام کرتے ہیں تو اس لئے کہ اگر وہ اپنے خیالات کو جوان کی روح میں طیش پیدا کر رہے ہیں اظہار کا موقع نہ دیں گے۔ تو ان کا دل جل کر راکھ ہو جائیگا۔ علاوہ ازیں جرمن لٹریچر میں ایک قسم کا نفیس حجاب پایا جاتا ہے۔ لیکن مَیں نے اس کی بڑی شان و شوکت یہ دیکھی ہے کہ اس میں عورت کی ایثار آمیز محبت کی شناخت، اور قدر و منزلت پائی جاتی ہے جو جرمن کے لئے مایۂ ناز اور ایک بہت بڑی اجر دینے والی قوت ہے۔ یہ خیال تمام جرمن لٹریچر میں حاوی نظر آتا ہے اور گوئٹے کی نظم فاوسٹ میں بھی اس کا اظہار صوفیانہ انداز میں اس طرح کیا گیا ہے:-

"تمام عارضی اشیاء کا وجود جو اس دُنیا میں بھیجی گئی ہیں۔ بمنزلہ علامات کے ہے۔ کائناتِ ارضی کی ناتمام اور ناکافی چیزیں یہاں ہر لحظہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن فقط ایک شے ہے جو ہمیں بلندی کی طرف کشاں کشاں لئے جاتی ہے۔ اور وہ عورت کی رُوح ہے۔"

تمام فرانسیسی مُصنّفین میں جن کا کلام میں نے مطالعہ کیا ہے مجھے مولیر اور ریسین سب سے زیادہ پسند ہیں۔ بالذیک

[۱] یونانی علم الاوثان میں دیوتاؤں کے سب سے پہلے بزرگوں کو کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ زمین کے اولین فرزند ہیں۔ یہ بے حد قدآور اور طاقتور تھے۔ انگریزی اصطلاح میں بطور صفت ہر اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو بہت لمبی چوڑی ہو۔ (مترجم)

بھی عمدہ نکات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور "میری می" کی نظم میں بعض ایسے حصے ہیں۔ جو پڑھنے والے کے دل میں اس طرح کی شیریں خلش پیدا کرتے ہیں۔ جیسے نسیم سحری کا ایک تیز جھونکا، الفریڈ ڈی موسیٹ بعض ناممکن امور بیان کرتا ہے میں ڈکٹر ہیوگو افسانہ نویس کی مداح ہوں۔ میں اس کی ذکاوتِ طبع اس کی شوخی اس کے اندازِ افسانہ نویسی کو پرکھ سکتی ہوں۔ اگرچہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں۔ جن کے کلام کو میں بے حد اشتیاق کے ساتھ پڑھا کرتی ہوں تاہم یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ وکٹر ہیوگو، گوئٹے اور شلر اور سب بڑی بڑی قوموں کے ممتاز شعراء دائمی اشیاء کے شرح کرنے والے ہیں۔ اور میری روح ان خطوں میں ان کی پیروی کرتی ہے۔ جہاں حسن، حقیقت اور نیکی سب مل کر ایک ہی ہستی بن جاتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کہ میں نے اپنے کتابی احباب کا تذکرہ کرنے میں طوالت سے کام لیا ہے۔ تاہم میں نے فقط ان مصنفین ہی کا ذکر کیا ہے۔ جو مجھے بہت زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے شاید ناظرین بآسانی یہ نتیجہ اخذ کریں گے۔ کہ میرے احباب کا دائرہ بہت ہی محدود اور غیر جمہوری ہے۔ لیکن یہ نتیجہ غلطی سے خالی نہیں، مجھے بہت سے مصنف مختلف وجوہات کی بناء پر مرغوب ہیں۔ مثلاً کارلائل[۵۱] اس لئے پسند ہے۔ کہ وہ تمام ظاہرداری پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور اس میں ایک ناہمواری اور

کرختہ پن پایا جاتا ہے۔ ورڈز ورتھ اس لئے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ انسان اور نظامِ قدرت کی وحدت کا سبق سکھاتا ہے۔ ہُڈ[۵۲] کی ندرت میں عجیب مزا ہے۔ ہیرک کی نظموں میں ایک حیرت اور گل لالہ اور گلاب کی سی خوشبو پائی جاتی ہے۔ ویٹیر[۵۳] کے کلام میں گرمجوشی اور اخلاقی راستبازی ہویدا ہے۔ چونکہ مجھے ویٹیر سے شرفِ نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے ان کی نظموں کو پڑھنے سے ان کی دوستی کی ہلکی سی یاد تازہ ہو کر اس لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ میں مارک ٹوین[۵۴] کو بھی پسند کرتی ہوں۔ اور کون ہے جو نہیں کرتا۔ ان کو تو دیوتا بھی چاہتے تھے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ ان دیوتاؤں نے اس مصنف کے دل میں تمام دانائی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں حکمت سے لبریز ہو کر وہ تاریک بین نہ ہو جائیں۔ انہوں نے ساتھ ہی ان کے قلب کے دریا پر ایمان اور محبت کی قوسِ قزح کا ایک پل باندھ دیا۔ مجھے اسکاٹ[۵۶] کا کلام اپنی تازگی، بے ساختہ پن

---

[۵۱] سکاچ نقاد اور مورخ (۱۷۹۵ء تا ۱۸۸۱ء) (مترجم)

[۵۲] انگریزی انشاء پرداز اور شاعر (مترجم)

[۵۳-۵۵] امریکن شاعر اور مصنفین ہیں (مترجم)

[۵۶] مشہور انگریزی شاعر و ناول نویس

(مترجم)

اور دیانتداری کے باعث بھاتا ہے۔ غرض مجھے تمام ان
مصنفین سے رغبت ہے جن کے قلب سوتوں کی طرح
روشن خیالی کی فضا میں ابھرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مسرت
اور نیک نیتی کے فوارے ہیں۔ جن میں سے کبھی کبھار غیظ و غضب
کی بوچھاڑ اور گاہے گاہے ہمدردی اور رحم کی شفا دینے والی
دھار نکل پڑتی ہے! قصہ مختصر علم ادب میری خیالی دنیا ہے
اور ادبی دنیا میں چلنے پھرنے کا حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا
حواس کی کوئی رکاوٹ ایسی نہیں جو مجھے میرے کتابی دوستوں
کی شیریں گفتگو اور مہربان کلمات سے محروم کر سکے۔ یہ
دوست بلاتکلف اور بغیر کسی بدنمائی کے مجھ سے بات چیت
کرتے ہیں۔ ان دوستوں کی وسیع محبت اور آسمانی
سخاوت کے مقابلے میں وہ چیزیں جو میں نے حاصل
کی ہیں۔ یا جو مجھے سکھائی گئی ہیں۔ مضحکہ انگیز طور سے
بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔

بائیسواں باب تفریح کے دوسرے سامان۔ کھلی ہوا اور کشتی کی سیر دیہاتی اور شہری زندگی کا مقابلہ بائیسکل کی سواری شطرنج اور تاش کا کھیل۔ درختوں اور بچوں سے اُنس دلبستگی قصہ گوئی اور عجائب گھر کا لطف۔ تصاویر اور تھیٹر

مجھے یقین ہے کہ ناظرین نے پچھلے باب کے مطالعہ سے
یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا ہوگا۔ کہ کتب ہی میرا ذریعہ تفریح ہیں۔ نہیں
بلکہ میری تفننِ طبع کے ذرائع بہت سے اور بھی ہیں۔ اس داستان
کے دوران میں ایک سے زیادہ مرتبہ میں نے دیہاتی اور کھلی ہوا
کی زندگی سے اپنے شغف کی طرف اشارہ کیا ہے جب میں
چھوٹی سی لڑکی تھی۔ میں نے کشتی چلانا اور تیرنا سیکھ لیا تھا۔
اور موسم گرما میں جبکہ میں ریاست میساچوسٹس کے مقام رینتھم
میں مقیم ہوں تو میرا بہت سا وقت اپنی کشتی میں ہی گزرتا ہے
مجھے اس سے زیادہ اور کسی چیز سے خوشی حاصل نہیں ہوتی
کہ جب میرے دوست میری ملاقات کو آئیں تو میں انہیں کشتی
کی سیر کرانے لے جاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ میں اپنی کشتی کو
اچھی طرح نہیں چلا سکتی۔ یہ ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص
کشتی کے پچھلے حصے کی طرف بیٹھ کر اس کے آلہ رہنمائی کو ہاتھ
میں لے تاکہ میں کشتی کو حرکت میں لاؤں۔ لیکن بعض اوقات
میں اس آلے کے بغیر بھی کشتی چلاتی ہوں۔ میرے لئے یہ بھی
ایک تماشا ہے کہ میں سمندری گھاس، اس کے پھولوں اور
ساحل پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کی خوشبو کے ذریعے اُسے سیدھا
چلانے کی کوشش کروں۔ میں چمڑے کے پٹے والے چپوؤں
کا استعمال کرتی ہوں۔ ان کی مدد سے چپو اپنے آہنی حلقوں
میں سے باہر نہیں نکلتے اور پانی کی یکساں کشش سے مجھے
معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں چپو برابر تُلے ہوتے ہیں۔ اسی
طرح میں یہ بھی معلوم کر لیتی ہوں۔ کہ میں کس وقت آبی رو کی

سمت کے خلاف کشتی چلا رہی ہوں۔ میں ہوا اور لہروں کیساتھ جدوجہد کرنا پسند کرتی ہوں۔ اس سے زیادہ اور کوئی چیز موجب تفریح نہیں۔ کہ تم اپنی چھوٹی سی مضبوط کشتی کو اپنی ارادی اور عضلاتی قوت کی فرمانبرداری پر مجبور کر کے لہروں پر پھسلتے اور جھوٹے لئے ہوئے چلے جاؤ۔ اور پانی کے شاندار اور مستقل ابھار کو محسوس کرو۔ مجھے ڈونگہ کشتی چلانے میں بھی حظ آتا ہے۔ اور ناظرین یہ معلوم کر کے مسکرائیں گے کہ میں اس شغل کو بالخصوص چاندنی رات میں پسند کرتی ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں چاند کو چیڑ کے درخت کے پیچھے سے طلوع ہوتے اور آسمان کی بلندی پر چپکے چپکے اُوپر چڑھتے ہوتے نہیں دیکھ سکتی جبکہ وہ ایک چمکدار راستہ بناتے ہوئے ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ تاہم میں اتنا جانتی ہوں کہ ماہتاب آسمان پر موجود ہے۔ اور جس وقت میں کشتی کے سرہانوں پر لیٹ کر پانی میں اپنا ہاتھ ڈالتی ہوں۔ تو مجھے اپنے تخیل میں چاند ایک ملبوس حسین عورت کی مانند نظر آتا ہے۔ جس کے چلنے سے مجھے گویا اس کے لباس کی سرسراہٹ تک محسوس ہونے لگتی ہے بعض اوقات اس حالت میں کوئی دلیر ننھی مچھلی میری انگلیوں کے بیچ میں سے گزر جاتی ہے۔ اور اکثر دفعہ آبی پھول اپنی شرمیلی ادا کے ساتھ میرے ہاتھ کو چھوتے ہیں بسا اوقات جبکہ میں کسی کھاڑی میں پناہ گزیں ہو کر کھلے سمندر میں آتی ہوں تو مجھے یکایک کرۂ ہوائی کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔

ایک چمکیلی روشن حرارت میرے ارد گرد لپٹ جاتی ہے اور میں یہ معلوم نہیں کر سکتی کہ یہ گرم ہوا پانی سے اٹھ رہی ہے یا ان درختوں سے آتی ہے جنہیں سورج نے گرمایا ہو شہر کے مرکز یا طوفانی سرد دنوں اور رات کی خنکی سے بھی مجھے یہی احساس ہوا کرتا ہے۔ گویا کسی عزیز کے گرما گرم لبوں نے میرے رخساروں کو چوم لیا۔ میری مرغوب طبع تفریح جہاز کا سفر ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے موسم گرما میں مجھے جزیرہ نما نواس کوشیا میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سے پیشتر مجھے سمندر دیکھنے کے اسقدر پرلطف مواقع کبھی میسر نہیں آتے۔ چند دن اس ملک میں جس کے متعلق لانگ فیلو[۵] کی ایک نظم نے گویا سحر کا دریا بہا دیا ہے بسر کرنے کے بعد میں اور مس سیون صاحبہ ہیلیفیکس کو روانہ ہوئیں۔ جہاں ہم نے موسم گرما کا بیشتر حصہ بسر کیا۔ یہ بندرگاہ ہماری راحت اور ہماری بہشت تھا۔ بیڈفورڈ بیسن، جزیرۂ میکناب، یارک ریڈوٹ، اور نارتھ ویسٹ آرم تک ہم نے کیا ہی شاندار سفر کئے! رات کے وقت بڑے بڑے خاموش جنگی جہازوں کے سائے میں ہم نے کتنے عجیب اور تسکین آور گھنٹے بسر کئے! یہ تمام مشاہدات اتنے دلچسپ اور پرکیفیت تھے۔ کہ ان کی یاد

---

۵ مشہور امریکن شاعر ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۸۰۷ء تاریخ وفات ۱۸۸۲ء (مترجم)

ہی ایک دائمی سرچشمۂ مسرت ہے! ایک دن ہمیں ایک واقعہ پیش آیا۔ یعنی نارتھ ویسٹ آرم کے پانی میں کشتیوں کی ایک دوڑ ہوئی تھی۔ اس دوڑ میں مختلف جنگی جہازوں کی کشتیاں مشغول تھیں۔ ہم بھی بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی بادبان والی کشتی میں بیٹھ کر دوڑ دیکھنے چلی گئیں۔ سینکڑوں بادبان والی کشتیاں ادھر سے اُدھر ہمارے اردگرد گشت لگا رہی تھیں۔ اور سمندر ساکن تھا۔ جب دوڑیں ختم ہوئیں اور ہم نے گھر کا رُخ کیا۔ تو ہماری جماعت میں سے ایک شخص نے سمندر پر سے ایک سیاہ بادل اُٹھتا ہوا دیکھا یہ بادل بڑھ بڑھ کر پھیل گیا۔ حتےٰ کہ اُس نے تمام آسمان کو ڈھانپ لیا۔ ہوا زور سے چلی۔ اور سمندر کی لہریں غضبناک ہوکر کسی نامعلوم سدِّ راہ پر تھپیڑے مارنے لگیں۔ ہماری ننّھی کشتی نے بھی بیدھڑک ہوکر طوفان کا مقابلہ کیا۔ اپنے پھیلے ہوئے بادبان اور مضبوط رسوں کے ساتھ وہ ہوا کے تخت پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ کبھی تو چھوٹی لہروں پر اپنی خرام دکھاتی تھی۔ اور کبھی کسی مہیب لہر کے سینے پر چڑھ کر آگے کی طرف اُچھلنے لگتی تھی۔ لیکن ہر مرتبہ سمندر اپنے شوریدہ غضب کے ساتھ اسے تھپیڑ مار کر نیچے گرا دیتا تھا۔ اسی حالت میں کشتی کا بڑا بادبان دھڑام سے نیچے گرا۔ اور ہم یونہی ٹھوکریں کھاتے کھاتے بادِ مخالف کے ساتھ کشتی لڑتی رہیں جو ہمیں اِدھر اُدھر تندی سے دھکے دے رہی تھی۔ ہمارا دِل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اور گھبراہٹ کے مارے ہاتھوں میں سنسنی سی محسوس ہونے لگی۔ پھر بھی ہم پر بدحواسی اور ہراس طاری نہیں ہوا کیونکہ ہمارے دل بحری لٹیروں کی مانند تھے۔ اور ہمیں یہ علم تھا کہ ہمارا کشتی بان اس حالت پر ضرور قابو پا ہی لیگا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں اور بحری تجربے والی آنکھ نے بہت سے طوفانوں میں سے سلامتی کے ساتھ عبور کیا تھا بڑے جہازوں' اور ساحل بر کی توپ چلانے والی کشتیوں نے پاس سے گزرتے وقت ہماری سلامی اُتاری۔ اور ملّاحوں نے ہماری اس ایک بادبان والی کشتی کے ناخدا کے لئے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کئے۔ جو اس قدر جرأت کے ساتھ طوفان کا مقابلہ کر رہی تھی بالآخر سردی' بھوک اور تکان کے ساتھ ہم کشتیوں کے بندھ پر پہنچ ہی گئے۔

میں نے آخری موسم گرما نیو انگلینڈ کے ایک نہایت خوشگوار گاؤں میں اس کے ایک نہایت خوشنما کنارے پر بسر کیا۔ یہ گاؤں یعنی رنتھم جو ریاست میسا چوسٹس میں واقع ہے۔ قریباً میرے تمام رنج و راحت کے شاہدوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کئی سالوں تک مسٹر جے ای چیمبرلین کا گھر ریڈ فارم (سرخ کھیت) جو کنگ فلپ کے تالاب کے قریب ہے۔ میری سکونت رہا۔ مجھے اُن مخلص دوستوں کی عنایات اور مسرت کے دن' جو ان کے ساتھ بسر ہوئے دلی شکرگزاری کے ساتھ یاد ہیں۔ ان کے بچوں کی پیاری ہمنشینی میرے

نزدیک بہت پُر وقعت تھی۔ جنگلوں میں اور سمندر پر میں ان
کے تمام کھیلوں اور سیر و تفریح میں شریک ہوتی تھی۔ ننھے
بچّوں کی بات چیت اور ان کی مسرّت، جو وہ مجھ سے پریوں
اور خیالی ہستیوں کی کہانیاں سُنکر حاصل کرتے تھے۔ ایک
دلخوش کن یاد ہے۔ مسٹر چیمبرلین نے مجھے جنگلی پھولوں اور درختوں
کے اسرار سے آگاہ کیا۔ یہانتک کہ مَیں نے محبّت کے کانوں
سے شاہ بلوط کے درخت میں پانی کی کشش کی آواز سُنی، اور
آفتاب کو اس درخت کی ایک چھت سے دوسری چھت تک
حرکت کرتے ہُوئے پایا۔ بقولِ شاعر۔ "جس طرح درخت
کی جڑیں تاریک زمین کے اندر چھپی ہوئی اس کی اُوپر کی ٹہنیوں
اور پتوں کی شادابی میں شریک ہوکر سُورج کی چمک، وسیع ہوا
اور پردار مخلوق کی ہستی کا اندازہ لگا سکتی ہونگی۔" اسی طرح مَیں
بھی اس قسم کی ان دیکھی چیزوں کو سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب میں یہ ملکہ موجود ہے کہ ہم ان اثرات
اور جذبات کا تصوّر کرسکتے ہیں۔ جو ابتدائے آفرینش سے
بنی نوع آدم کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر فرد بشر سبز زمین، اور
بہتے ہُوئے پانی کے متعلق ایک زیرِ وجدانی یادداشت[51] رکھتا
ہے۔ نابینا یا بہرا ہونا، اسے گزشتہ نسلوں کے موروثی اثرات
سے محروم نہیں کرسکتا۔ یہ موروثی استعداد، ایک قسم کی حسِ سادس[52]
ہے۔ نہیں بلکہ یہی ایک واحد روحانی حس ہے۔ جو تمام اشیاء
کا ادراک ایک ہی مرتبہ دیکھ کر، سُنکر اور ٹٹول لینے سے کرتی ہے۔

رنتھم میں بہتیرے درخت ہیں جن سے مجھے
اُنس ہے۔ ان میں سے ایک شاندار شاہ بلوط کا درخت تو
میری آنکھوں کا تارا ہے۔ اور مَیں اپنے تمام احباب کو ان
درختوں کے بادشاہ کی زیارت کے لئے لے جاتی ہوں
یہ درخت کنگ فلپ کے تالاب کے اُوپر ایک بلند عمودی
ٹیلے پر واقع ہے۔ اور جو لوگ درختوں کے علم میں مہارت
رکھتے ہیں ان کا قیاس ہے کہ اس کی عمر آٹھ سو یا ایک ہزار

---

۵۱ نفس کی "زیر وجدانی کیفیات" وہ ہیں۔ جن میں ہم کسی خاص فعل کے دوران میں کسی اور خیال کی پیروی کرکے اس کے بموجب عمل بھی کرنے لگیں۔ کتاب پڑھتے پڑھتے ہمارا قلم گر پڑتا ہے۔ ہم نظر کو کتاب پر سے ہٹائے بغیر اسے اُٹھا لیتے ہیں، دورانِ گفتگو میں، میز پر سے گلاس تھام لیتے ہیں۔ خط لکھتے وقت کمرے کی تمام اشیا سے ہمارا باخبر ہونا، بچّے کا آکر دروازہ کھولنے اور بند کرنے کا ہمیں بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم تحریر میں محو ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت تعلّم اسی ذیل میں شمار کی جاتی ہے۔ جو ہمارے اصلی وجدان سے ایک درجہ نیچے ہے۔ (مترجم)

۵۲ ظاہری حواس پانچ ہیں۔ جنہیں "حواسِ خمسہ" کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ فلاسفہ نے ایک چھٹی حس بھی دریافت کی ہے۔ جو باطنی ہے۔ اور اسکی مدد سے ہمیں بعض ان دیکھی اشیاء کا علم ہوتا ہے۔ جیسے ہستی باری تعالےٰ آخرت وغیرہ (مترجم)

سال کی ہوگی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اسی درخت کے نیچے، بہادر امریکن انڈین سردار شاہ فلپ، آخری مرتبہ زمین اور آسمان کو دیکھتے ہوئے جاں بحق ہوا تھا۔ ایک اور درخت سے بھی مجھے اُنس تھا۔ جو اس عظیم شاہ بلوط کی نسبت زیادہ حلیم اور قابلِ رسائی تھا۔ یہ ایک لنڈن کا درخت تھا۔ جو سُرخ کھیت "کے صحن میں اُگا ہوا تھا۔ ایک خوفناک برقی طوفان کے دوران میں سہ پہر کے وقت مجھے مکان کی ایک طرف سے ہولناک دھڑاکا محسوس ہوا۔ اور پیشتر اس کے کہ لوگ مجھے آکر بتاتے، مَیں نے جان لیا۔ کہ یہ درخت گر پڑا ہوگا۔ ہم اس بہادر درخت کو دیکھنے کے لئے باہر آئیں۔

جس نے اتنے طوفانوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اُسے اوندھا پڑا ہوا دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ اور مَیں نے خیال کیا کہ اس درخت نے کس قدر قوت کے ساتھ کھڑا رہنے کی جدوجہد کی ہے۔ اور گرا بھی ہے تو کس شان و شکوہ کے ساتھ گرا ہے!

مجھے یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ کہ مَیں بالخصوص گزشتہ موسم گرما کا حال بیان کرنے لگی تھی۔ جونہی مجھے امتحانات سے کلّی فراغت حاصل ہوئی۔ مَیں استانی صاحبہ کے ہمراہ اس سبز کنارہ زمین پر فوراً پہنچ گئی۔ جہاں تین جھیلوں میں سے ایک کے قریب ہماری ایک جھونپڑی موجود ہے۔ انہیں جھیلوں کے باعث ریتھم مشہور ہے۔ یہاں مَیں نے گرمی کے طویل اور چمکیلے دن بسر کئے۔ اور کالج محنت اور شہری شور و شغب کے تمام خیالات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس گاؤں میں ہمیں بیرونی دُنیا کے واقعات یعنی جنگ صلح اور عمرانی جدوجہد کی دھیمی سی گونج سُنائی دیا کرتی تھی۔

ہمیں الکاہل اُقصے، ظالمانہ اور فضول جنگ وجدال کا علم ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سرمایہ اور محنت کے مابین ایک زبردست کشمکش جاری ہے۔ ہم جانتی تھیں کہ ہماری امن بہشت کی سرحد سے پرے کئی انسان اپنی محنت کے پسینے سے نئی تاریخ کی بنا رہے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے، تو عیش و آرام سے اپنی تعطیل منا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے ان چیزوں کی مطلق پروا نہیں کی۔ ہم نے خیال کیا۔ کہ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہیگا۔ اور یہ چیزیں سب معدوم ہوجائینگی لیکن ہمارے آس پاس جنگل اور جھیلوں میں وسیع شوخ نکھی والے درخت ہیں۔ جیسے تاروں بھرا آسمان، خوشبودار چراگاہیں ہیں۔ اور یہ اشیاء ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں۔ پس سردست ہمیں انہیں سے حظ اُٹھانا چاہیے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہماری تمام حسیات آنکھ یا کان ہی کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس امر سے تعجب ظاہر کیا ہے۔ کہ مَیں کیونکر شہر کے بازاروں اور دیہاتی سڑکوں کے درمیان فرق معلوم کرلیتی ہوں اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ مَیں فرش کی عدم موجودگی کا بھی پتہ لگالیتی ہوں۔ یہ لوگ اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں، کہ اردگرد کے

حالات معلوم کرنے کے لئے میرا تمام جسم چوکنا ہے۔ شہر کی گڑگڑاہٹ اور اس کے شور کو میرے چہرے کی اعصاب محسوس کر لیتی ہیں۔ اور ایک ان دیکھے گروہ کی لگاتار نقل و حرکت کا مجھے برابر احساس ہوتا رہتا ہے۔ اس بے سری بھنبھناہٹ سے میری رُوح آزردہ ہونے لگتی ہے۔ بھاری بھرکم گاڑیوں کا پتھریلے بازاروں میں گونجتے ہُوئے گزرنا اور مشینوں کی یکساں کھڑکھڑاہٹ، یہ تمام اس صورت میں میری اعصاب کے لئے تکلیف دہ چیزیں ہیں۔ جبکہ میری توجہ اس منظر وسیع سے جو شور بہ بازاروں میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف سے منعطف نہ ہو جو چشم بینا رکھتے ہیں۔

ہمیں دیہات میں قدرت کی نیرنگیوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہاں ہماری رُوح اس بے رحمی کی کشمکش سے آزردہ نہیں ہوتی۔ جو ایک گنجان شہر میں محض زندگی کو قائم رکھنے کی جدوجہد سے پیدا ہوتی ہے۔ مَیں متعدد مرتبہ ان تنگ و تار، غلیظ شہری گلی کوچوں میں گئی ہوں۔ جہاں غربا بود و باش رکھتے ہیں۔ اور مجھے اس خیال سے سخت برہمی اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ کہ امرا، تو عمدہ عمدہ مکانات میں رہ کر مضبوط، توانا اور خوبرو ہو جائیں۔ اور غریب لوگ بدنما کوٹھڑیوں میں جہاں دھوپ ہی نہیں پہنچتی، زندگی بسر کر کے بدصورت اور مرجھائے ہُوئے کبڑے بدن والے انسان بنیں۔ جو بچے ان غلیظ گلی کوچوں میں نیم برہنگی اور نیم گرسنگی کی حالت میں پرورش پاتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاتھ ان کی طرف پھیلانے سے ایسے خوفزدہ ہو کر دور بھاگتے ہیں، جیسے کوئی کسی صدمے سے بچنے کے لئے اپنی حفاظت کرے۔ اس ننھی اور پیاری مخلوق کو میں اپنے دل میں جگہ دیتی ہوں۔ اور مجھے ان کے خیال سے بار بار دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ اسی آبادی میں بعض مرد اور عورتیں بھی ایسی موجود ہیں۔ جو ایسی گزران کرنے سے بے ڈول اور بدنما شکل کی ہو گئی ہیں۔ مَیں نے ان کے سخت اور کھردرے ہاتھوں کو چھو کر اندازہ کیا ہے کہ ان کی جہدِ بقا کسقدر لگاتار اور مسلسل ہے۔ اور وہ کشمکش کا ایک ایسا سلسلہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ کام حاصل کرنے کے لئے ان کی کوشش میں بار بار مزاحمت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوشش اور مواقع زیست کے مابین ان کی زندگی ایک وسیع ناموافقت کی صورت میں بسر ہو رہی ہے۔ ہم اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہوا اور سورج ہر ذی رُوح کے لئے خدا تعالیٰ کے مفت تحفے ہیں۔ لیکن کیا درحقیقت یہ قول صحیح سمجھا جاتا ہے؟ دیکھو! اس گنجان شہر کے تیرہ و تار کوچوں میں سُورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ اور وہاں ہوا غلیظ ہے۔ اے انسان! تو ایک غریب بھائی کو دیکھ کر جو نانِ شبینہ کو محتاج ہے کیسے اُسے بھول جاتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے۔ پھر تو کس مُنہ سے یہ دُعا مانگا کرتا ہے! اے کاش کہ

انسان شہر اس کی شان و شوکت، عظمت اور اس کے سیم و زر
پر لات مار کر جنگل اور کھیت میں سادہ دیانت داری کی زندگی بسر
کرے! اسی صورت میں انسانی بچے، شاندار درختوں کی سی
عظیم الشان نشوونما اور زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان کے
خیالات میں بھی راستے پر اُگے ہوئے پھولوں کی سی تازگی
اور شگفتگی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے شہر میں سال بھر کام کرنے
کے بعد جب میں دیہات کی طرف لوٹتی ہوں تو مقابلہ کرنے
سے یہ ناممکن ہے کہ مجھے اس قسم کے خیالات دل میں پیدا
نہ ہوں۔ جو میں نے ظاہر کئے ہیں۔

دیہات میں آکر نرم لچکدار زمین کو پاؤں تلے محسوس
کرنا، گھاس دار سڑکوں پر چلکر، خار دار کناروں والی ندیوں
تک پہنچنا، جہاں میں ندی کے سریلے آبشاروں میں اپنی انگلیوں
کو غسل کراتی ہوں۔ یا کسی پتھریلی دیوار پر چڑھکر ان سبز کھیتوں
میں اُترنا، جو دور تک لڑکھڑاتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ پھر
دوبارہ سرکشانہ کھلکھلاہٹ کے ساتھ اس دیوار پر چڑھنا،
اس تمام شغل میں مجھے کتنا لطف بے بہا حاصل ہوتا ہے!

فرصت کی سیر سے دوسرے درجے پر مجھے اپنے
اگل پچھل بائیسکل پر چکر لگانے میں حظ آتا ہے۔ اس آہنی
گھوڑے کی لچکدار حرکت کو محسوس کرنا جبکہ ہوا میرے چہرے
پر تھپیڑے مار رہی ہو۔ مجھے بہت ہی پر لطف معلوم ہوتا
ہے۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ گزرنے سے قوت اور بہاؤ
کی ایک خوشگوار حس پیدا ہوتی ہے۔ اور اس ورزش سے میری
نبض میں رقص اور میری رُوح میں وجد پیدا ہوتا ہے۔ پیدل
یا کشتی کی سیر یا سواری کرتے وقت حتی الامکان میرا کُتا میرے
ساتھ جاتا ہے۔ مجھے کئی اقسام کے کتوں کا بہت شوق رہا
ہے۔ مثلاً سگانِ جہازی، نرم نگاہ والے پشم دار سپنیل،
جنگل صفت، شکار کے قریب پہنچکر بیٹھ جانے والے اور
وفادار بلند قامت سانڈ نما ٹیریر کُتے۔ اس وقت اسی آخری
قسم کا ایک کُتا میرے پاس موجود ہے۔ جسے میں بہت پیار
کرتی ہوں۔ یہ کُتا بہت خاندانی ہے۔ اس کی دُم خمدار ہے
اور اس کی ایک سگانہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ عجیب "فز" "فز"
کی آواز نکالتا ہے۔ میں نے اس کا نام بھی "فز" رکھدیا ہے
معلوم ہوتا ہے کہ میرے یہ دوست، میری معذوریوں کو سمجھتے
ہیں۔ اور ہمیشہ مجھے تنہا پاکر میرے قریب رہتے ہیں۔ میں
ان کے محبت والے اطوار اور ان کی دم کی پُرمعنی حرکت کو
بہت پسند کرتی ہوں۔

جب بارش کے دنوں میں مجھے گھر سے باہر نکلنا
نصیب نہیں ہوتا۔ تو میں دوسری لڑکیوں کی مانند اپنی تفریح
میں مشغول رہتی ہوں۔ مالا روانی کے طریق سے جو خود مجھے
مرغوب ہے۔ اِدھر اُدھر سے کسی کتاب کی کوئی ایک آدھ سطر
پڑھ لیتی ہوں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو میں کسی دوست کے ساتھ
شطرنج کی ایک دو بازیاں کھیلتی ہوں۔ اس قسم کی کھیلوں

کے لئے میرا ایک خاص تختہ بنا ہُوا تھا۔ جس میں مربعہ دار خانے کھود کر بنائے گئے تھے۔ تاکہ مُہرے ان کے اندر مضبوطی سے جمے رہیں۔ سیاہ مُہرے اُوپر سے چپٹے ہیں۔ اور سفید خمدار ہیں۔ ہر مُہرے کے وسط میں ایک سوراخ ہے۔ اس سوراخ کے اندر پیتل کی ایک تکمہ نما سلاخ اس غرض کے لئے ڈال دی جاتی ہے۔ کہ بادشاہ کو دوسرے مہروں سے تمیز کیا جائے۔ مُہرے دو علیٰحدہ علیٰحدہ قدوقامت کے بنے ہُوتے ہیں۔ یعنی سفید مہرے سیاہ مہروں سے بڑے ہیں پس ایک چال کے بعد مَیں اپنا ہاتھ آہستگی سے تختے پر پھیرتی ہوں۔ جس سے اپنے مدِّمقابل کی تمام تدابیرِ جنگ کو معلوم کرنے میں مجھے ذرا دقّت پیش نہیں آتی۔

اگر مَیں بالکل تنہا بیٹھی رہوں یا مَیں سست مزاج ہوں تو مَیں اکیلی بیٹھ کر تاش کی کھیل سولی ٹیر کھیلتی ہوں اس کھیل میں میرے پاس ایسے تاش کے پتّے ہیں جن میں ہر ایک کے بالائی 'دائیں کونے پر' بریل کے نشانات ہیں۔ یہ نشانات پتّے کی مالیّت کو ظاہر کرتے ہیں۔

اگر میرے اردگرد بچّے موجود ہوں تو مجھے اس سے زیادہ اور کسی چیز سے اتنی تفریح حاصل نہیں ہوتی کہ میں انکے ساتھ کھیل کھلاڑی کروں، مجھے ننّھے سے ننّھا بچہ بھی ایک اعلےٰ درجے کا رفیق معلوم ہوتا ہے۔ اور مَیں یہ بیان کرنے کو خوش ہوں کہ بالعموم بچّے مجھ سے رغبت کرتے ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں اور مجھے وہ اشیاء دکھاتے ہیں جن سے مجھے دلچسپی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ چھوٹے رفقا میری اُنگلیوں پر اپنے خیالات کو ہجّا کر کے ظاہر کر سکتے۔ لیکن مَیں ان کا مافی الضمیر ان کے لبوں کی حرکت سے پا لیتی ہوں۔ اگر مجھے اس میں ناکامی ہو تو وہ اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض اوقات جبکہ میں ان اشاروں کے سمجھنے میں غلطی کرتی ہوں اور مجھ سے کوئی غلط حرکت سرزد ہوتی ہے۔ تو اس پر بچوں کا ایک فرمائشی قہقہہ اڑتا ہے۔ اور سب طرف سے اشارے شروع ہو جاتے ہیں۔ مَیں اکثر انہیں کہانیاں سُناتی ہوں۔ یا کوئی کھیل سکھاتی ہوں۔ جس سے وقت کٹ جاتا ہے۔ اور ہم خوشی خوشی ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں۔

میرے لئے عجائب خانہ اور ذخائر فنون بھی بہت سی مسرّت اور واقفیّت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ بیشک یہ امر اکثر لوگوں کے لئے باعثِ تعجب ہوگا۔ کہ وہ ہاتھ جو بینائی کی امداد سے محروم ہے کس طرح بے جان مرمری نمونوں میں حُسن اور قوتِ عمل کا احساس کر سکتا ہوگا؟ بایں ہمہ یہ صحیح ہے کہ مَیں بڑی بڑی مصنوعات کو چھُو کر ان سے خالص مسرت حاصل کرتی ہوں۔ جب میری اُنگلیاں کسی صنعتی نمونے کے خطوطِ مستقیم اور منحنی کو گردش کر کے 'دریافت کرتی ہیں۔ تو وہ صنّاع کے اُن خیالات اور محسوسات کا پتہ لگا لیتی ہوں۔ جو اس نے نمونے میں ظاہر کئے ہیں۔ مَیں دیوتاؤں اور بہادروں کے

"HAZARDASTAN"

مس کلثوم امروزے خوب صورت والی کتاب پڑھ رہی ہے

مس کلثوم مس سلمیٰ اور ڈاکٹر ایڈورڈ ایورٹ دل

"HAZARDASTAN"

مومن کمار اور مس سلمہ ر

مس کمار اور ع۔ف توپر

چہروں پر نفرت، شجاعت اور محبت کے اظہار کو محسوس کر لیتی ہوں۔ بعینہٖ جیسے میں ان اظہارات کو زندہ چہروں سے معلوم کر سکتی ہوں جنہیں چھونے کا مجھ کو موقع ملتا ہے۔ میں روما کی شکار کی دیوی ڈائنا کی نشست سے جو اس کے نمونے میں دکھائی گئی ہے۔ جنگل کے حسن اور آزادی اور اُس رُوح کو دیکھ سکتی ہوں۔ جو پہاڑوں اور شیروں کو سدھا کر تند سے تند جذبات کو مطیع اور مغلوب کر لیتی تھی۔ میں حسن کی دیوی وینس کے پُرسکون اور ملائم خطوطِ سخنی کے ذریعے اپنی رُوح کو مسرت اندوز کر سکتی ہوں۔ اور باری کے تیار کردہ پیتل کے مجسموں سے مجھ پر جنگل کے اسرار ہویدا ہوتے ہیں۔

میرے مطالعہ کے کمرے میں یونانی نابینا شاعر ہومر کی اُبھری ہوئی نغمہ نما تصویر لٹک رہی ہے۔ وہ اتنی نیچے ہے کہ اس پر میرا ہاتھ سہولت کے ساتھ پہنچ سکتا ہے میں اس خوشنما تصویر کے افسردہ چہرے کو محبت آمیز احترام کے ساتھ چھوتی ہوں۔ میں اس کی رُعب دار بھوؤں کے ہر ایک خط سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ زندگی کے ایسے خطوط ہیں جو رنج والم اور کشمکش حیات کی تلخی کی شہادت دیتے ہیں اس کی وہ بے نور آنکھیں، ایک بے جان سالہ میں سے اپنے محبوب ملک یونان کے نیلگوں اور روشن آسمان کو بیفائدہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ کیونکہ وہ آسمان انہیں دکھائی نہیں دے سکتا۔ اس کے خوشنما مُنہ سے رُوح کی مضبوطی، صداقت اور ملائمت ٹپکتی ہے۔ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔ جو رنج والم کا لذت آشنا ہے۔ میں اس محرومیِ نظر کو اور اس دائمی شبانہ تاریکی کو جس میں اس کی زندگی بسر ہوتی تھی۔ بخوبی سمجھ سکتی ہوں۔ دوپہر کی بھڑکیلی روشنی میں اس پر ایک تاریکی کا عالم طاری ہے بقول محروم ع

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

یہ وہ تاریکی ہے کہ جس کا کوئی علاج ہی نہیں۔ یہ سُورج کے کامل گرہن کا سا سماں ہے۔ جس میں دن کی روشنی نظر آنے کی کوئی توقع ہی نہیں ہو سکتی۔

میں عالم خیال میں ہومر کو اس حالت میں گیت گاتے سُن سکتی ہوں۔ جبکہ متامل اور متزلزل چال کے ساتھ وہ ایک یونانی کیمپ سے دوسرے کیمپ تک اپنا راستہ ٹٹولتا جاتا ہے۔ زندگی، محبت، جنگ اور ایک شریف یونانی قوم کی شاندار فتوحات کے راگ اس کے وردِ زبان ہیں یہ ایک حیرت انگیز، شاندار نظم تھی۔ جس کی طفیل اس نابینا شاعر کو ایک غیر فانی عظمت کا تاج پہنایا گیا۔ اور تمام زمانوں میں اس کے کلام کی مدح و ثنا کی گئی۔

میں بعض اوقات حیران ہو کر یہ سوچا کرتی ہوں کہ معلوم نہیں فن سنگ تراشی کی خوبیوں کو پرکھنے کے لئے انسانی ہاتھ زیادہ کام کر سکتا ہے یا آنکھ، میرا خیال ہے کہ مجسموں کے

خطوط مستقیم اور منحنی کے کیفیت آفرین بہاؤ کو دیکھنے کی بجائے ٹٹولنے کے ذریعے سے، زیادہ باریکی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو میں اتنا جانتی ہوں کہ میں قدیم یونانیوں کے دلوں کی حرکات کو ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کے مرمری مجسموں کے ذریعے سے بخوبی محسوس کرتی ہوں۔

ایک اور مسرت جو دوسری خوشیوں کے مقابلے میں مجھے شاذ و نادر حاصل ہوتی ہے، تھیٹر[۵۱] میں جانا ہے

میں کسی ناٹک سے جبکہ اس کا کھیل ہو رہا ہو۔ اور مجھے اس کا پلاٹ بتایا جا رہا ہو۔ پڑھنے کی بہ نسبت اس کا زیادہ حظ اٹھاتی ہوں کیونکہ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں ہنگامہ خیز حالات میں زندگی بسر کر رہی ہوں۔ مجھے بعض بہت بڑے بڑے ایکٹروں سے ملاقات کرنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ جو ملنے والوں پر ایسا جادو کر دیتے ہیں کہ انہیں موجودہ حالات اور جگہ کا کوئی ہوش نہیں رہتا اور وہ گزشتہ زمانے کے افسانوں ہی میں محو ہو جاتے ہیں۔ مجھے مشہور مس ایلن ٹیری[۵۲] کے چہرے اور لباس کو ٹٹولنے کی اس وقت اجازت دی گئی تھی۔ جبکہ وہ سٹیج پر ملکہ بنی کھڑی تھی۔ اور اس کے سراپا سے ایسا جاہ و جلال ٹپکتا تھا۔ جس کے گرداگرد پُر عظمت رنج و ملال کا ہالہ معلوم ہوتا تھا۔ اسکے قریب سر ہنری اَرونگ[۵۳] بادشاہ کے روپ میں کھڑا تھا۔ اس کے ہر اشارے اور حرکت سے فہم و فراست کی عظمت اور اس کے نازک چہرے میں جس سے رنج و الم کوسوں دور تھا جو در اصل بناوٹی تھا۔ ایک شگفتگی پائی جاتی تھی جسے میں کبھی فراموش نہیں کروں گی۔

مجھے مشہور ایکٹر مسٹر جیفرسن سے بھی نیاز حاصل ہے اور میں انہیں اپنے احباب میں سے تصوّر کرتی ہوں جہاں کہیں

[۵۱] ہندوستان میں تھیٹر کی سیر اور ناٹک دیکھنا بے حد مذموم خیال کیا جاتا ہے لیکن یورپ اور امریکہ میں یہ ایک معزز فن کہلاتا ہے۔ جہاں اعلٰے تماشاگروں کا ایک ایک شب کا معاوضہ کئی کئی ہزار پونڈ ہوتا ہے۔ اور ان میں سے بعض کو اپنے کمال کے عوض حکومت کی طرف سے اعلیٰ خطاب ملتے ہیں۔ سر ہنری ارونگ سر بیر بھوم ٹری وغیرہ بہت پائے کے ایکٹر گزرے ہیں۔ اپنا اپنا مذاق ہے۔ مشرق بالخصوص ہندوستان کی سرزمین روحانیت سے مالامال ہے۔ اس لئے ایسے مشاغل کی یہاں وقعت نہیں ہو سکتی (مترجم)

[۵۲] تاریخ پیدائش ۱۸۴۸ء نامور انگریزی ایکٹرس ۸ سال کی عمر میں سٹیج پر آئی۔ بعد ازاں لندن کے مشہور تھیٹر لائی سیم میں کام کرتی رہی۔ (مترجم)

[۵۳] تاریخ پیدائش ۱۸۳۸ء تاریخ وفات ۱۹۰۵ء مشہور انگریزی ایکٹر تھیٹر کی زندگی ۱۸۵۶ء میں شروع کی۔ بعد ازاں ۱۸۷۸ء میں اس نے اپنا تھیٹر بنایا۔ شیکسپیر کے ناٹکوں میں شائیلاک اور ہملٹ کا روپ بھرنے میں بے مثل تھا۔ (مترجم)

مجھے ان کے تماشا کرنے کا علم ہوا، میں ضرور ان سے جا کر ملاقات کرتی ہوں۔ مجھے ان کا پہلا تماشا دیکھنے کا اتفاق اس وقت ہوا تھا۔ جبکہ میں نیویارک کے مدرسے میں پڑھا کرتی تھی۔ انہوں نے ایک ناول کے کیرکٹر رپ وان ونکل[51] کا سوانگ بھرا ہوا تھا۔ میں اس افسانے کو بارہا پڑھ چکی تھی لیکن مجھے رپ کے دھیمے عجیب و غریب رحیمانہ اطوار کبھی ایسے بھلے معلوم نہیں ہوتے۔ جیسے اس ناٹک کو دیکھنے سے۔ کیونکہ مسٹر جیفرسن کا خوشنما روپ اتنا موثر تھا کہ میں فرطِ مسرت سے بے خود ہوگئی۔ اور میری انگلیوں میں بڈھے رپ کا ایسا نقشہ کھنچ گیا جو کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ کھیل ختم ہونے پر مس سلیون صاحبہ مجھے سٹیج کے پیچھے ان سے ملاقات کرانے لے گئیں۔ اور میں نے ان کے عجیب و غریب لباس اور ان کے مصنوعی بالوں اور داڑھی کو ٹٹولنا شروع کیا۔ مسٹر جیفرسن نے مجھے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی اجازت دی۔ پس میں تصوّر کر سکتی تھی۔ کہ بیس سال کی نیند کے بعد بیدار ہو کر رپ کا کیا حلیہ ہوگا۔ اور وہ چونک کر کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہوگا۔ یہ سب مسٹر جیفرسن نے نقل کر کے بتایا

میں نے ان کو رقیب[52] کے ناٹک میں بھی کھیل دکھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ جبکہ میں بوسٹن میں انکی ملاقات کے لئے گئی۔ تو انہوں نے مجھے رقیب کا نہایت عجیب تماشا کر کے دکھایا۔ یعنی وہ اور ان کا فرزند ایک بڑی میز پر بیٹھ گئے۔ اور ان کے بیٹے نے بوب ایکٹرز کی حیثیت سے پیغامِ جنگ تحریر کرنا شروع کیا۔ میں ان کی تمام حرکات کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کرتی رہی۔ اور انکی دانستہ اور مضحکہ انگیز غلطیوں، اشاروں اور حرکات کو اسقدر بخوبی سمجھتی رہی کہ اگر وہ مجھے ہجا کر کے بتائی جاتیں تو انہیں سمجھنا ناممکن ہوتا۔ اس کے بعد دونوں رقیب آپس میں جنگ کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور میں ان کی تلواروں کے چابکدستی کے وار اور بچاؤ کی حرکات اور غریب بوب ایکٹرز کے تردّد اور پس و پیش کرنے کو سمجھ گئی۔ جبکہ اس نے کہا کہ "اب تو شجاعت میری انگلیوں کے سروں میں سے ٹپکنے لگی ہے۔" اس کے بعد اس بڑے تماشا گر نے اپنے کوٹ کو ایک جھٹکا دیا۔ اور

---

[51] واشنگٹن ارونگ، امریکن مورخ کی تصنیف ہے جس میں رپ وان ونکل ایک ولندیزی امریکن ہیرو ہے۔ سیر کرتا کرتا وہ کسی ایسی مجلس میں جا پہنچتا ہے۔ جو پہاڑ کے دامن میں مصروف مے نوشی ہے۔ رپ بھی شراب پیتا ہے جس سے اس پر نیند کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ بیس سال تک سویا رہتا ہے۔ اسکے بعد بیدار ہوتا ہے تو اسے امریکہ کی دنیا ہی نئی نظر آتی ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ملک ایک خود مختار ریاستوں کا مجموعہ ہے۔

[52] انگریزی ڈراما نویس شیریڈن کا ناٹک ہے۔ (مترجم)

ایسا سنہ بنایا کہ لحظہ بھر میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں فالنگ واٹر کے گاؤں میں پہنچ گئی ہوں۔ اور شینڈر کا گھنگھریالے بالوں والا سر میرے زانو کے ساتھ ٹکرا رہا ہے۔ مسٹر جیفرسن نے رپ وان ونکل کے بہترین سوال و جواب سنائے جن میں اگر ایک طرف مسکراہٹ تھی تو دوسری طرف آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے ان حرکات و سکنات کو ظاہر کرنے کے متعلق استدعا کی جو ان اشعار کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے ناٹک کی حرکات کا تو مطلق کوئی علم نہیں تھا۔ پس میں اٹکل کیساتھ محض قیاسی اشارے اور کنائے کر سکتی تھی لیکن اپنے کمال اور فن سے اس شخص نے قول و فعل کے مطابق کر دکھایا۔ رپ کا سرد آہ بھر کر یہ کہنا۔ کیا دنیا ایک شخص کو اس کی روانگی کے بعد اس قدر جلد فراموش کر دیا کرتی ہے؟" اس کا وہ خوف و ہراس جس کے ساتھ وہ نیند سے چونک کر اپنی بندوق اور کتے کو تلاش کرتا ہے۔ اور اس کا وہ ظریفانہ عدم استقلال جو وہ ایک اور شخص مسمی ڈیرک کے ساتھ عہد نامہ کرتے وقت ظاہر کرتا ہے۔ یہ تمام حرکات اصلی زندگی سے بہت دور دکھائی دیتی ہیں۔ میری مراد اصلی زندگی سے وہ زندگی ہے جس میں تمام واقعات ہماری مطلوبہ توقعات کے بموجب پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

مجھے اپنا پہلی مرتبہ تھیٹر میں جانا بخوبی یاد ہے۔

اس واقعہ کو بارہ سال گزر چکے ہیں۔ اس وقت ایک چھوٹی سی ایکٹرس مسی ایلزی لیزلی بوسٹن میں مقیم تھی۔ اور مس سلیون صاحبہ مجھے "شہزادہ اور گداگر" کے تماشے میں اس کا کھیل دکھانے کے لئے لے گئی تھیں۔ مجھے رنج و مسرت کی وہ متبادل کیفیات کبھی نہیں بھولیں گی۔ جو اس ننھے سے پر لطف تماشے میں سر بسر چل رہی تھیں۔ میں اس تعجب خیز بچی کو فراموش نہیں کر سکتی جو اس کھیل میں تماشا دکھا رہی تھی۔ کھیل ختم ہونے پر مجھے اس تماشا گاہ کی پشت کی طرف جانے کی اجازت دی گئی۔ جہاں میں نے اس ننھی ایکٹرس سے مع اس کی شاہانہ پوشاک کے ملاقات کی۔ ایلزی سے بڑھ کر کوئی پیارا اور قابل انس بچہ ملنا مشکل ہے۔ اس کے سنہری بال اس کے شانوں پر بادل کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ تکان یا شرمیلے پن کی کوئی علامت اس سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ ایک بہت بڑی مجلس کے روبرو اپنا کھیل دکھا رہی تھی۔ اس زمانے میں میں نے ابھی ابھی بولنا سیکھا تھا۔ اور اس سے قبل اس کا نام بار بار زبان پر لا چکی تھی۔ حتیٰ کہ میں اسے بخوبی بولکر بتا سکتی تھی۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جبکہ اس نے میرے وہ چند الفاظ سمجھ لئے۔ جن کے ساتھ میں نے اس سے خطاب کیا تھا۔ پس اس نے بلا تامل اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔

اے ناظرین کرام! کیا اب یہ حقیقت آپ پر واضح نہیں ہوگئی۔ کہ باوجود اپنی تمام معذوریوں کے میری زندگی اس حسین دُنیا کے بہت سے مشاغل میں مصروفِ کار رہتی ہے؟ یاد رہے کہ دُنیا میں ہر شے اپنے نوادر رکھتی ہے۔ حتےٰ کہ تاریکی اور خاموشی میں بھی ایک عجیب اثر ہے۔ اور میں ہر حال میں اس اثر سے قناعت کا سبق سیکھتی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات جب کہ میں عالمِ تنہائی میں بیٹھی ہوئی زندگی کے ان دروازوں (آنکھوں) سے کسی نامعلوم چیز کے لئے سراپا انتظار ہوتی ہوں، تو اس وقت مجھے دُنیا سے اپنی علیحدگی کا احساس ہوتا ہے ان دروازوں سے باہر نور، ترنّم اور کسی کی شیریں ہمنشینی کا حظ موجود ہے۔ لیکن میں اس سے محروم ہوں۔ آہ! ایک خاموش، بے رحم قسمت اس درّہ تاریکی کو عبور کرنے میں میری سدِّ راہ ہے۔ مَیں اس قسمت کے مغرور حکم پر بخوشی چون وچرا کر سکتی ہوں۔ کیونکہ میرا قلب، باوجود تعلیم یافتہ ہونیکے اب بھی جوش اور اکھڑپن کے جذبات سے خالی نہیں لیکن وائے بدنصیبی کہ میری زبان ان تلخ اور بیکار الفاظ کو بولنے سے قاصر ہے۔ جو دل سے اُٹھ کر زبان کی طرف آتے ہیں۔ پس وہ الفاظ ان بہے آنسوؤں کی طرح لوٹ کر پھر دل میں آجاتے ہیں! پھر امید اپنے چہرے پر ایک مُسکراہٹ لئے ہوئے نمودار ہوتی ہے اور میرے کان میں یہ الفاظ پھونکتی ہے۔ "دیکھو! خود فراموشی میں بھی ایک لطف ہے!" پس مَیں کوشش کرتی ہوں کہ اسی روشنی کو اپنا نور قرار دوں۔ جو دوسروں کی آنکھوں میں جلوہ فگن ہے۔ میں اسی موسیقی کو اپنا نغمہ و سرود بناؤں، جو دوسرے لوگوں کے کانوں میں پہنچتی ہے۔ اور دوسروں کے لبوں کے تبسّم ہی سے اپنی راحت کا سامان بہم پہنچاؤں۔

(باقی آئندہ)

خادم محی الدین

گلکاریِ داماں

(۱)

کوئی تدبیرِ ملاقات جہاں بھر میں نہیں
ہم سمجھتے ہیں ترا وصل مقدر میں نہیں

بے سبب آج پریشانیِ خاطر کیوں ہے
اور کیا بات ہے سودا جو کوئی سر میں نہیں

یہ شبِ ہجر کی حالت ہے الٰہی توبہ
روشنی آج کہیں دیدۂ اختر میں نہیں

پوچھ گلکاریِ داماں کی حقیقت مجھ سے
یہ ہیں وہ نقش جو بُت خانۂ آذر میں نہیں

تیری اُتری ہوئی پوشاک میں پائی ہم نے
وہ لطافت جو کسی حور کے پیکر میں نہیں

لوگ کیوں چاند کو بدنام کیا کرتے ہیں
اس میں کیا ہے جو ترے چہرۂ انور میں نہیں

کیا دلآویز ہے ساقی کے تغافل کی بہار
لطف جو حسرتِ ساغر میں ہے ساغر میں نہیں

(۲)

ابھی سے ہے مصیبت پر مصیبت دیکھئے کیا ہو
یہ ہے آغاز تو انجامِ اُلفت دیکھئے کیا ہو

خدا جانے نظر ٹھہرے نہ ٹھہرے روئے رنگیں پر
بہارِ حسن کا رنگِ لطافت دیکھئے کیا ہو

وصالِ یار میں دل کو سکوں حاصل نہیں ہوتا
یہ عالم ہے تو رنگِ شامِ فرقت دیکھئے کیا ہو

جلال الدین اکبر

کیفیات

دلِ محزوں یہی ہوگا شبِ غم کی سحر ہوکر
امیدیں تیری مٹ جائیں گی مایوسِ اثر ہوکر

کوئی تاثیر تو دیکھے مرے سوزِ محبت کی
رہی دامانِ شب میں آہ تصویرِ سحر ہوکر

نہ ہو احساس یارب اپنی بے برگ و نوائی کا
گزر جاؤں میں راہِ زندگی سے بے خبر ہوکر

بھروسا تھا مجھے پائے تمنا کی جو ہمت پر
پھرا دشتِ بلا میں آپ اپنا راہبر ہوکر

خدا ایسا کرے میری دعائے بیکسی اک دن
اُتر جائے ترے سینے میں تصویرِ اثر ہوکر

نہ آجائیں وہ یارب وقتِ آخر میری بالیں پر
نہ رہ جائے کہیں دنیا سے سامانِ سفر ہوکر

جہانِ غم کے سب جھگڑے تھے بس اک آہِ سوزاں تک
ہُوا کیا ختم قصہ زندگی کا مختصر ہوکر

مجھے تو کنجِ تنہائی کی عادت ہوگئی یارب
نہیں معلوم کیا ہوگا قفس میں بال و پر ہوکر

مرے پائے طلب کا جوشِ ہمت خوب کام آیا
رہیں ناکامیاں بھی ساتھ سامانِ سفر ہوکر

سماں ہی تھا کچھ ایسا بیخودی کا اس کی محفل میں
کہ میری بیقراری کھو گئی شوقِ نظر ہوکر

تمہارے حسن کے صدقے میں دامن اُسکا بھر جائے
نگاہِ شوق اٹھی ہے مری دریوزہ گر ہوکر

گھٹیں دل میں عجب صورت سے امیدیں رہائی کی
بڑھا اُنسِ قفس یعنی خیالِ بال و پر ہوکر

شعاعیں آہِ آتشبار کی قائم نہیں رہتیں
شبِ فرقت میں مٹ جاتے ہیں آثارِ سحر ہوکر

بھروسا بسکہ ہے جوشِ توقع پر محبت میں
مرے دل میں رہیگا طولِ غم بھی مختصر ہوکر

میں اُن کو دیکھ کر رونے لگا جوشِ طبیعت سے
تمنائیں مری نکلیں فریبِ چشمِ تر ہوکر

شبِ غم کی مصیبت کٹ بھی جائیگی مگر ہادی
مرا بچنا بہت مشکل ہے مایوسِ سحر ہوکر

ہادی مچھلی شہری

تخیّلات

ٹھکانے لگ گئی محنت جنونِ فتنہ ساماں کی
کفن کے کام آئیں دھجیاں میرے گریباں کی

بلا سے جاں ہوا میرے لئے ذوق نمکپاشی
مناؤں خیر اب زخموں کی یا ان کے نمکداں کی

نکلنا جیتے جی مشکل ہے اے ناوک فگن اس کا
کہ اب گھل مل گئی دل کے لہو میں نوک پیکاں کی

تہ و بالا کئے دیتی ہیں دنیائے تمنا کو
وہ طوفاں خیز ہیں موجیں تبسّم ہائے پنہاں کی

تغافل چھوڑ دے ظالم کہ اب ہر دم ضرورت ہے
مری ایذا پسندی کو ترے جورِ نمایاں کی

ترا وحشی نئی صورت کی زنجیریں بناتا ہے
بٹا کرتا ہے بیٹھا دھجیاں اپنے گریباں کی

مری آزادیاں پابندیوں پر جان دیتی ہیں
پھرا کرتی ہے آنکھوں میں مری تصویر زنداں کی

لہو کھینچ کھینچ کے ہر عضوِ بدن کا آگیا دل میں
تواضع ہو سکی پھر بھی نہ ان کے تیرِ مژگاں کی

کسی کے اعتبارِ وعدۂ فردا پہ مرتا ہوں
یہ کہتے کہتے نبضیں چھٹ گئیں بیمارِ ہجراں کی

گری ہیں نجد کے دامن میں جا کر کیا ٹھکانہ ہے
کہاں پہنچی ہیں اُڑ کر دھجیاں میرے گریباں کی

نالِ سوزِ فرقت ہے دلیل راہِ الفت ہے
اندھیرے میں لئے بیٹھا ہوں مشعل داغ ہجراں کی

کرونگا اعتبار بدگمانی اب نہ جیتے جی
قسم ہے آج سے مجھ کو ترے عہدِ پشیماں کی

نکلتی ہیں مری ہر آہ سے چنگاریاں بسمل
جلائے ڈالتی ہیں دل کو لپٹیں سوزِ پنہاں کی

حکیم عبد العلی خاں بسمل (فرخ آبادی)
تلمیذ حضرت ہادی (مچھلی شہری)

خوشی کے چند لمحے

دُنیا کی بعض عمارتیں ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور بعض ہم میں ایک پُرلطف احساس پیدا کرتی ہیں۔ غار ہائے اجنٹا میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ یہ قدیم عبادت گاہ اپنی سنگ تراشی، نقاشی اور تاریخی عظمت کے لحاظ سے جو عالمگیر شہرت رکھتی ہے وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ یہ غار دُنیا کے ان چند بے نظیر اور غیر فانی آثار ہیں ہیں، جو زائرین کے دل و دماغ کو مسحور کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور دُنیا کے سیاحوں کی چشم بصیرت کے سامنے بنانے والوں کی عظمت اور ان کے قومی تمدن و تہذیب کا بہترین و دلپذیر ترین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے اہل ذوق میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان غاروں کے قدرتی منظر کی نیرنگی و دلپذیری سے تو کجا خود ان کی جائے وقوع سے واقف ہوں۔ دو متوازی پہاڑوں کا سلسلہ حسینانِ عالم کی زلف کی طرح چم و خم دکھاتا ہوا دور تک چلا گیا ہے۔ اور سیاح کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ یہ پہاڑ ڈھلوان نہیں ہیں۔ بلکہ کسی سر بفلک قلعہ کی کوہ پیکر دیواروں کی طرح ان کی چٹانیں سیدھی کھڑی ہیں۔ اور ان کے درمیان ایک ندی ان کے دامن میں لپٹتی ہوئی ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ ایک مقام پر یہ دونوں پہاڑ نصف دائرہ کی شکل بنا کر مل گئے ہیں۔ یہی وہ خاموش اور پُرسکون جگہ ہے۔ جس کو دو ہزار برس پیشتر بودھ کے پجاریوں نے گیان دھیان کے لئے پسند کیا تھا۔ اور جو آج بھی چشم عالم کو اپنے پجاریوں کے زہد و ورع کا نقشہ دکھلانے کو موجود ہے۔

یہ حقیقت کدہ جو کسی زمانہ میں صوری و معنوی علوم کا گہوارہ تھا۔ اب تک کسی نہ کسی عنوان اپنے ہر مہمان کی میزبانی کرتا ہے۔ دُور دراز کے تھکے ماندے سیاح کو فرحت، گرمی میں بولائے ہوئے چرند و درند کو پناہ، پیاس سے بیتاب انسان و حیوان کو صاف چشمہ کا شیریں پانی، نباتات کو غیر معمولی نمو، ارباب تحقیق کو غور و فکر، مذہب کو عقیدہ و ارادہ کا زور، سرکشوں کو عاجزی و نگونساری اور اہلِ دول کو عبرت و فنا کی تعلیم، صنّاعوں مصوروں اور نقاشوں کو چابکدستی کا سبق، شعراء کو تخیل، آواز کو موسیقی اور گونج، نظر کو کشش، آبِ رواں کو اٹھکیلیاں، پہاڑوں کو سلیقہ، کُرّہ زمین کو فخر، روزِ روشن کو خوبصورتی اور اندھیری رات کو ہیبت بخشتا ہے۔ اور یہ اسکی فیاضیاں

ایک دو روز کی نہیں، بلکہ دائمی ہیں۔ جنہیں قدرت کے جبروتی ہاتھوں کے سوا اور کوئی نہیں چھین سکتا۔

مَیں کبھی کبھی اس قطعہ ارض کی سیر کو جایا کرتا تھا اور خدا جانے کیوں ہمیشہ اس کی سیر کے لئے دل بے چین رہا کرتا ہے۔ ایک مرتبہ فردا پور سے گھوڑے پر سوار ہو کر اس اُجڑی نگری کی طرف نکل گیا۔ میرے ساتھ ایک دہیز بھی تھا۔ فردا پور سے غار دو میل کے فاصلہ پر ہیں۔ گو یہ راستہ بہت ناہموار اور دشوار گزار ہے۔ مگر اس کے کنارے کے قدرتی مناظر اس قدر دلچسپ اور دلپذیر ہیں کہ مسافت طے کرنے میں کوئی کلفت نہیں ہوتی۔ دوپہر کا وقت تھا کہ ہم اس پُر فضا گھاٹی کو طے کر کے اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ دوران سفر میں میرے ساتھی نے جسے مَیں بالکل جاہل سمجھتا تھا۔ اور اب بھی سمجھتا ہوں کئی بار اپنی تاریخ دانی کا ثبوت دینا چاہا۔ مگر آخر کار میری بے اعتنائی اور ازخود رفتگی دیکھ کر سمجھ گیا۔ کہ مجھے اس کی تاریخی معلومات سے مستفید ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ اور خود اُس کے قریب ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔

مَیں کوئی گھنٹہ بھر غاروں میں پھرتا رہا۔ اس سے پیشتر کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا لیکن کبھی اس پہاڑ کے اوپر چڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس مرتبہ نہ معلوم کیا جی میں آئی۔ کہ اُوپر چڑھ گیا۔ یہ جگہ سطح زمین سے تقریباً ایکہزار فٹ بلند تھی، پہاڑ کے دونوں طرف پندرہ پندرہ میل تک نظر کام کرتی تھی۔ اور اس تمام دلکشا میدان میں سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ یہ زمردیں فرش کچھ ایسا بھلا معلوم ہوا کہ مجھ پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اور میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہوا کے پاکیزہ سرد جھونکوں نے سفر کی خفیف سی تکان کو فرحت و انبساط سے بدل دیا۔ دل میں ایک سرور پیدا ہوا۔ اور اس وقت مَیں خیال کرنے لگا۔ کہ درحقیقت انسانی زندگی کا ہر دن اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے عمرِ عزیز میں شمار کیا جائے، آج کا دن میرے ان چند مسرت بخش دنوں میں سے ایک دن ہے جو اب تک مجھے اپنی تمام عمر میں نصیب ہوئے ہیں۔ اسی خیال میں غلطاں و پیچاں تھا کہ سامنے لگروندوں کے جھنڈیں سے ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ اس پیرِ فرتوت کا سن کوئی ساٹھ پینسٹھ برس کا ہو گا۔ لیکن قوی خاصے مضبوط، جسم توانا، ڈیل ڈول خاصا تندرست جوانوں کا سا اپنے جسم پر ایک پھٹا پرانا سا کمل اوڑھے ہوئے تھا۔ داڑھی اور سر کے بال لمبائی میں تقریباً برابر تھے۔ غرض ہیئت مجموعی ایک نہایت عجیب الخلقت انسان نظر آتا تھا۔ جسے دیکھ کر ہماری شہری متمدن دُنیا کا کوئی انسان ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شخص میرے قریب آ گیا۔ مَیں

اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس خیال سے کہ شاید مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ "کیوں! تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ میں جہاں پہنچ جاؤں وہیں جانا چاہتا ہوں۔ میری کوئی خاص منزلِ مقصود نہیں آج میں یونہی تفریح کیلئے اس پہاڑ پر چڑھ آیا تھا۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کے دوسری جانب کیا ہے؟"

پھر اس نے ایک عالمانہ متانت کے لہجہ میں اور ایک خاص اندازِ مسرت سے کہا۔ "یہ دن زندگی میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ یک صبح چمن روزگار سے خوشتر"

یہ سُنکر میرے خیالات میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ آج حسنِ اتفاق سے مجھے ایک نادر موقع میسّر آگیا ہے۔ ورنہ ہر روز ایسا نہیں ہوتا۔ کہ کوئی صاحبِ علم اہل بصیرت گدڑی میں خوش مل جائے۔ میں اس بُوڑھے عالم کو یہاں ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر اسی چٹان پر بیٹھ گیا بُوڑھا اجنبی بھی میرے برابر بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک تھیلی میں سے کچھ گولر نکال کر اپنے سامنے رکھے۔ پھر ہم نے ان مسائل پر گفتگو شروع کی جو عموماً ہر انسان کے دل میں چٹکیاں لیتے رہتے ہیں یعنی یہ کہ راحت کہاں اور کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ اور رُوح کا انجام کیا ہوگا۔

ان مباحث پر اُس کے خیالات نہایت صحیح، عمیق اور منصفانہ پائے گئے۔ کلام کا آغاز اس طرح ہُوا:۔

مَیں نے کہا کہ "مَیں بھی آج اس قدر خوش ہُوا ہوں کہ اپنی خوشی کے اظہار کے لئے مجھے کافی الفاظ نہیں ملتے۔ جب مَیں (نیچے کی طرف اشارہ کر کے) ان غاروں کی طرف آرہا تھا۔ تو راستہ کے لطیف مناظر نے میری رُوح میں شعریت پیدا کر دی۔ اور مَیں نے "نشاط" پر ایک نظم لکھنے کا ارادہ کیا۔ بلکہ دو ایک شعر بھی دل ہی دل میں کہہ لئے لیکن میرے لئے خوش ہونا آسان تھا۔ کیونکہ مَیں گھوڑے پر سوار تھا۔ اور صبح کو بہت عمدہ ناشتہ کر کے روانہ ہُوا تھا۔ مگر پھر بھی مَیں دیکھتا ہوں کہ اس قسم کے دن میرے لئے خواب و خیال ہیں۔ گو مجھے نصیب ضرور ہوتے ہیں مگر اتنے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور باقی تمام دنوں سے اسقدر مختلف ہیں کہ مَیں کبھی انہیں بھول نہیں سکتا۔"

اجنبی۔ آپ کا آخری جملہ بالکل صحیح ہے۔ آپ کی زندگی کے یہ چند دن معمولی دنوں سے واقعی بالکل مختلف ہیں لیکن آپ کا یہ خیال غالباً صحیح نہیں ہے کہ گھوڑے کی سواری، لذیذ کھانا، ملازم کی ہمرکابی یا اور اسی قسم کے لوازمات ان خوشی کے دنوں سے کچھ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بیشک درست ہے کہ دولت کے نشے میں ہمارے ایام اس طرح گزر جاتے ہیں کہ خبر نہیں ہوتی۔ اور افلاس ان کو

کٹھن اور دشوار بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہُوا کہ افلاس سے رُوح پر مایوسی طاری ہوگئی ہو۔ وہ لوگ جو خودکشی کرتے ہیں، نہ دولتمند ہوتے ہیں نہ مفلس، خوشی کے ان قیمتی لمحات کو دولت نے بہت کم خریدا ہے۔ جو کبھی کبھی مجھے نصیب ہوتے ہیں۔ حالانکہ (ایک گولر کو آدھا کتر کر) خدا جانتا ہے۔ مَیں اس وقت ایک حبّہ برابر شے خریدنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتا۔"

مَیں۔ "اچھا تو یہ فرمائیے۔ کہ یہ خوشی کے لمحات کہاں سے آتے ہیں؟ ــــ اور ایک گولر مجھے بھی عنایت کیجئے۔"

اجنبی۔ "بڑی خوشی سے، بلکہ دو لیجئے۔ یہ بالکل پکّے ہیں۔ ہاں تو آپ کے دوسرے سوال کا جواب، میرے خیال میں جنّت کا دروازہ وقتاً فوقتاً کسی قدر کھل جاتا ہے اور اس کے کھلنے اور بند ہونے کے دوران میں بہشتی ہوا کا کوئی جھونکا باہر آجاتا ہے۔" یہ جملہ اس نے ایک متانت آمیز انداز میں کہا۔ اُس کی آنکھیں احساسِ مسرت سے چمک اُٹھی تھیں۔ اور اس کی سفید داڑھی کے بال ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ پھر اُس نے کہا۔ "وہ شخص جو کسی بڑے شہر میں کسی دولتمند کا غلام ہے اگرچہ نہایت بدنصیب انسان ہے۔ مگر یہ خوشی کے لمحات اس حریص دولتمند کو بھی کبھی کبھی مل جاتے ہیں۔ جس کے چہرہ پر ہر وقت کی پریشانی اور تشویش نے جھرّیاں ڈال دی ہیں۔ یہ آپ کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور آپ اُن لوگوں میں ہیں، جو بقولِ خود دُنیا کے کام کاج میں مصروف ہیں۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ یہ مصروفیّت دوسروں کی طرح آپ کو بھی پریشانی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اور یہ لمحات مجھے بھی نصیب ہوتے ہیں۔ جسے نہ کوئی کام ہے۔ اور نہ کوئی تشویش و پریشانی ہے۔ جب تک کہ گولر ہندوستان سے باہر نہیں بھیجا جاتا۔"

مَیں۔ "آپ کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور مَیں کہتا ہوں کہ آپ ضرور گولر کھایا کیجئے! یہ صحت کے لئے بہت مفید ہیں۔ ان سے نیند بہت اچھی آتی ہے۔ ان کے بھنگوں سے آنکھوں میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ قناعت کے سبب ہیں۔ اور انسان کے لئے بہشتی میوے!"

اجنبی۔ "مَیں ہمیشہ کہا کرتا ہوں۔ کہ جب حضرت آدمؑ اور حوّا جنّت سے نکالے گئے تو وہ ایک گولر اپنے ساتھ چھپا لائے تھے۔ اس کا پھول اہلِ جنّت کو اس قدر پسند ہے۔ کہ اب تک فرشتے اس کو ہماری زمین کی ہوا نہیں لگنے دیتے۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہُوئی کہ اس نمائش پرست دُنیا میں میرے سوا ایک شخص اور بھی ہے جو گولر کی کماحقہ عزّت کرتا۔ اور دل میں اس کی محبت رکھتا ہے۔ ایسے لوگ دُنیا میں شاذ ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔"

پھر اُس نے کسی قدر متفکّر لہجے میں پُوچھا۔ "اجنبیا یہاں سے

کتنی دُور ہے۔ اور وہاں کوئی سرائے ایسی ہے۔ جس
میں مجھ جیسے آدمی کو ٹھکانا مل جائے؟"
مَیں۔ اغلباً یہاں سے کوئی چار پانچ میل کے فاصلہ
پر ہوگا۔ اور ہاں ایک سرائے وہاں ہے۔ اُس میں
خاصا آرام مل سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس کرایہ ادا
کرنے کے لئے کچھ پیسے ہیں؟ مَیں کچھ آپ کی خدمت میں
نذر کر دوں؟"
اجنبی (نہایت خوشی مگر وقار کے ساتھ) ہاں جتنے آپ
بہ آسانی دے سکتے ہوں۔"
مَیں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ صرف دو روپے
سات آنے نکلے۔ "یہ لیجئے دو روپے سات آنے
ہیں۔"
اجنبی (روپے اور ریزگی ایک دھجّی میں لپیٹتے ہوئے)
"تسلیم، اچھا تو اب رخصت۔"
مَیں۔ میری خواہش تھی۔ کہ ہم پھر کبھی ملیں۔ اور بہت سے
معاملات پر گفتگو کریں۔ یہاں تک تو ہم دونوں
متفق ہیں۔ آپ اور مجھ جیسے لوگ اس دنیا میں اکثر
تنہا رہتے ہیں۔ کبھی کسی ہمخیال سے مل بیٹھنے کا
اتفاق ہوتا ہے۔"
اجنبی نے میری طرف دیکھا۔ اور سنجیدگی سے
سر ہلایا۔
"نہیں! یقیناً ہم دونوں دوبارہ کبھی نہیں
ملیں گے۔"
بوڑھے سیّاح نے آگے بڑھ کر پھر بڑی
گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور جلدی جلدی قدم
اُٹھاتا ہوا سامنے کے جھنڈوں میں دیکھتے ہی دیکھتے
غائب ہوگیا۔

غلام ربانی
اورنگ آباد دکن

جذبات

منت کشِ نسیم سحر یہ چمن نہیں
پژمردہ دل میں ایک بھی زخم کہن نہیں

کیا مطمئن ہو جلوہ ترا چشمِ غیر میں
ہر دامنِ نگاہ سوادِ وطن نہیں

ہر روئے گل میں باغِ جناں کی ہے کب بہار
ہر گیسوئے سیاہ کا دامن ختن نہیں

مایوسیوں نے سارے زمانے سے کھو دیا
وہ ہم نہیں وہ دل نہیں وہ انجمن نہیں

اے وحشتِ جنونِ محبت خدا گواہ
تو ہے اگر تو مجھ کو غمِ پیرہن نہیں

جس دن سے مٹ گیا ہے مرا نقشِ آرزو
وہ رونقِ بہار و طرازِ چمن نہیں

تصویرِ دل ہے یوں تو مری ہر نگاہِ یاس
البتہ چشمِ تر میں فریبِ سخن نہیں

منصوریوں تو سینکڑوں مل جائینگے مگر
وہ میہماں نوازیِ دار و رسن نہیں

گلزارِ آرزو میں ہیں کانٹے بھی بے شمار
ہر مرکزِ نگاہ گل و یاسمن نہیں

واقف نہیں کوئی مرے سوز و گداز سے
بے بہرہ ہے جو شمعِ سرِ انجمن نہیں

رغبت ہوئی نہ خندۂ گل سے مجھے کبھی
ازبسکہ اُس میں رنگِ دلِ پرمحن نہیں

پھولوں سے کم نہیں دلِ بلبل کے زخم بھی
کیونکر کہوں کہ کنجِ قفس میں چمن نہیں

نازاں میں اپنی ہمتِ پائے طلب پہ ہوں
صحرا میں سر کو پھوڑ لوں کچھ کوہکن نہیں

دل محشرِ خیال ہے اس میں وہ کیا رہیں
ہادیؔ یہ کوئی بزم نہیں انجمن نہیں

ہادی مچھلی شہری

کوہسار شملہ

(مولانا تاجور نے یہ نظم انجمن کے جلسۂ شملہ کے لئے اثنائے سفر میں لکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مختلف مناظر کا ایک مرقع ہے جو انکی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے آتے۔ تاہم کیفیتِ قلب چونکہ شروع سے لے کر اخیر تک ایک ہے۔ اس لئے اس کے اجزا میں ایک معنوی ربط پیدا ہوگیا ہے، جو اس قسم کی نظموں میں خارجی مناظر کے تسلسل سے کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔
اس نظم کا کچھ حصّہ رسالہ ہمایوں میں چھپ چکا ہے لیکن بصورتِ موجودہ مکمل ہے) ایڈیٹر

ہمالیہ پہاڑ کی بلندیوں کے سلسلے!! نپولین کے حوصلے پہاڑیوں کے سلسلے!!
پہاڑ در پہاڑ ہیں زمیں سے لے کے تا فلک یہ سیڑھیوں کا سلسلہ ہے بامِ آسماں تلک
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

پلین میں برس رہی ہو آگ تو پہاڑ چل! پلین کی فضائے آتشیں کو چھوڑ چھاڑ چل!
بلندیوں پہ چڑھ کے لطفِ سیرِ کوہسار دیکھ! پہاڑ چل پہاڑ! کوہسار کی بہار دیکھ!
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

کالکا سے شملے کو روانگی

بلندیوں کے دیکھنے کی آرزو نکل گئی بڑھی جو کالکا سے ریل سینری بدل گئی
یہ جانفروز چاندنی یہ دل نواز چاندنی پہاڑیوں سے کر رہی ہے ساز باز چاندنی
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

کہیں ہے میل ریل میں کہیں ہے کھیل ریل میں مسافروں کی ہو رہی ہے ریل پیل ریل میں
یہ سینری نظر پڑی تو کھیل ویل چھوڑ کر ادھر کو جھک پڑے ہیں سارے شغل ایل چھوڑ کر
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

سرنگ اور ریل

نگاہیں محو تھیں کہ ریل آگئی سرنگ میں ہو جیسے دوست دل میں یوں سما گئی سرنگ میں

سرنگ میں چلی ہے سین کیا، کھارہی ہے ریل　　کہ جیسے سانپ بل میں آرہا ہو جارہی ہے ریل

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

سرنگ ہے کہ خلوتِ دلِ سیاہ کار ہے　　سرنگ ہے کہ ہیبت شبِ فراق یار ہے

سرنگ میں ہے ریل جیسے بیقرار خواہشیں　　مچل رہی ہوں دل میں دیکھ کر کہیں نوازشیں

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

وہ رنگ بھی بدل رہی ہے ریل سین دیکھئے!　　سرنگ سے نکل رہی ہے ریل سین دیکھئے!

سرنگ سے چلی ہے جیسے کوئی گرمِ جستجو　　چلا ہو غمکدے سے اپنے لے کے دردِ آرزو

یہ سین تیرا اے پہاڑ کس قدر حسین ہے!!

غار

یہ گہرے گہرے کھڈ یہ خوفناک غار دیکھئے!!　　ضرور یہ مہیب سین ایک بار دیکھئے!!

خدا تیری پناہ! غار ہیں کہ بے شمار ہیں!!　　الٰہی الاماں یہ غار ہیں کہ جاں شکار ہیں!!

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

پہاڑ کی بلند آسماں وقار چوٹیاں　　ہیں صنع صانع ازل کی شاہ کار چوٹیاں

فلک سے ہمسری کے ولولے تھے منجمد ہوگئے ہیں کیا؟　　زمیں کے حوصلے بلند ہو کے جم گئے ہیں کیا؟

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

ریل سے ماہتاب کا نظارہ

یہ دل لگی یہ کود پھاند اے پہاڑ چاند کی　　یہ ریل کے مسافروں سے چھیڑ چھاڑ چاند کی

کبھی ادھر چمک گیا کبھی اُدھر نکل گیا　　اِدھر اُدھر چمک کے اپنی سمت پھر بدل گیا

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

نکل رہا ہے چودھویں کا چاند آسمان پر　　پہاڑیوں پہ چاند کھیت کررہا ہے شان پر

پہاڑیاں چمک رہی ہیں کیسی آن بان سے　　برس رہا ہے چودھویں کا چاند آسمان سے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

پہاڑی لوگوں کے گیت

پہاڑیوں کے گیت سے ہیں وجد میں پہاڑیاں　　درخت مست بے طرح ہیں جھومتی ہیں جھاڑیاں
فضا میں نشہ تیرتا ہے جس سے رات مست ہے　　میں مست ہوں کہ آج رات کائنات مست ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

دُھوپ

یہ کون جلوہ گر ہے اے پہاڑ تیری دُھوپ میں　　ہے کس کا حُسن جلوہ ریز اس سنہری روپ میں
چمک رہا ہے گوشہ گوشہ جس سے شش جہات کا　　دمک رہا ہے ذرّہ ذرّہ تیری کائنات کا

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

شام

ہے کتنا دل گداز سین غم فشار شام کا　　ہے چہرہ کس قدر حسین افق نگار شام کا
افق نگار شام کیا شفق سے لالہ فام ہے　　شفق سے لالہ فام شام دلفروز شام ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

دھنک کمان

حسینۂ فلک کی کیا یہ قوسِ ہفت رنگ ہے!!　　کہ اس کے رنگ دیکھ کر ہر اک کی عقل دنگ ہے!!
یہ سین یہ حسین سین اِک بلائے ہوش ہے　　دھنک کمان کا نظارہ بیخودی فروش ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

چیل کے درخت

یہ چیل کے درخت ہیں ستونِ سقفِ بے ستوں　　یہ چیل کے درخت ہیں حریفِ چرخِ نیلگوں
برس رہی ہے دلکشی قدِ فلک شگاف پر　　خطوطِ مستقیم ہیں فضا کی سطح صاف پر

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

حسین فطرت اس چمن میں بے نقاب ہوگئی یہ بے نقاب ہوگئی کہ لاجواب ہوگئی

نقابِ رخ اُٹھادیا دلوں پہ قہر ڈھا دیا خدا پرست مولوی کو نیچری بنا دیا

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

ناجور

کلام میر

ہے دردِ محبت بے درماں کیا فایدہ زحمتِ مسیحا سے عیسےٰ بھی عیادت کو آتے بیمار ترا اچھا نہ ہُوا

عزت سے گیا حرمت سے گیا انصاف یہ ہے شیدا تیرا دل دے کے غلام ہُوا تیرا اے جانِ جہاں شیدا نہ ہُوا

ہے قحطِ رجال زمانے میں اس دور کے شیر بھی روباہ ہیں مدت سے ہے دنیا چشم براہ کوئی مردِ خدا پیدا نہ ہُوا

آزاد جسے تم کہتے ہو ممکن ہے کہ وہ آزاد نہ ہو آزاد حقیقت میں ہے وہی جو بندۂ حرص و ہوا نہ ہُوا

ہم د. یہ بُتوں کے جاتے ہیں سر سامنے ان کے جھکتے ہیں مسجود ہُوتے لاکھوں اپنے معبود جب ایک خدا نہ ہُوا

ہر جزو کی عزت کل میں ہے جب قطرہ ہُوا قطروں سے جُدا موتی بھی ہُوا شبنم بھی ہُوا آنسو بھی ہُوا دریا نہ ہُوا

سچ کہتے ہیں وہ اے میرؔ کہ ہے محتاج دلیل ترا دعویٰ

یہ عشق کہاں کا عشق ہے تو عاشق تو ہُوا رسوا نہ ہُوا

میر ولی اللہ

شفق

بہارِ صبح عجب دلفروز منظر ہے ہوائیں مشک فشاں ہیں فضا معطر ہے

شفق کے رنگ سے لبریز چرخ اخضر ہے کوئی کہے کہ یہ موج شراب احمر ہے

چھلک پڑے ہیں ستاروں کے جام بلوریں

تو سطح چرخ ہُوئی ہے شراب سے رنگیں

یہ خواب ہے کہ طلسم خیال ہے؟ کیا ہے؟ ریاضِ خلد کا رنگِ جمال ہے؟ کیا ہے؟
یہ روز و شب کا مقامِ وصال ہے؟ کیا ہے؟ مری نگاہ کی حدِ کمال ہے؟ کیا ہے؟

بلندیوں پہ یہ رنگیں مکان کیسا ہے
جہان بھر سے انوکھا جہان کیسا ہے

طلسمِ رنگ کہے، مستیِ بہار کہے رُخِ نگار کہے، قصرِ زرنگار کہے
بلند بام کہے، آسماں وقار کہے جو دیکھ لے کوئی شاعر تو لالہ زار کہے

فروغِ نور سے کل کائنات رنگیں ہے
مگر عروسِ فلک کو خیال تزئیں ہے

ہے سطحِ آب کی گہرائیوں میں طورِ شفق بہارِ موج پہ رقصاں ہے عکسِ نورِ شفق
ہر ایک چیز ہے غرقِ مئے طہورِ شفق ہر ایک چیز پہ طاری ہُوا سرورِ شفق

چھلک رہی ہے یہ مینائے رنگ و بو گویا
شراب نوش ہے دُنیائے رنگ و بو گویا

شفق کا سُرخ سا آنچل نظر کی جنّت ہے وہ رنگ ہے کہ عیاں رنگِ حسنِ فطرت ہے
لطافتوں میں شفق حاصلِ لطافت ہے ہجومِ کیف ہے دِل پر وفورِ عشرت ہے

تاثرات ہجومِ سرور میں گم ہیں
تصوّرات ہجومِ سرور میں گم ہیں

کسی کی یاد ہے دُنیائے دِل میں عنبر بیز کسی کی یاد ہے دُنیائے عشق میں گلریز
خیال پرور و کیف آشکار و عشرت خیز بہار پیکر و درد آشنا و مہر انگیز

کسی کے حُسن کے جلوے نہاں ہیں آنکھوں میں
بہارِ عشق کی رنگینیاں ہیں آنکھوں میں

جلال الدین اکبر

شعر و شاعر

(ایک بے قافیہ نظم)

اے شعر تیری کس سے ثنا ہو؟
مدحت سرائی ہو کس سے تیری؟
ہے ایک عالم کہ تجھ پہ فدا ہے
جو دل ہے۔ وارفتہ تیرے اثر کا۔
ہوتا نہ گر تو یوں جلوہ فرما،
تو راگ کا نام لیتا نہ کوئی،
کان آشنا ہوتے کب، زیر و بم سے،
نظمِ سخن کا کب رنگ بندھتا۔
اے شعر اوصاف ہیں تیرے بیحد؛
علم و ادب کا تو ہی ہے زیور۔

اے شعر تو ہر زباں کی ہے ابجد؛
حسن بیاں کا غازہ ہے تو ہی۔
نقاش ہے تو جذبات دِل کا،
عشق و محبت کا گہوارہ ہے تو،
رُوح رواں جسمِ عرفاں کی تو ہے،
بے شبہ تو ہے حقیقت کا جوہر۔
جو کچھ گیا دل نہ تیرے اثر سے،
گردن نہ جس کی ہل جاتے تجھ پر
سمجھو کہ انسانیت سے ہے خارج۔
ماثور ہیں تجھ سے ذی عقل سارے۔

بیشک گل تر ہے سوبھا چمن کی،
ہے بحر کی آبرو گوہر تر،
گل کوئی لیکن دیکھا ہے ایسا
محفوظ ہو جو سموم و خزاں سے
صرصر سے جو ہو حفظ و اماں میں
منقار بلبل سے مامون ہو جو؟
ہر پھول کے ساتھ کانٹا اگر ہے،
ہے بال کی آر موتی کے سر پہ،
ہے شعر تر ہی باقی و دایم،
اس سے فنا اور ہے نیست عاری۔

جب ریل تھی اور نہ تھا تار برقی،
دُنیا میں جب تھی نہ ڈاک اور سٹیمر،
نکلے نہ تھے جب یہاں چھاپہ خانے،

اخبار کی تھی نہ ہم کو خبر تک،
اُس وقت جو ہو گئے شعر موزوں
اس وقت سر تاج عالم کے ہیں وہ،
سر مشق ہیں وہ سب شاعروں کے۔
ابتک دلوں پر قبضہ ہے اُن کا،
قائم یقیناً رہے گا ابد تک۔
دل سے نہیں نقش وہ مٹنے والے۔

یہ یاد رکھنا لیکن، عزیزو،
یہ شان ہے شعر کی جو ہو اصلی۔
بھولے ہیں جس پر شاعر ہمارے
تعریف سمجھے ہیں وہ شعر کی یہ،
ہو بحر جس میں، اور قافیہ ہو،
لفظی رعایات ہوں چند اس میں،
ہو خرق عادت، مافوق فطرت،
قدرت کی تنظیر اس میں نہ کچھ ہو،
احساس طبعی نہ لطف حقیقت؛
ہو سر بسر ایک تصویر وہمی۔

وُہ موشگافی کہ توبہ الٰہی،
وہ زیور مستعار اس پہ لادیں،
مانگے کے پہنائیں وہ اس کو کپڑے،
ہو شکل اصلی وہی ہیولے،
غائب حقیقت ہو شعر کی سب،
آرایشوں کا بنے اِک پلندہ،
ہو کوئی جدّت نہ کچھ تازگی ہو،
محبس ہوں اس کے ردیف و قوافی۔
شعر ایسا اچھّا بھی ہو۔ اثر سے
ہوگا معرّا، مطلب سے خالی۔

اے شعر گوئی کیا سحر ہے تو،
قربان تجھ پہ شاہوں کی شاہی،
لطف سخن تجھ میں وہ موہنی ہے،
ہر دل پہ تیرا سکّہ جما ہے،
جو سچّے شاعر گزرے جہاں میں
یا سرستی کے اب بھی بھگت ہیں
ہم سے بیاں ہو کیا شان ان کی؟
گو پاس ان کے حشمت نہ زر ہو؛
لیکن غنا کے وہ بادشا ہیں،
سلطان ہیں وہ اقلیم دل کے

انہیں نے تو سوتی قومیں جگائیں،

بندے کراتے آزاد انہیں نے،
حُبِّ وطن کا مژدہ سُنایا،
اُلفت دلوں میں کی نور افگن،
اُکسایا دِل میں شوقِ ترقی،
امن و اماں کا کیا نصب جھنڈا،
کھویا دلوں سے بغض و حسد کو،
دیا صلح کا کل جہاں کو سندیسا۔
فاتح رہے فتح میں جس کی قاصر
شاعر نے اس دل میں تخت آبچھایا۔

اے نکتہ سنجو، نقشِ قدم پر
لازم ہے ان کے ہم سب کو چلنا۔
چھوڑو خیالی معشوق کو اب؛
معشوق بہبودِ عالم کو جانو۔
رشک اور رقابت آپس کی چھوڑو،
علم و ادب ہو دلبر تمہارا،
جوشِ محبت پھُونکو دِلوں میں،
دھو ڈالو داغِ کہن سب دِلوں سے۔
ہمّت باندھو گے اس کام پر تم،
تو سرسّتی مہرباں ہوں گی تم پر۔

کیفی

گلیونؔ کا بانکا

(مائیکل آرلین کی مشہور عالم کتاب "جاذبِ نظر شخصیتیں" کے ایک افسانہ کا ترجمہ مسنزاد)

شاید آپ کبھی اس بات کا احساس نہ کر سکتے کہ طلعت کسی طرح غیر مطمئن تھی۔ شاید آپ کو کبھی اس بات کے امکان کا احساس بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کے پاس کیا شے موجود نہ تھی۔ وہ خورشید الزمان وکیل سرکار کی بیوی تھی۔ خوبصورت نازک۔ متناسب الاعضا طلعت کے متعلق میں کونسی ایسی بات کہوں جو آگے نہ کہی جا چکی ہو۔ وہ ایک دنیادار عورت تھی۔ ہر شخص اسے جانتا تھا۔ لیکن اس کے خلاف کچھ نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ایسی بے پردہ لیکن باعصمت خاتون تھی جس نے کسی قسم کی جھوٹی شہرت کی بھی خواہش نہیں کی۔ مختصراً وہ امرا کے طبقے کی محبوب ترین زینت تھی۔ طلعت کی تعریف کرنا فیشن میں داخل تھا۔ اور ان لوگوں کے خیالات بہت سطحی ہیں۔ جو یہ کہیں کہ تمام فیشن سطحی ہیں۔ کیونکہ ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جس میں تغیر نہ ہو۔ اور اگر فیشن میں معمول سے زیادہ تغیرؔ ہوتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ . . . . . .

خیر یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ اور علاوہ ازیں میں کوئی فیشن کی تاریخ تو نہیں لکھنے بیٹھا۔ ہاں مجھے اس بات پر ضرور پریشانی اُٹھانی پڑتی ہے کہ درحقیقت اس بات کی وجہ کیا ہے۔ کہ افسانوں اور ناولوں میں امرا اور غربا کے لئے علیحدہ علیحدہ قوانینِ زندگی فرض کر لئے جاتے ہیں۔ الفاظ کے بین السطور سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ گویا دوستی صرف متوسط الحال طبقے کی خصوصیت ہے۔ اور امرا اس جذبے سے بالکل عاری ہیں۔

سالہا سال سے ہندوستان اس ظلمِ خیال کے ماتحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس ظلمِ خیال کو متوسط الحال طبقہ کہتے ہیں۔ ہر ایک شخص اس طبقے کی تعریف کرتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی مصنف اس طبقے کے متعلق لکھے۔ تو کہا جاتا ہے کہ وہ واقعیت کا ماہر ہے۔ مگر وہ غریبوں کے متعلق کچھ لکھے تو کہا جاتا ہے، ایسے اشخاص کے متعلق لکھ رہا ہے جن کی کوئی ہستی نہیں وغیرہ وغیرہ لیکن خیر یہ تمام باتیں غیر مؤثر ہیں کیونکہ ہم صرف طلعت کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کے کئی دوست تھے۔ لیکن وہ کسی کی دوست نہ تھی۔ کیونکہ طلعت کی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو کبھی اپنی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف سے بھی مطلع نہ کرتی۔

کیونکہ وہ بالطبع شرمیلی تھی۔ اس کے ذوقِ سلیم اسکی حاضر جوابی اس کی سنجیدہ تہذیب کی تہ میں شرم کا ایک گہرا احساس پوشیدہ تھا۔ اپنی حیات روشن کے درمیان میں وہ اس خیال کو کبھی دل سے محو نہ کرسکی کہ شاید اس کی باتیں لوگوں کو اکتا دینگی۔ ان تمام رازوں میں سے جو طلعت کے دل میں پوشیدہ تھے۔ ایک یہ بھی تھا۔ کہ اس کی برودت حیات جدتِ عشق کے لئے بیتاب تھی۔ وہ شروع ہی سے اپنے تخیل میں عشق کی فضاؤں میں پرورش پاکر جوان ہوئی تھی۔ خورشید الزمان وکیل سرکار ان خیالات سے کوسوں نفور تھا۔ وہ طلعت سے محبت کرتا تھا۔ لیکن وکیلِ سرکار بن کر زندگی بسر کرنا نہایت واہیات طریق سے زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے وہ اپنے وقت کا باقیماندہ حصہ اکثر وبیشتر اس کے ہمراہ بسر کردیا کرتا۔

طلعت کی زندگی میں عشق اس وقت داخل ہوا، جب وہ یہ کہتے ہوئے کئی دفعہ سُنی جاچکی تھی کہ میں اب بُوڑھی ہوچکی ہوں۔ اس وقت اس کی عمر ۳۸ سال کی تھی۔ جب جلال انور پاشا عشق کی تمام رنگینیوں کو لیکر اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ وہ جنگِ عظیم کے دوران میں کئی کارنمایاں انجام دے چکا تھا۔ اور اب یونانیوں کے مظالم کا شکار ہوکر اپنے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان میں آبسا تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ آدھے سے زیادہ قسطنطنیہ اس کے خاندان کی ملکیت تھا۔ جو ایک بالکل فطرتی حقیقت ہے۔ کیونکہ آجکل ہندوستان میں کئی ایسے ترکی خاندان ہیں، جو فرداً فرداً آدھے سے زیادہ قسطنطنیہ کے مالک تھے۔

جلال انور ایک مُصوّر تھا۔ اور لوگ فیشن کے طور پر کہتے پھرتے تھے۔ کہ وہ ایک مُصوّر ہے۔ آپ سے توقع کی جاتی تھی۔ کہ آپ اس کی عزّت کرینگے۔ کیونکہ وہ زورِ بازو سے کما کر کھاتا تھا۔ تہذیب سے مجبور ہوکر اس کی عزّت کرنا آپ کا فرض تھا لیکن آپ یہ نہیں سمجھ سکتے۔ کہ جب آپ کسی پان فروش کے متعلق کہیں، کہ وہ زورِ بازو سے کما کر کھاتا ہے۔ تو سُننے والوں کے دل میں پان فروش کی عزّت کیوں نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن زندگی ترکوں کے لئے ایک علیحدہ سی چیز ہے۔ کیونکہ وہ شراب پی کر بھی کچھ سنجیدہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی مصوّری صرف یہانتک محدود تھی۔ کہ وہ طبقۂ امرا میں سے کسی مرد یا عورت کی تصویر بناتا۔ تصویر کیا بناتا۔ تصویر کی تضحیک کرتا۔ اور پھر خدا جانے کس طرح اس تصویر کو لاہور کے ایک مصوّر رسالے کے ہاتھ بیچ ڈالتا۔ آپ اس کی تصویر کو ہزار تصویروں میں پہچان لیتے۔ نہایت لمبی لمبی آنکھ مجنوں کی پسلیوں کی طرح پتلی پتلی اُنگلیاں۔ بیٹھنے اور کھڑا ہونے کا عجیب عجیب انداز بیک نظر اس بات کی شہادت دیتا کہ یہ مضحک تصویر حضرت جلال انور کے موئے قلم کی ممنوں ہے۔

طبقۂ اُمرا کی عورتیں اس پر شیدا تھیں۔ کہتی تھیں "یہ ترک کس قدر بہادر اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔"

اسی جلال انور میں طلعت نے اپنی محبت کی تابانی کو منعکس پایا۔ اس سے پیشتر طلعت کی شہرت کے عذارِ صفا پر بدنامی کا کوئی داغ نہ تھا۔ اور اس کے بعد بھی اسے کوئی بدنامی نہیں اُٹھانی پڑی۔ اس کی نیک نفسی اور عصمت لاہور میں زبان زدِ خاص و عام تھی۔ سر محمد حسین بیدل اسبات کی حتمی اور قطعی دلیل ہیں۔ جنگِ عظیم فرنگ کے دوران میں اُنہوں نے طلعت کے ساتھ چالیس دفعہ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور علاوہ ازیں غیر محدود مواقع پر اس سے ملاقی ہُوئے۔ اور نہ صرف ملاقی ہُوتے، بلکہ طلعت کو سلام کیا اور طلعت نے ان کو جواب بھی دیا۔ وہ مدعی ہیں کہ طلعت نے ایک دفعہ وزیر مال سے گفتگو کرتے ہُوئے کہا۔" مجھے چھپے ہُوئے گناہوں اور خاصکر چھپی ہُوئی محبت سے سخت نفرت ہے۔"

وزیر مال نے جواب دیا۔" بالکل درست! بالکل درست!!"

تھوڑے عرصے کے بعد معدے کی شکایت کے باعث وزیر مال کو مستعفی ہونا پڑا۔ اور ساتھ ہی طلعت کو جلال انور سے عشق کرنا پڑا۔

---

(۲)

کبھی تصاویر متحرکہ یا تمثیل کا شوق انہیں باہم ہونے پر مجبور نہ کر سکا۔ لوگوں نے جلال انور کو طلعت کے ہاں دیکھا۔ لیکن اور مہمانوں کی شخصیت میں اس کی شخصیت مدغم ہو کر رہ گئی۔ شام کے وقت طلعت اپنے عاشق کے کمرے میں جو مزنگ میں واقع تھا چلی جاتی۔

طلعت کو اُس کمرے کی گُم سُم تنہا خاموشی میں داخل ہو کر ایک طرح کا اطمینان محسوس ہوتا مہمانوں کی آؤ بھگت کا تکلیف دہ احساس اور اُن کی آوازوں کا ناخوشگوار مجموعہ اس کے دماغ سے محو ہو جاتا۔ اس کی ہنگامہ خیز مسرتِ قلب اور معمولی رسمیاتِ حیات کے درمیان محبت کی سُنہری اور پیاری کہر حائل ہو جاتی۔ وُہ ایک صوفے پر بیٹھ جاتی اور جلال انور کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔

کمرے میں ساز و سامان بہت کم تھا۔ اور اگر طلعت کا بس چلتا تو وہ کمرے کو عظمتِ بابل کے عہد کا ایک ریاضِ عشرت بنا دیتی۔ لیکن جلال انور نے طلعت سے کسی قسم کی مالی مدد لینے سے قطعی اور حتمی طور پر انکار کیا۔

اکثر ان میں شکر رنجیاں ہو جاتیں۔ الزام چھوٹی موٹی لڑائیاں اور پھر صلح۔ تھوڑے عرصے کے بعد طلعت کو احساس

ہُوا۔ کہ یہ بات ترکوں کی فطرت میں داخل ہے۔ کہ وُہ بات کا بتنگڑ بنالیں۔ اور پھر نہایت رسیلے طور پر صلح کرلیں اکثر طلعت کہا کرتی "اس قسم کی لڑائیاں میرے سکونِ قلب کو برباد کردینگی۔"

جلال انور نے جواب دیا۔" طلعت تم لڑائی کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکتیں۔"

ایک شام طلعت اپنے عاشق کے کمرے سے نکلکر مزنگ روڈ پر فٹن کی تلاش میں آئی۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ سردی کا موسم تھا۔ اور ہوا گوشت میں گھسی جارہی تھی۔ یکایک ایک دراز قامت شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے ہُوتے اس کے سامنے آکھڑا ہُوا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا کہ طلعت گذر نہ سکتی تھی۔ اور اس کا چہرہ طلعت کا تمسخر اُڑا رہا تھا۔ اس کے ناک نے جو کبھی خوبصورت ہوگا۔ لیکن جو کسی ضرب شدید کی وجہ سے نمایاں طور پر ایک طرف کو مڑ گیا تھا اس کے چہرے میں ایک مبہم سا انداز ہیبت پیدا کر دیا تھا۔ اس نے ایک طنزیہ سے انداز میں طلعت کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کے سر پر ایک چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ قرون وسطیٰ میں شاید اس طرح کی ٹوپیاں بحری قزاق استعمال کرتے ہونگے۔ وہ چھاتی پر ہاتھ رکھ کر ایک خاص نفاستِ انداز سے جھکا۔ کہنے لگا۔

"طلعت خاتون آداب عرض کرتا ہوں۔"

طلعت نے مشکوک سے لہجے میں کہا۔" میرا خیال ہے ......"

اس میلے کچیلے نوجوان نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے طلعت کو روک دیا۔ اور مُسکرایا۔ پھر بولا۔" یہ میری بدقسمتی ہے کہ ایکدوسرے سے متعارف نہیں چند ایک امور کے باعث پچھلے دنوں مَیں سوسائٹی جانے سے گریز کرتا رہا ہوں مَیں اس بات سے بھی واقف ہوں۔ کہ آپ کہاں گئی تھیں۔ مَیں اطمینان سے نہیں کہہ سکتا۔ کہ آپ وہاں کیا کر رہی تھیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے شوہر کو اس بات کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ شوہر اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ حاکم بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ بیگم طلعت کیا آپ مجھے بدتہذیب خیال کرینگی۔ اگر مَیں آپ سے پانچسو روپیہ مستعار طلب کروں"

نوجوان بہت میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھا لیکن وہ اسقدر بد تہذیب تھا۔ اسقدر صریحاً اور متناسب طور پر بدتہذیب تھا۔ کہ طلعت کو خیال پیدا ہونے لگا۔ کہ شاید وہ کبھی ایک معزز شخص تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید مردوں کی ہستی اسی لئے گوارا ہے۔ کہ وہ عورتوں کو مسرور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ شخص تو بہت ہی ذلیل ہے۔ اس کو تو میری کوئی پروا نہیں۔

طلعت نے پُوچھا۔" تو کیا تم دھمکا کر مجھ سے روپیہ وصول کرنا چاہتے ہو۔" اور اس کی آواز کانپ

رہی تھی۔

اُس مکروہ ناک والے شخص نے جواب دیا۔" بیشک اور مَیں کوشش کر رہا ہوں کہ مَیں اس فرض کو مکمل ترین بد تہذیبی سے ادا کروں۔ میرا خیال ہے کہ اگر مَیں ناولوں کے دھمکانے والوں کی طرح آپ سے اظہارِ تعشق کروں تو آپ خوش ہونگی۔ لیکن مَیں جلال انور کی برابری نہیں کر سکتا۔ سُنا جاتا ہے کہ ترکِ محبت کرنے کا ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔"

طلعت نے نوجوان کی طرف حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ تذلیل اور نکبت کی وہ کونسی گہرائیاں ہونگی، جہاں پہنچ کر ایک مرد کسی عورت کی اس قدر توہین کر سکتا ہو گا۔

"مجھے اس بات کا احساس ہے۔ کہ آپ مجھ سے بے انتہا نفرت کرتی ہیں۔ پھر بھی میری خواہش ہے۔ کہ وہ پانچسو روپیہ والا معاملہ جسقدر جلد طے ہو جائے۔ اسی قدر بہتر ہو گا۔"

طلعت کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

آخرکار وہ بولی۔" تم اتنا کچھ جانتے ہو۔ کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے گھر کا پتہ بھی جانتے ہو گے۔ کل بارہ بجے میرے مکان پر آنا۔ دروازے پر تمہیں میرا نوکر ایک لفافہ دیدیگا۔ کیا اب مَیں جا سکتی ہوں۔"

"بیشک"

اور وہ ایک طرف کو ہو گیا۔

لیکن طلعت خاموش کھڑی رہی۔ وہ اس کے چہرے کی طرف معصوم اور روشن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اور ان کی گہرائی میں کہیں ایک ہلکی سی مُسکراہٹ زخمی اور مصلوب چھپی ہوئی تھی۔ جو اس کے لبوں تک نہ آ سکتی تھی۔

"مجھ سے کبھی کسی شخص نے اس طرح گفتگو نہیں کی۔ تم کون ہو۔"

اس مکروہ ناک والے شخص نے جواب دیا۔" معزز خاتون! مَیں گلیوں کا بانکا ہوں۔"

طلعت نے اس کی طرف غرور سے دیکھا۔" اور کیا گلیوں کا بانکا ہونا کوئی اچھی بات ہے۔"

گلیوں کا بانکا ایک عجیب سے انداز میں مُسکرایا۔ "بیگم طلعت شاید میرا خیال تھا۔ کہ مَیں آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں۔"

طلعت نے سکون سے کہا۔" تم شاید دُنیا میں سب سے بدتر آدمی ہو۔ اور اسی لئے مجھے کچھ تعجب سا ہے۔ تمہیں پانچسو روپیہ مل جائینگے۔ خوب سوچ لو۔ کیا تمہیں ایکہزار تو نہیں درکار ہے۔"

لیکن بیگم طلعت کا تیخ مثال لہجہ گلیوں کے بانکے کو متاثر نہ کر سکا۔ اس نے جواب دیا۔" مَیں عورتوں سے تحفے لینا پسند نہیں کرتا۔ پانچسو روپیہ میرا حق ہے۔ باقی

پانچسو روپیہ لینا ایک شریف آدمی کے لئے توہین ہے۔

"بیگم طلعت آپ جا سکتی ہیں۔"

"تم ایک شریف آدمی ہو۔ شاید تمہاری مراد یہ ہے کہ تم ایک شریف آدمی تھے۔"

اس نے جواب دیا۔ "شریف آدمی وہ شخص ہے جو کبھی اضطراری طور پر کسی آدمی کی توہین نہیں کرتا۔ وہ جب کسی کی توہین کرتا ہے۔ ارادتاً کرتا ہے۔ سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔"

طلعت نے کہا۔ "مجھے امید ہے۔ کہ میں پھر کبھی جناب سے ملاقات نہ کر سکونگی۔"

نوجوان کا دُبلا پتلا چہرہ طلعت کا تمسخر اڑا رہا تھا۔ "کیا میں نے عرض نہیں کیا۔ کہ میں گلیوں کا بانکا ہوں۔ میں اس فرسودہ عہد میں اپنے کندھوں پر بانکپن اور گناہ کی مردانگی کا بوجھ تنہا اُٹھائے ہُوئے ہوں۔ اس لئے میں کوشش کرونگا۔ کہ آپ سے نہ ملوں۔ لیکن میں وعدہ نہیں کرتا۔"

(۳)

دوسری شام طلعت نے جلال انور کو صرف اس ناگوار واقعے کے اجمالی حالات سے آگاہ کیا۔ دھمکانیوالا روپیہ ——— اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس سے بیشتر کئی دفعہ طلعت اس کے رخساروں کو تمتماتے ہُوتے دیکھ چکی تھی۔ لیکن آج کا تمتمانا خلاف معمول تھا۔ یہ تمتمانا اس طرح کا تھا۔ جس طرح ایک بچے کے رخسار اس وقت تمتما اُٹھتے ہیں۔ جس وقت اُسے بے قصور پیٹا جائے۔ اس لئے نہایت پُر زور الفاظ میں کہا۔ کہ اسے طلعت کی بیحرمتی گوارا نہ تھی۔ اس لئے طلعت کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اس سے ملنا چھوڑ دے۔ لیکن طلعت نے ان کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اور کہا۔ "پیارے یہ مشکل اور طرح حل ہو گی۔ ہفتوں سے تم اپنے کمرے کے متعلق شکایتیں کر رہے تھے۔ کمرہ بدل دو۔ اور جسقدر دور لو، اسی قدر اچھا۔ مثلاً مزنگ سے بھاٹی دروازے۔"

طلعت کے مشورہ پر عمل کیا گیا۔ اور جلال نے بھاٹی دروازے کے باہر ان سنسان بنگلوں میں سے ایک بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ جو راوی کی طرف جانے والی سڑک سڑک پر واقع ہے۔ بنگلے کے قریب ایک ڈاکخانہ تھا۔ ایک رات طلعت چلی آ رہی تھی۔ کہ دُور سے اس نے گلیوں کے بانکے کو لیٹر بکس کے ساتھ سہارا لگائے ہُوئے کھڑے دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت اور ایک خاص اندازِ تغافل میں کھڑا تھا۔ وہ طلعت کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ ہوا کی ان موجوں پر غور کر رہا تھا۔ جو سڑک پر سے خزاں رسیدہ پتّوں کو اُڑا لئے اُڑاتے لئے پھرتی تھیں۔ اور "برباد" کے مفہوم کو ادا کر رہی تھیں۔ طلعت مسکرائی۔ مسکرائی کیا۔ پھر

آہستہ سے بولی۔ "کیا دھمکانے والے بھی تاریخ کی طرح اپنے آپ کو دُہراتے رہتے ہیں۔"

اس مکروہ ناک والے شخص نے جھک کر فرشی سلام کیا۔ پھر انتہائی سنجیدگی سے بولا۔ "مولانا شررکا قول ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہراتی۔ بلکہ مورخ ایک دوسرے کو دُہراتے رہتے ہیں۔ خوب فقرہ ہے۔ کیا خیال ہے آپکا۔"

طلعت نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم بہت بدتہذیب ہو لیکن معلوم ہُوا کہ تمہاری بدتہذیبی کے لئے لغت میں کوئی لفظ موجود نہیں۔ تم جو اپنے آپ کو گلیوں کا بانکا کہتے ہو۔ گلیوں کی کیچڑ سے بھی زیادہ ذلیل ہو۔"

گلیوں کے بانکے نے آہستہ سے کہا۔ "شاید ایسا ہی ہو۔ شاید ایسا ہی ہو۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے مہذب آدمیوں کی بدتہذیبیوں کا علم ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے مہذب آدمی میرے متعلق غلط رائے قائم کرتے ہیں۔"

اس بات کے متعلق کہ وہ لیٹر بکس کے قریب کیوں کھڑا تھا۔ اس کے اشارہ نہ کرنے میں ایک خاص قسم کے معنی بین السطور پنہاں تھے۔ وہ اس کے قریب سے گزر کر جانے لگی تو گلیوں کے بانکے نے کہا۔ "بیگم طلعت تم ان عورتوں میں سے ہو۔ جن کے متعلق شاعر قصیدے لکھتے ہیں۔ اور عام لوگ اپنے خوابوں کو ان کی شمیم حسن سے معطر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم ان عورتوں میں سے ہو جن کی یاد زندگی کے بیکس لمحوں میں انسان کو بے اختیار آتی ہے۔ میری زندگی بیکس لمحوں کا مجموعہ ہے۔ بیگم طلعت جلدی چلی جاؤ۔"

طلعت نے چلّا کر پُوچھا۔ "کیا کہا۔"

لیکن گلیوں کا بانکا شاید پھر ہوا پر غور کر رہا تھا۔ وہ ہوا جو خزاں رسیدہ پتّوں کو ادھر اُدھر لئے پھرتی تھی۔ اور "برباد" کے مفہوم کو ادا کر رہی تھی۔

گلیوں کے بانکے نے خلا کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا "جو کچھ مَیں نے کہا تھا۔ وہ دُہرانے کے قابل نہیں۔ لیکن مَیں نے یہ بھی کہا تھا۔ بیگم طلعت جلدی چلی جاؤ۔ اور اب پھر اسے دُہراتا ہوں۔ بیگم طلعت یہ ایک تنہا جگہ ہے۔ اور گلیوں کا بانکا تمثیل کے ڈاکوؤں کی طرح قانون کی بندشوں سے آزاد ہے۔ مُدتیں گزریں مَیں نے کسی عورت کو گلے سے نہیں لگایا۔ اور وہ چیز جو اب مجھے ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔ یہ ہے۔ کہ مَیں نے کبھی ایسی عورت کو گلے سے نہیں لگایا۔ جو خود مجھ سے ہم آغوش ہونا نہ چاہتی ہو بیگم طلعت چلی جاؤ۔"

طلعت ایک سائے کی طرح غائب ہو گئی گھر پہنچکر اس نے سوسو کے پانچ نوٹ نکالے۔ وہ نوٹ جو غربت کے خون۔ دولت کے داغ اور محنت کے عروج سے رنگین ہیں۔ تمام نوٹ بالکل مصفّا تھے۔ لیکن ایک نوٹ پر سُرخ سیاہی کا داغ تھا۔ گویا کسی نے قصداً انگلی ڈبو کر نوٹ پر

ارادتاً مہر لگادی ہو۔ نوٹ نوکر کے حوالے کر دئے گئے۔
کہ جب گلیوں کا بانکا آئے، تو اُسے پہنچا دئے جائیں۔
دوسری شام کو اُسے ایک رقعہ مِلا۔ رقعے میں درج تھا
"مَیں دیکھتا ہوں کہ تم مجھے اس سے بھی بدتر تصوّر کرتی
ہو جِس قدر کہ مَیں ہوں۔ یہی میرا مقصد تھا۔ بن مانگے
مجھے روپیہ دے کر تم نے دھمکانے والوں کے پیشے کو
ذلیل کر دیا۔ ایک شریف آدمی یہ ذلّت کبھی گوارا نہیں
کر سکتا۔ خدا حافظ۔"

(۴)

طلعت کو اس خط کے موصول ہونے کے بعد اپنی
دانائی کے متعلق ایک غرورِ پنہاں کا احساس ہُوا وہ سوچتی
تھی۔ کہ دُنیا بھر میں شاید میرے سوا کوئی عورت گلیوں کے
بانکے کو اس خوبصورتی سے ٹال نہ سکتی۔ اس کی دانائی
سے گلیوں کا بانکا گناہ کے ان تاریک پردوں میں پھر
چھپ گیا تھا۔ جہاں سے وہ دفعتاً نمودار ہُوا تھا۔
انہیں خیالات کی وجہ سے وہ خط کے موصول ہونے کے
گیارہ دن بعد گلیوں کے بانکے کو دیکھ کر بیحد متعجب ہُوئی
نہ صرف متعجب ہُوئی۔ بلکہ اس کے سینے میں غُصّے کا ایک
سیلاب اُمڈنے لگا۔ وہ حقارت کے ایک ناقابلِ بیان
جذبے سے متاثر ہو کر اس کے پاس سے گذر جانا چاہتی
تھی۔ لیکن وہ طلعت کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے کہا۔ "آپ کی تذلیل میرا مقصد نہیں
مگر ——"

"تم کسی طرح میری تذلیل نہیں کر سکتے۔"

گلیوں کے بانکے نے جواب دِیا۔ "اگر یہ بات ہے
تو مجھے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خاتون طلعت
مَیں کبھی جُوئے میں روپیہ نہیں ہارتا۔ مَیں نے مستقل ارادہ
کر لیا ہے۔ کہ مَیں کبھی نہ ہارونگا۔ جہاں تک کہ جوئے جیسی
اتفاقی کھیل سے مستقل ارادہ کا تعلق ہے۔ خدا جانے یہ
تمہارے حُسن کا تاثر تھا یا کیا۔ کہ مَیں آج ہار گیا۔ اور
اپنی عزّت کو بچانے کے لئے مجھے سو روپوں کی ضرورت
ہے۔"

"تمہاری عزّت۔ سبحان اللہ"

گلیوں کے بانکے نے مُسکرا کے جواب دیا۔ "کاش
مَیں بھی آپ کی طرح اپنی عزّت کو "سبحان اللہ" کہکر ٹال
سکتا۔ لیکن پھر آپ جانتی ہیں۔ یہ سو روپیہ کا معاملہ ——"

طلعت نے اس کی طرف دیکھا۔ "آج اس کے لبوں
پر طنز کا اندازِ تبسّم مفقود تھا۔ بول "بیشک عزّت کے
معاملے میں سو روپوں کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔ لیکن اس
وقت میرے پاس کچھ نہیں۔ مَیں گھر جاتے ہی تمہیں روپیہ
پہنچا دوں گی۔"

گلیوں کا بانکا بولا۔ "توبہ! توبہ! مَیں آپ کو یہ

تکلیف دے سکتا ہوں۔ آپ لگے ہاتھوں جلال انور سے یہ رقم مستعار لے لیجئے۔"

طلعت چپ چاپ جلال انور کے ہاں چلی گئی۔ اور کہنے لگی! پیارے وہی آدمی پھر مجھے مل گیا ہے۔ کیا تم مجھے اس وقت سو روپیہ دے سکتے ہو۔"

جلال انور جھنجلا اٹھا۔ کہ یہ شخص ہمیشہ تنگ کرنے پر تلا رہتا ہے۔ لیکن طلعت نے اسے سمجھا بجھا کر اس کے غصہ کو فرو کیا۔ جلال انور نے طلعت کو ایک سو روپیہ کا نوٹ دیا۔ اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے واپس جانے کو تھی۔ کہ روشنی میں اس نے نوٹ پر سرخ سیاہی کا ایک داغ دیکھا۔ اس طرح کا گویا کسی نے قصداً سیاہی میں انگلی ڈبو کر ایک مہر سی لگا دی ہو۔ طلعت نے جلال انور کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی زبان خاموش تھی لیکن آنکھوں میں ایک محشر گفتگو حرکت کر رہا تھا۔ جلال انور کا چہرہ ایک میلے کچیلے سکڑے ہوئے رومال کی طرح زرد پڑ گیا۔ جب وہ باہر نکلی، تو گلیوں کے بانکے نے طلعت کے چہرے میں ایک عجیب تغیر دیکھا۔ نوٹ کو ہاتھ میں لے کر گلیوں کا بانکا ہنسا۔ پھر اپنے تلخ تریں لہجے میں بولا۔

"طلعت خاتون۔ آج تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ جلال انور کس قسم کا آدمی ہے اس سازش میں وہ بھی شریک تھا۔ اس کے ذمہ یہ کام تھا۔ کہ وہ تمہارے دل میں اپنے عشق کا بیج بو کر تمہیں اپنے گھر بلاتے۔ اور میرا فرض یہ تھا کہ تمہیں دھمکا کر تم سے روپیہ وصول کروں۔ جو روپیہ تم دیتی تھیں۔ وہ ہم آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ اس نے صرف روپیہ کے لئے تم سے راہ و رسم پیدا کی۔ میں نے قصداً یہ داغدار نوٹ جلال انور کو دیا تھا۔ پہلے دن ہی تمہیں دیکھ کر میرا دل بے چین ہو گیا۔ میں نے تمہارے خلاف گناہ کیا ہے۔ لیکن تم نے خود اپنی ذات پر ظلم کیا ہے۔ اپنے حسن پر ظلم کیا ہے۔ اب جاؤ۔ اور پھر ایسا گناہ نہ کرنا۔"

طلعت نے کہا۔ "تم اور گناہ کا ذکر کرو۔"

بیشک معظم خاتون کیونکہ صرف شیطان ہی ایک ایسی ہستی ہے۔ جو باختیار لہجے میں گناہوں سے باز رکھنے کی تلقین کر سکتی ہے۔"

اور گلیوں کا بانکا گناہ کے اندھیرے سایوں میں غائب ہو گیا۔

عابد

تبصرہ

نور جہاں - فی زمانہ تعلیمِ نسواں جو روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ اس کے اسباب وعلل میں سے، بلکہ یوں کہئے کہ اُسکے نتائج میں سے، ایسے رسالوں کا اجرا بھی ہے جن کا مقصد طبقہ نسواں کی ذہنی ترقی و تربیت ہے۔ اور جن میں سے اکثر کی ترتیب و تدوین اسی طبقے کے افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ ان رسالوں میں نور جہاں جس کے اس وقت تک دو نمبر نکل چکے ہیں، ایک خاص درجے کا مستحق ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ اس کا مقصد اکثر دوسرے رسالوں کی طرح عورتوں میں معلوماتِ عامہ کی اشاعت ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اُن کی اخلاقی و ذہنی تکمیل اور اُن میں صحیح خیالات کا پھیلانا اسکا حقیقی نصب العین ہے دوم:- اس کی ادارت صنفِ لطیف ہی کے ایک فرد کے ذمے ہے۔ ......

....

....

....

....

.... رسالہ کو جب میں نے مطالعہ کیا، تو مجھے یہ دیکھ کر کہ زیادہ تر مضامین مردوں کے قلم سے ہیں جن میں علامہ عبداللہ یوسف علی، جناب عبدالقیوم بیرسٹرایٹ لا۔ .... جیسے مشاہیر کے نام نظر آتے ہیں۔ جہاں یہ خوشی ہوئی کہ یہ رسالہ ایسے رہنمایانِ قوم کے پیغام کو عورتوں تک پہنچانے کا وسیلہ ہوگا۔ وہاں یہ یاس انگیز خیال بھی آیا کہ ابھی وہ وقت دُور ہے جب عورتیں غیروں کے ارشاد و ہدایت کو سُننے اور اُس کی تقلید کرنے کی بجائے خود بھی کوئی پیغام دیا کرینگی۔ اس خیال کے اظہار سے میرا یہ مقصد نہیں کہ نور جہاں کی ایڈیٹر صاحبہ عورتوں کے مضامین کو محض اس رعایت سے کہ وہ عورتوں کے مضامین ہیں۔ ایسے مشاہیرِ ادب کے مضامین پر ترجیح دیں۔ جیسا کہ بعض رسالے کرتے ہیں۔ اور نتیجۃً معیارِ ادبیت سے گر جاتے ہیں۔ بلکہ یہ محض ایک احساس کا بے تکلف اظہار تھا جو میرے دل میں پیدا ہُوا۔ چندہ سالانہ پانچ روپیہ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت گوارا

(ا ب ج)

انجمن ارباب علم پنجاب

کی

تفصیلات آمد و صرف

از اکتوبر ۱۹۲۴ء تا اکتوبر ۱۹۲۵ء

(منظور کردہ مجلس انتظامیہ)

اکتوبر ۱۹۲۴ء سے اکتوبر ۱۹۲۵ء تک انجمن کے گیارہ عام جلسے ہوئے۔ جن میں دو نثر کے اور نو نظم کے تھے۔ دس جلسے ایس پی ایس کے ہال میں ہوئے۔ اور ایک یونیورسٹی کیمیکل لیبوریٹری میں۔ چار وفد انجمن کی طرف سے گوجرانوالہ۔ جموں فیروزپور۔ شملہ گئے۔ بھلہ شو کمپنی کا انعامی مقابلہ کا اعلان اینگلو انڈین اخبارات کے سوا تقریباً ہندوستان بھر کے انگریزی اُردو اخبارات اور رسالہ جات نے شائع کیا۔ ملک کے اکثر اہل قلم اور شعرا تک پہنچایا گیا۔ صوبہ کے اخبارات نے انجمن کا پروپیگنڈا ہندوستان کے ہر گوشے میں کیا۔ سات ہزار پوسٹر اور دستور العمل وغیرہ کی اشاعت ہوئی۔ اس سال کے پروپیگنڈا نے انجمن ارباب علم کو ہندوستان گیر بنانے میں بے حد مدد دی۔ انجمن کے ادبی آرگن ہزارداستان میں سال گزشتہ کا مفصل آمد و صرف شائع کیا جاتا ہے۔ اور آئندہ ہر ماہ حساب شائع ہوا کریگا۔

"سیکرٹری"

تفصیل اخراجات اشاعت

(۱) پوسٹر جلسہ نمبر ۱ ۲۶×۲۰ تعداد ۵۰۰

	روپے	آنہ	پائی
کاغذ ایک رم	۳	۸	۰
لکھائی	۴	۰	۰
چھپائی	۳	۸	۰
	۱۱	۰	۰

(۲) پوسٹر جلسہ نمبر ۲ ۲۶×۲۰ سائز تعداد ۵۰۰

	روپے	آنہ	پائی
کاغذ ایک رم مفت مل گیا تھا	۔	۔	۔
لکھائی	۴	۰	۰
چھپائی	۳	۸	۰
	۷	۰	۰

(۳) پوسٹر بڑا مستقل ۲۹×۲۲ سائز ۔ تعداد ۱۵۰۰

لکھائی	۰ — ۰ — ۵
چھپائی	۰ — ۰ — ۸
کاغذ تین رم	۰ — ۰ — ۲۱
	۰ — ۰ — ۳۴

(۴) مجوزہ رسالہ بہار کا سہ رنگ پوسٹر ۲۹×۲۲ سائز تعداد ۱۰۰۰

لکھائی ۔ مولوی غلام رسول نے مفت لکھ دیا تھا۔

چھپائی	۰ — ۰ — ۱۲
کاغذ	۰ — ۸ — ۱۳
	۰ — ۸ — ۲۵

(۵) بھلہ شو کمپنی کا انعامی اعلان تعداد ۵۰۰

لکھائی	۰ — ۰ — ۲
چھپائی	۰ — ۰ — ۳
کاغذ	۰ — ۵ — ۳
	۰ — ۵ — ۸

(۶) انجمن کے اغراض و مقاصد سائز $\frac{۱۷ \times ۲۷}{۸}$ تین کاپیاں } تعداد ۱۰۰۰

لکھائی فی کاپی چار روپے کے حساب سے	۰ — ۰ — ۱۲
چھپائی	۰ — ۰ — ۱۲
کاغذ تین رم ولایتی	۰ — ۰ — ۲۱
جلد بندی	۰ — ۰ — ۲
	۰ — ۰ — ۴۷

(۷) رسید بہیاں ۲۰ جلدیں تعداد ۲۵۰۰

لکھائی	۰ — ۰ — ۲
زمین کی چھپائی	۰ — ۰ — ۴
اصل چھپائی	۰ — ۰ — ۴
جلد بندی	۰ — ۰ — ۲
کاغذ	۰ — ۰ — ۳
	۰ — ۰ — ۱۵

(۸) ٹکٹ داخلہ برائے جلسہ ادبی تعداد ۱۰۰۰

کاغذ	۰ — ۱۲ — ۱
لکھائی	۰ — ۰ — ۱
چھپائی	۰ — ۰ — ۲
	۰ — ۱۲ — ۴

(۹) انجمن کا لیٹر فارم تعداد ۵۰۰

لکھائی	۰ — ۰ — ۱
چھپائی	۰ — ۸ — ۲
کاغذ	۰ — ۰ — ۲
	۰ — ۸ — ۵
میزان کل	۰ — ۹ — ۱۵۸

ڈاک کا خرچ

(۱) بھلّہ شو کمپنی کا اعلان اینگلو انڈین اخبارات کو چھوڑ کر تمام انگریزی اردو اخبارات اور رسالجات کو بھیجا گیا۔ تمام اہل قلم اور ہندوستان بھر کے شعراء کو شرکت مقابلہ کے لئے روانہ کیا گیا ارسال اعلان میں ایک نادانستہ غلطی ہو گئی۔ وہ یہ کہ بجائے دو پیسے کے ٹکٹ لگانے کے ایک ایک آنہ کے تین سو لفافے خرید کر بند لفافے روانہ کئے گئے۔

تین سو لفافے ۰ — ۱۲ — ۱۸

(۲) انجمن کے مطبوعہ قواعد و مقاصد۔ تمام اخبارات رسالجات اہل قلم اور عمائد ہندوستان کو بھیجے گئے۔ دو سو صرف لاہور میں اور ۵۴۰ باقی ہندوستان میں کل ۵۴۰ روانہ کئے گئے پانسو چالیس پیکٹ۔ فی پیکٹ دو پیسے کے حساب سے

۰ — ۴ — ۱۶

(۳) سال بھر میں بارہ جلسے ہوئے۔ سات جلسوں کے لئے فی جلسہ کے لئے فی جلسہ ایک روپے کے لفافے اور تین روپے کے پوسٹ کارڈ شہر میں دعوتی خطوط بھیجنے کے لئے فی جلسہ چار روپے دعوتی خطوط کے لئے سات جلسے

۰ — ۰ — ۲۸

چار جلسوں میں کچھ خطوط چپراسی سے تقسیم کرائے اور ایک روپیہ فی جلسہ ڈاک ذریعہ بھیجے گئے۔ ۰ — ۰ — ۴

میزان کل ۰ — ۱۰ — ۹۶

اخراجات مجالس ادبیہ

سال بھر میں انجمن کے گیارہ عام جلسے ہوئے جن میں ایک جلسہ یونیورسٹی کیمیکل لیبوریٹری میں ہوا باقی ایس پی ایس کے ہال میں۔

تفصیل اخراجات

(۱) ایس پی ایس کے ہال کا دس ماہ کا کرایہ ۰ — ۰ — ۵۰

ہال کے چپراسی کو ہر جلسہ پر ایک روپیہ انتظام وغیرہ کا۔ ۰ — ۰ — ۱۰

سقّہ۔ دریاں اٹھانے پہنچانے والا قلی دس ماہ کا ۰ — ۰ — ۷

(۲) ہر جلسہ کی ترغیب شرکت کے لئے کم سے کم دو گردشیں ٹانگے پر اہل قلم اور عمائد شہر کے پاس کرنی پڑتی ہیں۔ سال بھر کے ٹانگوں کا خرچ ۰ — ۰ — ۲۶

(۳) ہر جلسہ کے لئے سوائے لیبوریٹری کے جلسے کے کرایہ پر دریاں منگائی گئیں۔

دس جلسوں کی دریوں کا کرایہ ۰ — ۰ — ۳۰

(۴) ہر جلسے کے انگریزی اعلان اور رپورٹیں انگریزی اخبارات کو بھیجی گئیں۔ سال بھر کا ٹائپ کا خرچ ۰ — ۰ — ۱۸

(۵) بھلّہ شو کمپنی کا اعلان ترجمہ کرا کے ہندوستان بھر کے مشہور انگریزی اخبارات کو بذریعہ رجسٹری بھیجا گیا۔ ۰ — ۰ — ۸

(۶) مختلف جلسوں میں علاوہ دیگر حضرات کے تین نقرئی تمغے انجمن نے انعامی مقابلے کے لئے دئے ۰ — ۱۲ — ۱۲

(۷) اجلاس کمیٹی کے ۲۵ ممبروں کے لئے مخمل کشیدہ کاری

کے زرین بلّے　　۰ — ۰ — ۲۵

نوٹ:۔ زائد روپے خود رضاکاروں نے دئے۔

میزان کل　　۰ — ۱۲ — ۱۹۶

اخراجات وفود

گذشتہ سال گوجرانوالہ، جموں، فیروزپور، شملہ، ان چار مقامات پر انجمن کے وفد بھیجے گئے۔ گوجرانوالہ کا خرچ اہل شہر نے دیا۔ اور باقی مقامات انجمن نے بتفصیل ذیل

خرچ جموں　　۰ — ۰ — ۷

فیروزپور دو ممبر　　۰ — ۰ — ۸

شملہ ۱۹ آدمی وفد میں شریک تھے۔ گیارہ نے کرایہ انجمن سے لیا۔ بعض نے خرچ خوراک نہیں لیا۔ فی آدمی ۸ — ۰ — ۱۵

ایک ممبر نے ایک طرف کا کرایہ نہیں لیا۔

کل خرچ وفد شملہ کا　　۰ — ۰ — ۱۵۸

میزان کل　　۰ — ۰ — ۱۷۴

اخراجات دفتر

کرایہ دفتر دس روپے ماہوار کے حساب سے　　۰ — ۰ — ۴۰

تنخواہ ملازم منشی گیارہ ماہ کی　　۰ — ۰ — ۱۶۵

سائن بورڈ　　۰ — ۰ — ۵

مہر　　۰ — ۰ — ۳

اسٹیشنری رسالہ بہار حضرت اختر شیرانی کو دئے گئے۔　　۰ — ۰ — ۵

اسٹیشنری، قلمدان، پیڈ، لفافے وغیرہ　　۰ — ۰ — ۵

دو رجسٹر　　۰ — ۰ — ۲

میزان کل　　۰ — ۰ — ۲۲۵

تفصیلات آمد

نظم کے ۹ جلسوں میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ۲ر تھا

آمد فروختگی ٹکٹ

اکتوبر ۱۹۲۴ء	۰ — ۰ — ۴۹
نومبر "	۰ — ۰ — ۴۷
دسمبر "	۰ — ۰ — ۳۷
جنوری ۱۹۲۵ء	۰ — ۰ — ۴۵
فروری	۰ — ۲ — ۳۶
مارچ	۰ — ۲ — ۴۶

اپریل جلسہ نثر بے ٹکٹ ہوا

مئی	۰ — ۸ — ۵۲
جون	۰ — ۱۲ — ۱۹
اکتوبر	۰ — ۴ — ۳۱

میزان کل　　۰ — ۴ — ۳۶۴

چندۂ ممبری مندرجہ رجسٹر

از اکتوبر ۱۹۲۴ء تا اکتوبر ۱۹۲۵ء

۲۹۸ — ۰ — ۰

یکمشت ۲۲ — ۰ — ۰

۳۱۰ — ۰ — ۰

خلاصہ آمد

مجلس ادبیہ	۰ — ۴ — ۳۶۴
چندہ ممبری	۰ — ۰ — ۲۹۸
یکمشت	۰ — ۰ — ۲۲

میزان کل آمد سال ۰ — ۴ — ۶۸۴

خلاصہ آمد و صرف

آمد	صرف
۰ — ۴ — ۶۸۴	۰ — ۱۵ — ۸۱۸

۰ — ۱۵ — ۸۱۸

۰ — ۴ — ۶۸۴

بذمہ انجمن ۰ — ۴ — ۱۳۴

سیکرٹری نے انجمن سے اپنے اخراجات وفود شملہ فیروزپور۔ جمّوں نہیں لئے۔ اس طرح انجمن کے قرضہ میں سے ۰ — ۱۲ — ۲۶ اور گھٹ گئے۔

۰ — ۱۱ — ۱۳۴

۰ — ۱۲ — ۲۶

بذمہ انجمن ۰ — ۱۵ — ۱۰۸

خرچ کی زیادتی شملہ کے سفر کی وجہ سے ہوئی۔ محترم صدر انجمن کی تحریک پر انجمن کا وفد شملہ گیا تھا۔ اس وقت انجمن کا فنڈ بالکل برائے نام تھا۔ سیکرٹری نے محترم صدر کے یہ امید دلانے پر کہ شملے سے انجمن کو روپیہ مل سکیگا۔ اپنی جیب سے گیارہ ممبران وفد کا کرایہ آمد و رفت ادا کیا۔ شملہ میں چندہ کی تحریک نہیں ہو سکی۔ تاہم شملہ کی مجلس استقبالیہ نے اپنا پس انداز ۰ — ۸ — ۸۹ بھیجدیا۔ اس کا حساب فائینشل سکرٹری آیندہ نمبر میں شائع کریں گے۔

تاجور سیکرٹری

انجمن اربابِ علم

از آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے۔ بیرسٹرایٹ لا۔ پریزیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل صدر انجمن اربابِ علم

سات سال ہوئے لاہور میں چند علم دوست حضرات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ادبِ اُردو کو ترقی دینے کے لئے اور اردو زبان کی
خدمت کے لئے ایک انجمن قائم کیجائے۔ اس خیال کے سب سے بڑے حامی اور مؤید ہمارے دوست مولنا احسان اللہ خاں صاحب تاجور
تھے۔ جو اُن دنوں مدیر مخزن بھی تھے۔ اور اُن کے حلقۂ احباب میں ہندو اور سکھ شائقینِ ادب شامل تھے۔ جو اپنے علمی مضامین سے اوراقِ مخزن کو
بھی وقتاً فوقتاً مزین کرتے رہتے تھے۔ ان صاحبوں میں پنڈت میلا رام صاحب وفا۔ پنڈت ونتہ پرشاد صاحب فدا اور سردار اودے سنگھ صاحب
شائق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دوستوں نے باہم مشورہ کرکے انجمن اربابِ علم کی بُنیاد ڈالی۔ اور اس کے زیرِ سایہ بزمِ مشاعرہ گرم ہوئی جو روز بروز
زیادہ ہردلعزیز ہوتی گئی۔ مجھے بھی اس انجمن کے قیام سے دو سال بعد اس میں شرکت کا موقعہ ملا۔ اور اس وقت سے وہ تعلق مسلسل قائم ہے
اس انجمن کی جو بات مجھے دل سے پسند آئی وہ یہ تھی کہ اس نے مذہبی اور سیاسی مخمصوں سے اپنے آپکو ہمیشہ الگ رکھنے کی کوشش کی۔ اور
خالص ادبی خدمت کو پیش نظر رکھا۔ اسکے کارکنوں میں ہر مذہب وملت کے آدمی ہر وقت موجود رہے۔ بلکہ جو لوگ اپنا کلام وہاں پڑھتے رہے ان
میں بھی ہندو مسلمان سکھ سب شامل تھے۔ مجمع میں بھی ہمیشہ یہی شان نظر آتی رہی۔ بوڑھے جوان۔ انگریزی خوان اور اُردو خوان سرکردہ
رہنمایانِ قوم اور ہونہار طلبہ کیا ہندو کیا مسلمان سب ذوق وشوق سے شریک ہوتے ہیں۔ اور حاضرین کی تعداد ہر جلسہ میں پہلے سے
زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ صدارت کے لئے بھی جہاں بعض مسلمان منتخب ہوتے رہتے ہیں متعدد ہندو ماہرانِ سخن کا انتخاب ہوا۔ گویا اس انجمن نے
اُردو زبان کی خدمت کا شوق رکھنے والوں کے مختلف طبقوں کو یکجا ہوکر اس ذریعہ سے ملک کی بہتری کی علمی کوشش کا موقعہ دیا۔ اب اس کی
گزشتہ کامیابی سے کارکنانِ انجمن کی اسقدر حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ کہ اُن کا ارادہ ہے کہ اس کے اغراض ومقاصد کو وسیع تر کریں۔ زبان
کو زیادہ آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش کریں۔ تاکہ نہ اُس میں عربی الفاظ کی ضرورت سے زیادہ بھرمار ہو نہ سنسکرت الفاظ تکلف
سے لائے جائیں۔ قدرتی طور پر جیسے کہ عام بول چال کا محاورہ ہے۔ اسی کا زیادہ رواج ہو۔ اُردو شاعری جو جدید ضروریات کے مطابق
بہت کچھ قابلِ اصلاح ہے۔ اس کی اصلاح کیجائے۔ اردو کے علمی ذخیروں میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ کوئی ملک بغیر اس کے ترقی نہیں
کرسکتا۔ کہ اس کی اپنی زبان میں اس کے علمی ذخیرے موجود ہوں۔ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جو ذریعے سوچے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔
کہ ایک خالص علمی اور ادبی رسالہ انجمن کی طرف سے نکلا کرے۔ جس میں اُن مضامین نظم ونثر کا انتخاب چھپتا رہے جو انجمن کے جلسوں میں
پڑھے جائیں۔ اور انجمن کی سرپرستی میں ایک مدرسہ شبینہ قائم ہو۔ جو ایک سرچشمۂ علم ہو جس سے وہ تشنگانِ ادب اپنی پیاس بجھائیں۔ جن کی تعلیم
ناموافق حالات کے سبب ادھوری رہگئی ہو۔ اسکے ساتھ ایک ادبی کتبخانہ اور ریڈنگ روم ہو۔ جہاں شائقین کو کتابیں اور اخبارات بیسر آسکیں۔
اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ اغراض نہایت مفید اور کار آمد ہیں۔ امید ہے کہ مُلکی زبانوں کی ترقی کے سب ہواخواہ اور سب
علمدوست حضرات ان اغراض کی تکمیل میں انجمن کا ہاتھ بٹائینگے۔ اور اس کے فاضل سکرٹری مولنا تاجور صاحب اور ان کے دیگر مددگاروں
کی اَن تھک کوششوں کی علمی داد دیکر مُلک وقوم کی خدمت کریں گے۔

عبدالقادر

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

جانِ ظرافت - ایک بزمیہ ڈراما ہے۔ جس میں ایک بخیل کے بخالت آمیز کارنامے ہنسی دل لگی میں سینکڑوں کام کی باتیں بتاتے ہیں۔ اصل کتاب مولییر سے ماخوذ اور اس میں وہ تمام چٹکیاں مستور ہیں۔ جو جرمنی کے مشہور ڈراما نگار لیسنگ اور فارس میں ڈراما کے موجد آغا جعفر کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ بہت کچھ باتیں مصنفین کی طبعزاد ہیں۔ غرضکہ اس زعفران کی بالیدگی کے لئے کئی شاداب چمنوں کی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ متین اور مہذب ظرافت کا بہترین نمونہ ہے۔ ریاست کشمیر کے سکولوں کے لئے منظور ہوئی۔ اس کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ عالیجناب سر ڈاکٹر اقبال نے اس کا ڈیڈیکیشن منظور فرمایا ہے۔ قیمت ۸ر مجلد۔

قزاق - جرمنی کے شہرہ آفاق فلسفی شاعر اور ڈراما نگار شلر کے ایک دلفریب ڈراما کو ہندوستانی مذاق کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے نشیب و فراز، اعمالِ بد کے مآلِ کار اور محبت کے حقیقی معیار کا مرقع پیش کیا ہے۔ سوز و گداز کے مناظر دل کو لبھاتے ہیں۔ ایڈیٹر رسالہ اردو اس کی زبان کو فصیح اور شاندار تصور کرتے ہیں۔ اور جناب لالہ کنور سین صاحب ایم۔اے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر اسے ازحد دلچسپ خیال فرماتے ہیں قیمت مجلد ۸ر

ظفر کی موت :- بلجیم کے چابکدست اور محیر العقول ڈراما نگار میٹرلنک کی ایک سنگلاخ تصنیف کا سلیس ترجمہ مع حواشی جس میں ایک ان کی محبت کا جلوہ دکھا کر ان جذبات کو نمایاں کیا ہے جو انسان کے دل ہی میں رہتے ہیں۔ اور جنکا اظہار زبان سے نہیں ہو سکتا انہیں جذبات کا اظہار میٹرلنک کی خصوصیت ہے عجب پُر تاثیر کتاب ہے۔ جسکے مطالعہ کے بعد بھی رقت طاری رہتی ہے قیمت ۴ر

بگڑے دل - فرانس کے ستم ظریف ڈراما نگار مولییر کی بہترین تصنیف کا آزاد ترجمہ مبصروں کی رائے میں حسنِ زبان، اندازِ بیان کے لحاظ سے اس کومیڈی کا جواب ادبیاتِ عالم میں ناپید ہے۔ اور اشعار نگاری کا اس سے بہتر نمونہ ملنا ناممکن ہے اس ڈراما میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص بے محابا صداقت شعاری کے ہاتھوں کن الجھنوں میں پھنستا ہے۔ قیمت مجلد ۸ر

تین ٹوپیاں - جو دورِ جدید کی ایک فرانسیسی فارس کا عکس ہے۔ قیمت مجلد ۸ر

ملنے کا پتہ :- **مینیجر دی اردو ہاؤس چیمبرلین روڈ۔ لاہور**

اُردو کا ماہانہ رسالہ شمع آگرہ

جنوری ۱۹۲۵ء سے شمع نہایت آب وتاب سے شائع ہورہا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ، غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ اور تاریخی۔ سیاسی۔ اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ اعلےٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں۔ اور محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں اس میں کوئی ذاتی فایدہ شامل نہیں۔ اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہر ماہ میں پابندیٔ وقت سے شائع ہوتا ہے۔ تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم ۱۱۲ صفحہ قیمت سالانہ چھ روپے۔ نمونہ کا پرچہ ۱۰؍

المشتہر مینجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ

درسِ حیات

مصنفہ محمد اکبر مرادپوری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے عموماً اور طلبار کے لئے خصوصاً نہایت ہی مفید ہے۔ اگر ایک ناکارۂ محض اور سست الوجود نوجوان اسے ایک دفعہ پڑھ لے، تو یقین ہے۔ کہ وہ زندگی کے اصلی مقصد کو ضرور سمجھ جائیگا۔ اس میں جگہ جگہ ہر مذہب ملّت کے بزرگوں اور مشاہیر کے اسوۂ حسنہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ کس طرح دُنیا کے بعض نامور اور لائق آدمی قعرِ گمنامی میں سے نکل کر بامِ عظمت پر پہنچے۔ مختلف عنوانوں کے ماتحت زندگی کے مختلف مدارج پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً مشکلات کا مقابلہ۔ مصائب کے فوائد۔ کیرکٹر۔ خودداری جدوجہد کتب بینی۔ وقت کا استعمال۔ زر کا استعمال۔ خود ضبطی۔ دوستی۔ مطالعہ۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے آج کل کے نوجوان طلبا کس طرح اپنی زندگی کا اصلی مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ بڑھیا۔ ضخامت ۲۱۸ صفحات قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک طلبا کیلئے ازحد مفید ہے

مینجر اردو ہاوس چیمبرلین روڈ لاہور سے طلب کریں

کیا آپ ہندوستانی ہیں

؟ اگر آپ ہندوستانی ہیں تو آیورویدک ادویات آپ کو جو فایدہ پہنچایئں گی، وہ دیگر ادویہ سے غیر ممکن ہے۔ کیونکہ آپ کا جسم ہندوستانی آب و ہوا کا پروردہ ہے۔ اور آیورویدک ادویہ ہندوستانی آب و ہوا کے عین موافق ہیں۔ لیکن اگر ان کے تیار کرنے کا طریقہ درست نہ ہو، تو یہ بھی مفید نہیں ہوتیں۔ آیورویدک ادویہ کی جان اور آیورویدک کا لب لباب جو نہایت جانفشانی اور دماغ سوزی کرکے تیار کی گئی ہے۔ وہ مقویات سرتاج عالم

آتنک نگرہ گولیاں

ہیں۔ جو تقریباً نصف صدی سے ہندوستان اور ممالک غیر میں اپنی فتحمندی کا ڈنکا بجا رہی ہیں اور روز بروز ترقی کر رہی ہیں۔ ہر قسم کی کمزوری کو رفع کرکے اعلیٰ درجہ کی طاقت اور توانائی دیتی ہیں۔ قبضیت۔ بدہضمی۔ خون کی خرابی۔ کمی دیریہ اور ہر قسم کی شکایت جریان۔ نامردی۔ احتلام۔ رقت منی وغیرہ دُور کرکے پُوری صحت بخشتی ہیں۔ انسان کی ٹوٹی ہوئی زندگی از سر نو درست کرتی ہیں۔ قیمت رفاہ عام کی غرض سے فی ڈبیہ صرف ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیہ چار روپے۔

المشتہر:۔ ویدشاستری مالک آتنک نگرہ اوشدھالیہ۔ جام نگر (کاٹھیاواڑ)

ایجنٹ:۔ لالہ بھگت رام پوری سوتر منڈی۔ لاہور

فطرت نگار سُدرشن کو پانسو روپیہ انعام

گورنمنٹ پنجاب نے فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کتاب پر انہیں پانسو روپیہ انعام دیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب کیسی ہوگی اور اسمیں کیا ہوگا مگر سچ کہا جائے تو اُنکی ہر ایک کتاب اس قابل ہے کہ اُس پر کئی کئی ہزار روپیہ انعام دیا جائے۔ یہ کتاب مصنف نے ہندی میں لکھی تھی۔ اور اب احباب کے اصرار پر خود ہی اسکا اُردو ترجمہ کر کے شائع کرا دیا ہے۔ اس اُردو کتاب کا نام **محبّت کا انتقام** ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ محبّت جب انتقام کی بھوکی ہو جاتی ہے۔ تو کیا کرتی ہے۔ محبّت کا ایثار کئی مصنفوں نے لکھا ہے مگر محبّت کا انتقام لکھنا قدرت نے سُدرشن کے لئے اُٹھا رکھا تھا۔ اور اب وہ چیز تیار ہے اگر آپ کو عورت کی فطرت اور محبّت کا فلسفہ نیز انسانی دل کی بلندیوں اور پستیوں کا علم حاصل کرنا ہو۔ تو محبّت کا انتقام دیکھئے۔ زبان پُر سحر۔ کاغذ چکنا۔ کتابت حسین۔ چھپائی پیاری۔ عورت، مرد، بچّے بوڑھے سب کے کام کی چیز ہے۔ **قیمت عہ/ر**

چندن اس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی پندرہ دلچسپ کہانیاں درج ہیں ہر کہانی پڑھکر یہی خیال گزرتا ہے۔ کہ اس سے اچھی کہانی مصنّف بھی نہ لکھ سکیگا مگر ہر دوسری کہانی اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ گورنمنٹ پنجاب نے **محبت کا انتقام** پر انعام دیا ہے لیکن سُدرشن کی نگاہوں میں چندن کا درجہ اُس سے بہت بلند ہے۔ اور اُنہیں اس کتاب کے مصنف ہونے پر فخر ہے۔ دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے۔ **قیمت ۱عہ/ر** سُنہری ریشمی جلد دو روپے

بہارستان فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ جس کی مصنف کو خود ناز ہے اور جسکے متعلق کئی دوستوں کی رائے ہے کہ یہ سُدرشن کا ماسٹر پیس ہے۔ اگر آپکو بہترین کہانیاں دیکھنا ہو۔ تو بہارستان دیکھئے۔ جسکے مقابلہ کی کتاب اُردو زبان میں آج تک شائع نہیں ہوئی۔ بینظیر کہانیاں ہیں، زبان صاف، پلاٹ دلکش۔ نتیجے دلمیں اُتر جانیوالے، کاغذ خوبصورت۔ طباعت نہایت حسین اور چھپائی پیاری، دیباچہ منشی پریم چند جی نے لکھا ہے۔ قیمت [illegible] سنہری ریشم جلد [illegible]

قوم پرست یہ کتاب بنگال کے شہرہ آفاق ڈراماٹسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے کے ایک ناٹک کا ترجمہ ہے مگر خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ انسانی جذبات کا موجیں مارتا ہوا سمندر دیکھنا ہو۔ تو یہ کتاب پڑھیئے۔ جو آپ کی آنکھوں سے زبردستی آنسو نچڑوا لیگی عہ/ر

چٹکیاں نئی طرز، نئی ادا، درختوں، پتھروں اور ندی نالوں کے سر من۔ چاند تاروں کے اور پھولوں پھلوں کے لذّت آشنا خیالات، ایک ایک مضمون میں مصنّف نے دل نکال کر رکھدیا ہے دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ قیمت چار آنے ۔ ۔ ۔ (۴ر)

کُنج عافیت یہ ناول غضب کا دلفریب ہے۔ جس میں ہندوستانی عورت کا بلند ترین چلن دکھا کر اُس کے ساتھ یوروپین عورت کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس ناول کو خود پڑھیئے آپ ہندوستانی ہونے پر فخر کرنے لگینگے۔ اپنی بیوی کو پڑھا [illegible]

تہذیب کے تازیانے

بنگال کے نامور ناول نویس بابو بنکم چٹرجی کی شہرت اُنکی کتابوں میں ہے، اور اُنہی کتابوں کی روح وہ مضامین ہیں۔ جنکا ترجمہ فطرت نگار سُدرشن نے تہذیب کے تازیانے کے نام سے کرکے اردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے نقادانِ ادب کی رائے ہے کہ ایسی کتاب اُردو میں آج تک شائع نہ ہوئی تھی ۱۲ر

بنگال کی ۲۲ بیبیاں

بنگال کے مشہور قصہ نویس بابو رابندرناتھ ٹیگور، پربھات کمار۔ ستیا دیوی۔ شانتا دیوی۔ نروپما دیوی۔ جلدھر سین۔ شرت چندر۔ سورن کماری وغیرہ وغیرہ قابل قدر ہستیوں کے تیس افسانے۔ قیمت حصہ اوّل (عہ) حصہ دوم ۱۲ر

بیگناہ مجرم

اس ناول میں فطرت نگار سدرشن نے فرانسیسی اور بنگالی انشاپردازی کو یکجا کر دیا ہے۔ اور اسپر طرہ یہ کہ اُردو ادب کی شان کو میلا نہیں ہونے دیا۔ ایسا پُراثر، ایسا پُرلطف اور ایسا پُرسبق ناول آپنے آجتک نہ دیکھا ہوگا دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اب تیسرا شائع ہُوا ہے۔ قیمت عہ

صبح وطن

حُبِ وطن کے قصے، جان فروشی کی کہانیاں بہادری اور دلیری کے زندہ واقعات کاغذ کے سٹیج پر۔ اُن سورماؤں کی کہانیاں ہیں۔ جو شہرت کے پلیٹ فارم پر آئے بغیر ملک کے لئے شہید ہوئے یہ اُن سربکف دلاوروں کے افسانے ہیں۔ جنہوں نے اپنا متاعِ دل تاریکی وطن پر نثار کیا۔ دوسرا ایڈیشن ختم ہونیوالا ہے۔ قیمت عہ

آنریری مجسٹریٹ

یہ واقعہ ڈراموں کا شہنشاہ ہے اعلان کردو۔ کہ ہندوستان کی کسی زبان میں بھی ایسا تفریحی ڈراما آجتک نہیں شائع ہُوا۔ ایک ایک فقرہ قہقہوں سے بھرا ہے۔ فرانس کے مشہور ناٹک نویس مولیئر کے بہترین ڈراما کے مقابلہ کا ہے۔ قیمت ۸ر

مَن کی موج

یہ کتاب "چٹکیاں" کی بہن ہے۔ وہی رنگ، وہی انداز، وہی طرز، وہی ادا پیرایہ ایسا مذاقیہ کہ آپ پڑھ کر لوٹ جائیں مگر نتائج ایسے سنجیدہ کہ آپ دل پکڑ لیں اور مصنف کی قابلیت پر عش عش کر اُٹھیں۔ پہلے ایڈیشن میں ۹۶ صفحے تھے اور قیمت ۸ر اب حجم بڑھا کر ۱۴۴ صفحے کر دیا گیا ہے قیمت ۱۲ر

عورت کی محبت

عورت کی محبت اور پھر بنگالی عورت کی۔ اور خاصکر اُس صورت میں جبکہ اسکا لکھنے والا بنگال کا نہیں بلکہ موجودہ ایشیا کا شیکسپیئر ڈی۔ ایل رائے ہے اور اُسے ترجمہ فطرت نگار سُدرشن نے کیا ہو۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ قیمت عہ

سدابہار پھول

اس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی اٹھارہ کہانیاں ہیں۔ ان کا پلاٹ بیحد دلچسپ ہے۔ پڑھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے یہ فطرت نگار کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ جس نے اُن پر شہرت کا در وا کیا تھا تین ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ اب چوتھا ایڈیشن چھپا ہے قیمت ۱۲ر

زہریلا انجام

مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ایک ہندو سلطنت قائم ہوئی اور پھر ہندو حکمران ہی کی غلطیوں کی بدولت پاش پاش ہو گئی۔ کس طرح؟ یہ پڑھ کر دیکھئے۔ اصل ناول بنگالی زبان میں ہے اور مشہور ناول نویس بابو بنکم چندر چٹرجی کے قلم سے ہے فطرت نگار سُدرشن نے اسے اُردو جامہ پہنایا ہے دوسرا ایڈیشن عہ

وجے سنگھ

سوتیلی ماں کیا کچھ کر سکتی ہے باپ محبت پدری کے جوش میں کس طرح دیوانہ ہو جاتا ہے۔ عالم شباب میں حسن و عشق کیا کیا رنگ بدلتے ہیں یہ سب کچھ اس کتاب میں دیکھئے۔ انسانی فطرت کا ایسا صحیح بیان اور کہیں نہ ملیگا۔ قیمت عہ

گلدستۂ سخن

اگر آپکو اُردو زبان کے شاعروں کی بہترین نظموں کا انتخاب دیکھنا ہو تو یہ کتاب دیکھئے۔ اگر آپکو مولانا حالی۔ حضرت آزاد۔ ڈاکٹر اقبال سرور۔ چکبست۔ محروم۔ ارشد۔ وفا۔ مہر۔ نیرنگ۔ ناظر۔ نادر۔ برق۔ اُفق کی کلام زندہ جاوید سے فائدہ اُٹھانا ہو۔ تو یہ کتاب دیکھئے۔ شروع میں اُردو شاعری کی تاریخ پر ۴۸ صفحے کا ایک پُرزور دیباچہ بھی ہے۔ قیمت (عہ) سُنہری ریشمی جلد (عہ)

ملنے کا پتہ: **مینیجر رام گُلیا بُک ڈپو۔ لاہور**

۳۲	ابوالاعجاز حضرت سیفی صاحب سہاروی ایڈیٹر پریم	عہ/
۳۳	سیّد عابد علی صاحب عابد بی اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۳۴	میاں محمد صادق صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج	عہ/
۳۵	خواجہ سید احمد صاحب رفیقی ممبر مجلس ادبا	عہ/
۳۶	پروفیسر نثار احمد صاحب ایم۔اے اسلامیہ کالج مجلس ادبا۔	عہ/
۳۷	پروفیسر عبدالحکیم صاحب ایم اے اسلامیہ کالج مجلس ادبا۔	عہ/
۳۸	پروفیسر محمد عبداللہ صاحب ایم اے اسلامیہ کالج مجلس ادبا	عہ/
۳۹	پروفیسر سعادت علی صاحب ایم اے اسلامیہ کالج مجلس ادبا۔	عہ/
۴۰	پروفیسر محمد یوسف صاحب ایم اے اسلامیہ کالج مجلس ادبا۔	عہ/
۴۱	مولوی چراغ الدین صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج مجلس ادبا۔	عہ/
۴۲	پروفیسر عبدالمجید صاحب ایم اے اسلامیہ کالج رکن مجلس ادبا	عہ/
۴۳	چوہدری رحیم بخش صاحب پروفیسر لاء کالج ممبر مجلس ادبا۔	عہ/
۴۴	پنڈت رام رکھامل صاحب طالب لکھنوی ٹیلیگراف آفس لاہور ممبر مجلس ادبا	عہ/
۴۵	منشی قاسم علی خاں بدایونی بلڈنگ مولوی عالم دین وکیل شیخوپورہ	عہ/
۴۶	مسٹر علی اکبر خاں صاحب پلس سیکرٹری انجمن	عہ/
۴۷	مسٹر سلامت اللہ شاہ صاحب بی اے (جامعہ) آکسن روم روڈ لاہور	عہ/
۴۸	چوہدری فضل الٰہی عالی بی۔اے	عہ/
۴۹	شیخ محمد جمیل صاحب آنرری اسسٹنٹ سیکرٹری مجلس نظم	عہ/
۵۰	ڈاکٹر محمد عالم صاحب بی اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لاء ممبر مجلس ادبا۔	عہ/
۵۱	سیٹھ عبدالمجید صاحب مالک جاپان ہاؤس	عہ/
۵۲	شیخ عطاء اللہ صاحب اقبال منزل مزنگ روڈ لاہور	صہ/
۵۳	ڈاکٹر نند لال صاحب ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لاء سرپرست	صہ/
۵۴	مسٹر ہادی حسین صاحب قریشی صدیقی بی اے ایڈیٹر ہزار داستان رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۵۵	بخشی مہاراج کرشن صاحب مہتمم اجلاس ۱۲ میکلوڈ روڈ لاہور	عہ/
۵۶	مسٹر محمد صدیق صاحب رکن مجلس ادبا۔	عہ/
۵۷	اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی رکن مجلس ادبا	عہ/
۵۸	شیخ غلام جیلانی صاحب تاجر خیمہ رئیس لاہور	عہ/
۵۹	مسٹر ایم اے مقبول جنرل پوسٹ آفس لاہور	عہ/
۶۰	مسٹر روشن لال نیر دفتر پریم	عہ/
۶۱	صاحبزادہ محمد عمر صاحب جرنلسٹ لاآفس جموں	صہ/
۶۲	مسٹر خوشتر گرامی دفتر روزانہ بھیشم اخبار	عہ/
۶۳	میاں افتخار الدین صاحب رئیس باغبانپورہ چیفس کالج فسٹ بورڈنگ	عہ/
۶۴	مسٹر محمد اسلم خاں صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل میانوالی	عہ/

قواعد و ضوابط

۱۔ ہزار داستان کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی آخری تاریخ ہے۔

۲۔ ہزار داستان کا مقصدِ اوّلین افسانہ نویسی کا فروغ ہے لیکن علمی و ادبی مضامین بھی معیار پر پورے اتریں تو درج کئے جائینگے۔

۳۔ مذہبی مضامین اور خاصکر دلشکن مذہبی مضامین درج نہیں ہو سکتے۔

۴۔ جواب طلب خطوط کے ہمراہ ایک آنہ کا ٹکٹ ارسال کیا جائے۔

۵۔ کوئی ایسا اشتہار شائع نہ ہوگا جو خلافِ تہذیب ہو۔ اشتہارات کے لئے خط و کتابت مینیجر اشتہارات سے ہونی چاہئے۔

۶۔ سالانہ قیمت چھ روپے ششماہی تین روپے چار آنہ۔ نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جاتا۔ اس کے لئے ۱۰/ کے ٹکٹ آنے چاہئیں

۷۔ ناپسندیدہ مضامین کا ہم ذمہ نہیں لیتے۔

۸۔ ہزار داستان کی ضخامت کم از کم ۸۰ صفحے ماہوار ہے۔

۹۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک پہنچ جانی چاہئے۔ اسکے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ نرخنامہ اشتہارات حسب ذیل ہے:۔

پیمانہ صفحہ	ایک اشاعت	دو اشاعتیں	چھ اشاعتیں	بارہ اشاعتیں
پورا صفحہ	مغر/	۱۲/	۳۳/	۶۰/
نصف صفحہ	للعہ۴/	معہ/	۱۸/	ــہ/
چوتھائی صفحہ	۶/۸	للعہ/	۱۰/	۱۸/

مینیجر ہزار داستان چیمبرلین روڈ۔ لاہور

۴۸۶

انجمن ارباب علم پنجاب

کا

ماہوار رسالہ

ہزار داستان

مرتّبہ

سیّد عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی وکیل۔ محمد ہادی حسین قریشی بی اے (آنرز)

(مدیر اعزازی) (مدیر)

زیر نگرانی

خان بہادر شیخ عبد القادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا، صدر انجمن

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ایم ایس سی ڈی ایس سی نائب صدر

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی رکن انجمن

بلیغ الملک علّامہ تاجور نجیب آبادی سیکرٹری

فہرست اسمائے گرامی حضرات ارکین مجلس ادبا و مجلس انتظامیہ و مربیان

نمبر شمار	
۱	ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی سی آئی ای سرپرست
۲	خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا۔ صدر مجلس انتظامیہ
۳	ڈاکٹر شانتی سروپ صاحب بھٹناگر ایم ایس سی
۴	ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایم۔اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا نائب صدر
۵	راجہ نریندر ناتھ صاحب ایم اے ایم ایل سی بیرسٹرایٹ لا۔ صدر مجلس شعرا۔
۶	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی
۷	خواجہ دل محمد صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج نائب صدر مجلس شعرا۔
۸	لالہ کشوری موہن منتزا ایم اے پروفیسر دیال سنگھ کالج نائب صدر مجلس ادبا۔
۹	رائے صاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی اے ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی سکول رکن مجلس انتظامیہ
۱۰	لالہ گلبہار سنگھ ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج رکن مجلس انتظامیہ
۱۱	شیخ نیاز محمد صاحب ایم اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس ادبا۔
۱۲	مرزا محمد سعید صاحب ایم اے آئی ای ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج صدر مجلس ادبا۔
۱۳	سید محمد یحییٰ صاحب رکن مجلس انتظامیہ
۱۴	سردار اودے سنگھ صاحب شائق بی اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس انتظامیہ
۱۵	شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی فائنشل سکرٹری رکن مجلس انتظامیہ
۱۶	پنڈت میلا رام صاحب وفا رکن مجلس انتظامیہ
۱۷	شیخ سراج الدین صاحب آذر ایم اے ایم او ایل پروفیسر اسلامیہ کالج رکن مجلس انتظامیہ
۱۸	ابوالمعانی حضرت اختر شیرانی رکن مجلس انتظامیہ
۱۹	مولانا محمود شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج رکن مجلس انتظامیہ
۲۰	پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی
۲۱	لالہ برج نرائن صاحب ایم اے پروفیسر سناتن دھرم کالج رکن مجلس انتظامیہ
۲۲	مسٹر محمد یوسف خاں سلیم بی اے پروفیسر کرسچین کالج رکن مجلس انتظامیہ
۲۳	شیخ عبدالحمید صاحب دلاوری بی اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس انتظامیہ
۲۴	مولانا تاجور نجیب آبادی سیکرٹری
۲۵	مولانا سید اولاد حسین صاحب شاداں لکھنوی پروفیسر اورینٹل کالج رکن مجلس انتظامیہ
۲۶	میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ رکن مجلس انتظامیہ
۲۷	شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس انسپکٹر مدارس لاہور رکن مجلس ادبا۔
۲۸	مولانا غلام محی الدین خانصاحب بی اے ایل ایل بی وکیل
۲۹	رائے بہادر مسٹر بھگوتی پرشاد ورما سپرنٹنڈنگ انجنیئر سرپرست
۳۰	قاضی فضل حق صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج ممبر مجلس ادبا۔
۳۱	مسٹر بھارت چندر صابی اے ایل ایل بی وکیل ممبر مجلس ادبا۔
۳۲	ابوالاعجاز حضرت سیفی صاحب سہوارِوی

ہزار داستان

جلد ۸ ‖ فہرست مضامین بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء ‖ نمبر ۳

تصنیفات جامی رح

(از بلیغ الملک مولانا تاجور نجیب آبادی)

آجکل کسی شخص کو پیرو مرشد بننے کے لئے صرف نسبی شرافت کی ضرورت ہے۔ اس کی بابت عوام کالانعام کو صرف یہ علم ہو جانا چاہیئے کہ وہ فلاں رحمۃ اللہ علیہ کا بیٹا اور فلاں رحمۃ اللہ علیہ کا پوتا ہے اور بس، پھر اس پر یہ غور کرنے کا حق کسی کو نہیں رہتا کہ وہ خود بھی دین و دُنیا کے کسی مصرف میں کام آسکتا ہے یا نہیں۔ اس نسبی شرافت کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد پھر اُسے مریدوں کی پُوری ایک امت پر خدائی کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ آجاتا ہے لیکن زمانہ سلف میں صرف نسبی شرافت ہی معیار کمال نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی علمی اور دینی فضیلت بھی ضروری خیال کی جاتی تھی۔

مولانا جامی رح کی کثیر التعداد قابلِ قدر تصانیف کو دیکھ کر یہ کہا جائے۔ تو خلافِ واقعیت ہو گا کہ شاعری کیوجہ سے اُنہیں علمی شہرت کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ وہ اگر شاعر نہ ہوتے تو علمی دُنیا پر چھا جاتے۔ لیکن ان کی آتش بیانی نے دُنیا کو ان کی دوسری خوبیوں کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیا۔ وہ جیسے کہ ایک متدین باخدا روشنضمیر پیر اور ایک فاقدالاقران شاعر تھے، ویسے ہی وہ ایک کامیاب مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف[1] عرب و عجم میں یکساں طور پر چشم قبولیت سے پڑھی جاتی

---

[1] جبکہ خلافت عباسیہ کمزور ہوتے ہوتے قریب بمرگ ہو کر آخری سانس توڑ رہی تھی۔ ایران۔ شام۔ مصر۔ خراسان۔ ترکستان وغیرہ میں بہت سی خود مختار بادشاہتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ترکوں کے سلجوقی خاندان کا دور دورہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کی ملک گیریوں کی حکایات دلوں سے محو اور دماغوں سے فراموش ہونے لگی تھیں، تو ترکوں کے ایک دوسرے خاندان سے ایک شخص براعظم ایشیا کے لئے زلزلہ اور آندھی بنکر اُٹھا۔ جس کی تلوار سے خون کے قطرات ہر وقت ٹپکتے رہتے تھے۔ اور جس کے قدموں میں صاحب تاج و نگین لوگوں کے کٹے ہوئے سر ہمیشہ لڑھکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس نمونہ قہر خداوندی یعنی چنگیز خاں کی وفات کے بعد اُس کے بیٹوں اور پوتوں میں جا بجا کشمکش اور سلطنت کے لئے نبرد آزمائی شروع ہوئی۔ تاہم زمین پر اسقدر خون نہیں بہا جسقدر کہ چنگیز خاں بہا چکا تھا۔ ۲۵ برس تک ایران۔ خراسان۔ افغانستان۔ ترکستان۔ عراق عرب وغیرہ ممالک مبتلائے بلا رہے ۶۲۴ھ میں چنگیز خاں

ہیں۔ یورپ نے بھی ان کی تصانیف کو اسی عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جس کی وہ مستحق ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) کی وفات پر خون کے ندی نالے ذرا خشک ہوتے تھے کہ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے بلوچستان و سیستان میں اسمٰعیلیوں کا نام و نشان مٹانے کے بعد خلافت بغداد کے عظیم الشان ایوان کو بھی خاک سیاہ بنا دیا۔ اور دنیائے اسلام کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی۔ ہلاکو خاں اور چنگیز خاں کی سلطنت کے درمیان جو تیس سال کا زمانہ گزرا اس میں ایران کی کیا حالت تھی۔ اس کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی قاآن کی عملداری میں گوسفند کا ذبح کرنا قطعاً ممنوع تھا اور انسانوں کا قتل جائز۔ ایک یہ قانون بھی تھا کہ جو شخص آب بہتی پانی میں ڈالے اُس کو قتل کر دیا جائے۔ ہلاکو خاں کے وزیر نصیر الدین (نصیر الشرک) طوسی کے علم و فضل کی ایک دنیا معترف ہے لیکن اُس نے بغداد میں آٹھ لاکھ مسلمانوں کو خوش ہو ہو کر قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ جو اس کی کوششوں کا کامیاب نتیجہ تھا۔ ہلاکو خاں کے بعد تیس برس تک تمام ایران و ترکستان و شام وغیرہ ممالک میں کشت و خون اور قتل و غارت کے ہنگامے برپا رہے اور کسی بستی پر کوئی ایک سال بھی ایسا مشکل گزرتا ہوگا کہ وہاں کوئی نہ کوئی لشکر کشی نہ ہوئی ہو۔ تیس برس گزرنے کے بعد دوسرے تیس برس میں چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کا خاندان بتدریج فنا ہوتے ہوتے دنیا سے نابود ہوا۔ اور دوسرے نئے نئے حوصلہ مندوں نے اپنے حوصلوں کو کام میں لالا کر ابھرنا اور بڑھنا شروع کیا۔ جس سال ۷۳۶ھ میں تیمور پیدا ہوا اُسی سال سلطان ابو سعید بہادر خاں نے فوت ہو کر دولت آل چنگیز کا خاتمہ کر دیا۔ ۷۷۱ھ میں امیر تیمور تخت نشین ہوا۔ اور ۳۶ سال کی حکومت میں چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے برابر بلکہ کچھ زیادہ آدمیوں کو قتل کیا۔ لیکن چنگیز و ہلاکو کے ملکوں سے بہت زیادہ ممالک یعنی قریباً تمام براعظم ایشیا کو فتح کیا۔ تیمور دنیا کا سب سے بڑا فتح مند بادشاہ گزرا ہے۔ تیمور کے مفتوحہ ممالک کے وسیع رقبہ کا جب تصور کیا جاتا ہے تو اس کا کشت و خون چنگیز و ہلاکو سے کچھ کم نظر آنے لگتا ہے۔ ۸۰۷ھ میں تیمور فوت ہوا۔ اُس سے دس برس بعد مولانا جامیؒ پیدا ہوئے۔ تیمور کی اولاد آل چنگیز کے مقابلہ میں زیادہ سنجیدہ تھی۔ کیونکہ سب مسلمان تھے۔ لیکن سلطنت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو کر رات دن کشت و خون کا بازار گرم رہتا تھا۔ اور ایک ملک ایران میں چھ سات کے قریب خود مختار چھوٹے چھوٹے حکمران تھے اور سب آپس میں ایک دوسرے پر چڑھائی اور لڑائی کرتے رہتے تھے۔ یہ تمام تماشے مولانا جامیؒ نے دیکھے۔ اور ان کی تمام زندگی اس طائف الملوکی کے زمانہ میں ختم ہوئی۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسی بدامنی اور کشت و خون کے زمانہ میں اسلام نے بڑے بڑے عالم فقیہہ۔ صوفی۔ مفسر۔ طبیب۔ متکلم۔ فلسفی وغیرہ پیدا کئے۔ ۱۰ ماہ رمضان ۸۷۳ھ میں ہرات میں سلطان حسین

ان کے مجموعہ تصانیف کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ علمی۔ ادبی۔ مذہبی۔

تصانیف علمیہ

علم منطق منطق میں تہذیب کی شرح لکھی ہے۔ جامی کی یہ شرح اُس مشہور شرح تہذیب کے علاوہ ہے۔ جو درس نظامیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ یہ شرح رواج نہ پاسکی۔ عربی میں لکھی ہے۔

علم نحو الفوائد الضیائیہ فی شرح الکافیہ۔ علامہ ابن حاجب[۵] کی مشہور و مقبول تصنیف کافیہ کی شرح ہے۔ اپنے فرزند ضیاء الدین یوسف کے پڑھنے کے لئے لکھی تھی۔ اسی لئے اسی کے نام سے موسوم بھی کیا ہے۔ کافیہ علم نحو میں ایسی مقبول کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ کہ بڑے بڑے نحاۃ نے عربی فارسی ترکی میں اس کی بیسیوں شروح لکھیں لیکن شہرت کا قرعۂ فال شرح جامیؒ ہی کے نام نکلا۔ وہ اکثر ممالک اسلامیہ میں داخل نصاب کی گئی۔ اس کی قبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان کے مولد (عرب) میں بھی اس کو وہی وقعت حاصل ہے۔ جس کا مستحق اسے عجم میں سمجھا گیا ہے۔ مولانا جامی کے لئے یہ قبولیت کچھ کم سرمایۂ افتخار نہیں ہے۔ کہ عجمی ہونے کے باوجود ان کی عربی تصنیف نے اہل عرب سے خراج قبولیت وصول کیا۔

اگر کسی کی تصنیف سے استفادہ شاگردی کا مرادف ہوسکتا ہے تو ہندوستان کے اس برّاعظم میں جو بڑے بڑے صاحبان علم وفضل گزر گئے یا موجود ہیں۔ علم نحو میں ان سب کے استاذ الاساتذہ مولانا جامیؒ ہی ٹھہریں گے۔ درس نظامیہ میں شرح جامیؒ نحو کی آخری کتاب ہے۔ نحو کے اس مسئلہ پر کہ "حرف بھی اسم کی طرح کلمہ موضوع مفرد کا نام ہے۔ مگر یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳) ابن مرزا منصور ابن مرزا بایسنقر ابن مرزا عمر شیخ ابن تیمور تخت نشین ہوا۔ امیر نظام الدین علی شیر نوائی اُس کا وزیر تھا۔ اسی کے عہد میں مولانا جامیؒ نے اُس کے نام پر مثنوی یوسف زلیخا لکھی۔ سلطان حسین نے ہرات میں ایک عالیشان مکان بنوایا۔ اُس مکان کا نام تخت سفر رکھا۔ اور حکم دیا جو شخص شراب پیتا ہے وہ اس مکان میں بطور مزدور کام کرے۔ چنانچہ یہ شعر اسی مدعا کو ظاہر کرتا ہے ؎

ہر کہ با لالہ رخاں بادہ گلرنگ کشد ۔ حکم مرزاست کہ بر تخت سفر سنگ کشد۔ جامیؒ سلطان حسین کے سامنے فوت ہوئے۔ سلطان حسین ۹۱۲ھ میں فوت ہوا۔ [۵] امام جمال الدین ابو عمر المعروف بابن الحاجب المتوفی ۶۴۶ھ

مستقل بالمفہومیت نہیں ہے۔ بغیر ضم ضمیمہ کے حرف کوئی معنی نہیں دیتا۔"

شرح جامی میں الحاصل و محصولہ کے عنوان سے منطقیانہ پیرایہ میں ایک دقیق مگر نہایت مفید بحث لکھی ہے۔ اس کو پڑھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ جامی کی طبع وقاد عقلی مسائل میں کیسی جولانیاں دکھاتی ہے۔ شرح جامی اسقدر جاذب توجہ ہوئی کہ بڑے بڑے فضلا نے اس پر حاشیے[۵۱] لکھے

شرح مائتہ عامل۔ عربی نحو کا مشہور منظوم رسالہ جو ابتدا میں طالب علموں کو حفظ کرایا جاتا ہے۔ اُس کی ایک مشہور عربی شرح تو وہ ہے جو مولانا عبدالرحمٰن جرجانی نے لکھی ہے۔ اور درس نظامیہ میں طالب علموں کو ترکیب نحوی سکھانے کی غرض سے پڑھائی جاتی ہے۔ دوسری اس کی فارسی منظوم شرح مولانا جامیؒ نے لکھی ہے جو شائع ہوچکی ہے۔

علم الصرف۔ رسالۃ الصرف۔ اس رسالہ میں عربی صرف کے قواعد و مسائل اوّل نثر میں پھر نظم میں لکھے ہیں۔

علم العروض والقافیہ۔ علم عروض میں ایک مختصر رسالہ ہے۔

رسالہ قافیہ۔ مختصر الوافی فی القوافی۔ فن قافیہ میں ہے۔ آخری حصۂ عمر کی تصنیف ہے۔

علم اللغز (معمہ گوئی) اُس زمانے میں معمہ گوئی کا بڑا رواج تھا۔ جامی کی دقت پسند طبیعت نے اس فن میں وہ موشگافیاں کیں کہ اس فن کو اپنا بنا لیا۔

معمہ گوئی اور معمہ کشائی ایسے فن ہیں کہ ان سے کوئی معتد بہا فایدہ نہیں۔ لیکن انسانی ذہانت و ذکاوت پر اس سے جلا ضرور ہوتی ہے۔ اس کی مشق سے انتقال ذہنی جو ذکاوت کا اصلی جوہر ہے، پیدا ہوجاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اسے فنون مفیدہ میں داخل کرسکتے ہیں۔ مولانا جامیؒ کی اس فن سے مفرط دلچسپی ان کی ذہانت پر دال ہے۔ معمہ گوئی کا شغل پہلے

---

[۵۱] شرح جامی کے حاشیوں کو جمع کیا جاتے، تو نحو کا ایک چھوٹا موٹا کتب خانہ بن جائیگا۔ مشاہیر علماء میں سے ذیل کے حضرات نے اس شرح پر مبسوط حاشیے لکھے۔ مولانا عصام اسفرائینی متوفی ۹۴۳ھ ملا محرم آفندی۔ مولانا عبداللہ ابن صالح شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی۔ مولانا جمال ابن ملا نصیر۔ ابوالبقاء محمد ابن احمد۔ مولانا عبدالرحمٰن ابن محمود اسفرائینی۔ مولانا رضی الدین عبدالغفور لاری تلمیذ جامی متوفی ۹۱۲ھ۔ فاضل امیر چلپی۔ سید نعمت اللہ الجزائری۔ سوآل باسولی۔ سوآل کابلی۔ ملا نور محمد مدقق۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۱ھ

ہی سے چلا آتا ہے۔ لیکن مولانا جامی کو اس کا مدون اور مرتب کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں ایسی لکھی ہیں، جن میں معمہ گوئی کے اصول وضع کر کے باقاعدہ اُسے ایک فن بنا دیا ہے۔ اس فن کے متعلق اُن کی تصانیف گنوانے سے پہلے ایک دلچسپ واقعہ بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

مولانا جامیؒ امیر خسرو دہلوی کے بہت مداح ہیں اپنی ادبی تصانیف میں کئی جگہ عزت کے پیرایہ میں اُن کا نام لیا ہے۔ ہندوستان اور خصوصاً دہلی سے جو تاجر اپنا تجارتی سامان لیکر ایران جاتے تھے، مولانا جامیؒ ان سے مل کر امیر خسرو کے حالات بڑے شوق سے دریافت فرمایا کرتے تھے۔ حسن اتفاق سے معمہ گوئی میں خسرو بھی جامی کے حریف فخر بن چکے ہیں۔ خسرو کی پہیلیاں آجتک ہندوستان کے بچوں کی زبان زد ہیں۔ اکثر معمہ گوئی سے مناسبت رکھنے والے ان کی چیستانیں ازبر کر لیتے ہیں۔ مولانا جامیؒ نے دہلی کے ایک سوداگر سے جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ امیر خسرو کے حالات دریافت فرماتے ہوئے پوچھا کہ تمہیں کچھ خسرو کے معمے بھی یاد ہیں۔ اُس نے جواب دیا کہ ہاں مجھے اُن کے بہت سے اشعار معمے پہیلیاں ازبر ہیں۔

جامی نے معمے سُننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ تو سوداگر نے پوچھا۔ کہ فعلی معمے سناؤں یا قولی۔ مولانا جامی اس خارزار کے رہنما ہونے کے باوجود بھی ہندی سحر بیان خسرو کی اس اختراع سے بے خبر تھے کہ معمے کی تقسیم قولی اور فعلی پر بھی ہو سکتی ہے۔

سوداگر سے یہ تقسیم سُن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ فعلی اور قولی ہر دو سُننا چاہتا ہوں۔ سوداگر نے فعلی معمہ اِس طرح بیان کیا کہ

پہلے سرو قد کھڑا ہوا پھر جُھکا، پھر اپنی داڑھی کی طرف اشارہ کر کے اُنگلیوں سے اُسے جھاڑا۔ جامی کی ذکاوت کا اندازہ کیجئے۔ کہ فوراً ہنس کر فرمایا۔ کہ یہ ادریس کے نام کا معمہ ہے۔ سرو قد کھڑے ہونے سے الف کی ہیأۃ مراد ہے۔ کوزپشت کی شکل حرف دال کے مشابہ ہے۔ داڑھی کو ریش کہتے ہیں۔ ادریش ہوا۔ پھر داڑھی کو انگلیوں سے جھاڑنے کا مطلب لفظ ریش سے نقطے اُڑا دینا ہے۔

"ادریس" ہوگیا۔

قولی معمہ امیر خسرو کا یہ شعر تھا ؎

گر مہ شود بر او ستارہ شود بری　　برخوان نعمتِ تو کند کے برابری

اس قولی معمہ کو حل کرنے میں جامی کو بڑی دماغ سوزی سے کام لینا پڑا ہے۔ چونکہ بڑا اور بڑی ہندوستانی کھانوں میں سے ہیں۔ جامی اس لغت سے بے خبر تھے۔ اس لئے اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش میں پُورا ایک رسالہ لکھ کر عقل کا زور ختم کر دیا ہے۔ جتنا عقلی زور لگایا اصل حل سے کوسوں دُور جا پڑے۔ آخر ان کی ذہانت نے رہنمائی کی اور اُس رسالے کے اخیر میں فرماتے ہیں:۔

"شاید کہ بر او بری اسم طعامے از طعامہائے ہند باشد"

(۱) **معمیات جامی** ۔ فن معمہ میں ایک فارسی رسالہ ہے مولانا شرف الدین یزدی نے فارسی میں اس کی شرح لکھی ہے۔ اور مولانا سروری نے ترکی زبان میں۔

(۲) **شرح معمیات** ۔ میر حسین شیرازی نے میر علی شیر نوائی کی فرمائش سے اس فن میں ایک کتاب لکھی تھی۔ مولنا جامی نے یہ اس کی شرح لکھی ہے۔

(۳) **حلیۃ الحلل یا معمائے کبیر** ۔ فن معمہ میں جتنے رسالے جامیؒ نے تصنیف کئے ہیں یہ رسالہ ان سب میں بڑا ہے۔

(۴) **معمائے متوسط** ۔ یہ بھی فن معمہ میں ایک رسالہ ہے۔ جامی کی پہلی تصنیف سے کسی قدر مختصر ہے۔

(۵) **معمائے صغیر** ۔ یہ انتخاب ہے حلیۃ الحلل کا۔

(۶) **معمائے اصغر** ۔ اپنی وفات سے آٹھ سال پیشتر ۸۹۰ھ میں تصنیف کیا ہے۔

جامیؒ کے دو تین معمے نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

علیؓ کے نام کا معمہ لکھا ہے۔

چشم بکشا زلف بشکن جانِ من　　بہر تسکینِ دلِ بریان من

حل

چشم کو عربی میں عین کہتے ہیں، بکشا سے کنایہ ہے کہ عین کو فتحہ دو زلف سے بطور استعارہ لام مراد ہے بشکن سے

لہ متوفی ۹۱۲ھ ۔ ۲ ہ ۹۰۶ھ میں جامی سے چھ برس کے بعد وفات پائی۔

اشارہ ہے لام کو کسرہ دو لفظ بریاں کا دل یعنی درمیانی حرف یا ہے۔ تسکین سے مراد یہ ہے۔ کہ اُسے ساکن کرو۔ علی بن گیا۔

لفظ بوسہ کا معمہ :-

زروئے یار خواہم ضد شرقی — بہ تقلیب و بہ تردیف و بہ تجنیس

حل

ضد شرقی غربی لفظ غربی اور عربی میں تجنیس خطی ہے۔ عربی میں کسی قدر تقلیب کی جائے، تو ربیع بن جاتا ہے۔ ربیع کے معنی بہار کے ہیں۔ بہار اور نہار میں تجنیس خطی ہے۔ نہار کا مرادف یوم ہے۔ یوم کو پلٹو تو موے ہو جاتا ہے موئے کی عربی شعر ہے۔ شعر میں تقلیب کی جائے، تو عرش بن جاتا ہے۔ عرش ایک مکان کا نام ہے۔ مکان کی عربی دار ہے۔ دار کو تقلیب کے ذریعہ راد بنا لیا۔ راد اور زاد میں تجنیس خطی ہے۔ زاد توشہ کو کہتے ہیں۔ توشہ ہمشکل ہے بوسہ کے پس روئے یار سے بوسہ کی طلب مقصود ہے۔ یہ معمہ زبان زد ہے۔

اپنے ایک دیوان کی تاریخ ترتیب معمہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے۔

(بر روئے صدف نہاد یک دانہ گہر)

روے صدف صاد ہے۔ اس پر دانہ گوہر رکھنے سے مراد نقطہ لگا دینا ہے۔ ضاد ہو گیا۔ اس کے عدد جمع کئے تو ۸۸۴ ہوئے۔ دیوان ۸۸۴ھ میں ترتیب دیا تھا۔

علم موسیقی۔ مذہبی نقطۂ نظر سے موسیقی علوم کی دُنیا سے شہر بدر ہو چکی ہے۔ لیکن ایک فطری شاعر کے لئے مذہب کی چار دیواری بلیک ہول سے کم نہیں۔ مولانا جامیؒ خاندانی قاضی و مفتی ہونے کے علاوہ خود بھی بڑے متدین صوفی تھے۔ مذہبی تقدس کی وجہ سے مرجع عوام و خواص تھے۔ لیکن چونکہ طبیعت شاعرانہ پائی تھی، اس لئے طبیعت کو یجوز و لایجوز کی گرفت سے آزاد رکھتے تھے۔ فنونِ لطیفہ میں موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس فن میں اتنی مہارت پیدا کی کہ اس پر ایک رسالہ بھی تصنیف کر دیا۔

بہارستان جامی

اپنے صاحبزادہ یوسف ضیاء الدین کو گلستان پڑہاتے ہوئے یہ شوق پیدا ہوا کہ خود بھی اسی طرز پر ایک کتاب لکھیں۔ چنانچہ اسی نہج پر یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے ہر ہر باب کو کتاب کے نام کی مناسبت سے روضہ سے تعبیر کیا ہے۔ جیسے کہ نظامی گنجوی نے خمسہ لکھ کر دنیائے ادب کو صلائے عام دی۔ پھر بیسیوں سحر نگار اس میدان میں اُترے۔ لیکن خمسہ نظامی کے جواب سے عہدہ برآ نہ ہوسکے۔ کہ سکہ پخت در دیگ نظامی۔ اسی طرح سعدی کی گلستاں بوستاں چھ سات صدی سے "ہل من مبارز" کے آوازے لگا رہی ہیں۔ مگر کسی کو لبیک کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اور جن لوگوں نے دل کڑا کر کے یہ جرأت کی بھی تو وہ سعدی کے قدرتی پھولوں کے مقابلے میں کاغذ کے مصنوعی پھول بنا کر لے گئے۔ گلستاں کے جواب میں حسب ذیل قابل ذکر کتابیں مختلف زمانوں میں لکھی گئیں۔

(۱) **بہارستان** سنہ ۶۸۹ھ میں خواجہ معین الدین جوینی نے سلطان ابو سعید کے نام پر لکھی۔

(۲) **خارستان**۔ ملا مجد الدین خوانی کی تصنیف ہے۔

(۳) **گلستاں**۔ حکیم قاآنی نے تصنیف کی۔

(۴) **بہارستان**۔ مولانا جامی کی تصنیف ہے۔

ان سب میں بہارستان[لہ] جامی کو سب سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ اکثر مکاتب میں پڑھائی بھی جاتی ہے

لہ ہندوستان اور خصوصاً لاہور میں بہارستانِ جامی کی وہ قدر ہوئی ہے کہ سعدی کی گلستاں کو شاید اس کا دسواں حصہ بھی نہ نصیب ہوا ہو۔ لاہور کے دار الخلافہ میں سنہ ۱۵۷۵ء میں بادشاہ کے حکم سے بہارستان جامی بڑے اہتمام سے لکھوائی گئی۔ اس کا کاتب ہندوستان کا خوشنویس محمد حسین زرّیں قلم تھا۔ ہندوستان کے چیدہ چیدہ اہل کمال میں سے سولہ[۱۶] نقاش اس کے صفحات کو منقش و مطلی کرنے کے لئے مقرر ہوئے تھے منجملہ ان سولہ[۱۶] کے پانچ آدمی خضر۔ سلمان۔ مخلص۔ احمد۔ اخلاص طلائی جدول بنانے کے لئے، تین شخص عماد۔ حسین۔ اُستاد بابو حروف کو مطلی کرتے تھے۔ پانچ اُستاد مادھو۔ بساون۔ مسکینا۔ مکند۔ لال۔ صفحات پر رنگین کام کرنے کے لئے متعین ہوئے۔ سین داس۔ کیسو۔ لال چند۔ یہ تین آدمی اُن جہانات کی تصاویر بناتے تھے

گلستاں اور بہارستان کا موازنہ جامیؒ کی ادیبانہ حیثیت بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری پر تنقید کے ذیل میں کیا جائیگا۔

بہارستان کو گلستاں کی طرح ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ کسی باب میں پند و نصائح کسی میں صوفیائے کرام کا تذکرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) جو بہارستان جامی میں مذکور ہیں۔ طلاکاری اور نقاشی کا کام دیدہ زیب ہی نہیں، بلکہ من حیث الفن اس قدر صحت و احتیاط کے ساتھ کیا گیا کہ اس پر کوئی اُستاد سے اُستاد بھی اُنگلی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اسقدر دماغ سوزی سے نقاشوں نے کام کیا تھا کہ ہر صفحہ دوسرے صفحہ سے جدا نقش و نگار رکھتا تھا۔ پھر حیوانات کی تصاویر اتنی نیچرل بنائی گئی تھیں۔ جو ہندوستان کے علم الحیوانات کے شائق کو ایک رہنما کا کام دے سکتی تھیں۔ چونکہ طلائی حروف اور رنگارنگ کے نقش و نگار کی چمک کتاب پڑھنے والے کی نظر کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس لئے ایسے محمد بصر کاغذ پر یہ کتاب لکھوائی گئی تھی۔ جو انواع و اقسام کی ادویہ اور مصالحوں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس لئے اس کے صفحات مینا کاری کا نظر پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ( ) جس نے اسی شاہی بہارستان جامی کے نسخہ کو دیکھ کر بہارستان کو ولایت میں شائع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ "اس کتاب کی شان و دلکشی کو دیکھ کر خاندان تیموری کی علم پروری و صنعت نوازی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس مختصر سی کتاب کی تیاری پر کئی پونڈ صرف ہوئے ہیں اس باصرہ فروز کتاب پر شاہجہان کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہجہان نے ۱۶۱۱ء یا ۱۰۲۰ھ میں اسے اپنے شاہی کتب خانہ میں داخل کیا ہے۔ شاہجہان کی تحریر کے نیچے ایک اور تحریر ہے جو پورے طور پر پڑھی نہیں جاتی۔ یہ تحریر کسی تیموری شہزادہ کی معلوم ہوتی ہے۔

شاہجہان کی تحریر

الہی

این بہارستان بتاریخ بست و پنجم ماہ بہمن موافق ہشتم جمادی الثانی کہ روز جلوس مبارک است داخل کتبخانۂ این نیاز مند درگاہ شد

حررہٗ شہاب الدین محمد شاہجہان

ابن جہانگیر پادشاہ ابن اکبر پادشاہ

افسوس ہے کہ بہارستان جامی کا ایسا نادر روزگار نسخہ مشرقی علوم کی ناقدری نے ہندوستان سے یورپ پہنچا دیا۔

کسی میں ظرافت آمیز حکایات، ساتویں باب میں شعراء کا مختصر تذکرہ رودکی سے شروع کر کے میر علی شیر نوائی پر ختم کیا ہے۔ غرضکہ فارسی زبان سے دلبستگی رکھنے والے ادیب کے لئے بہارستان میں دلچسپی کے تمام سامان موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گلستان سے قطع نظر کر لیجائے۔ تو پھر بہارستان ہی کی اولیت کا اقرار کرنا پڑیگا۔ اس زمانے میں بزرگوں کا ادب، خورد و کلاں کا وقار آجکل سے بہت زیادہ کیا جاتا تھا۔ چھوٹے بڑوں کے سامنے لب کشائی کو بے تہذیبی سمجھتے تھے۔ بڑے بھی چھوٹوں سے اس متانت و سنجیدگی سے بات کرتے تھے جیسی کہ چاہئے۔ لیکن علمی معاشرت میں آکر اُستاد شاگرد اُن حدود کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے تھے۔ کوئی مصنّف کتنا ہی بزرگ، کیسا ہی قومی پیشوا سمجھا جاتا ہو۔ لیکن تصنیف میں ریاکاری سے کام نہیں لیتا تھا۔ سعدیؒ کے تقدس کو دیکھئے اور مطائبات سعدیؒ کو پڑھنے کی آپ کو حیا اجازت نہ دے، تو گلستان کی بعض حکایتوں کو ملاحظہ فرما کر غور کیجئے۔ کہ آج سعدی جیسا مقدس انسان اگر اپنی تصنیف میں ایسی زندہ دلی سے کام لے، تو اپنے اور بیگانے سب مل کر اُسے بائیکاٹ کر دیں۔ لیکن اس زمانہ کی معاشرت آجکل کی معاشرت سے بالکل مختلف تھی۔ سعدی کو مطائبات سعدی لکھنے کے بعد بھی ایسا ہی مقدس و متقی سمجھا جاتا تھا۔ جیسے کہ وہ اس سے پہلے سمجھے جاتے تھے۔ مولانا جامی جن کے علم و فضل زہد و تقوے کی کشش دُنیا بھر کے مسلمان سلاطین کو اپنی جانب کھینچتی تھی۔ اپنے فرزند کے لئے کتاب لکھتے ہیں۔ لیکن باب ظرافت میں آکر بالکل عریاں ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو بہارستانِ جامی کی حکایات ذیل :-

"علوی در بغداد زنے را بخواند زن از وے دینار و درم خواست علوی گفت" تو بآں راضی نیستی کہ عضوے از اہل خاندانِ نبوت و خاندان ولایت در تو فرود آید" گفت " ایں افسانہ را با قحبہاے کاشانہ گوئے واز قحبہاے بغداد ایں آرزو خیر بدینار و دام مجوے "

ہفت اورنگ جامی

سات مثنویوں کا مجموعہ۔ سلسلۃ الذہب۔ سلامان وابسال۔ تحفۃ الاحرار۔ سبحۃ الابرار۔ یوسف زلیخا۔

ملے ہزار داستان کی تنگ دامانی اجازت نہیں دیتی کہ ہفت اورنگ جامی پر تفصیلی تبصرہ کیا جائے ہم اسے کسی آئندہ فرصت کیلئے اٹھا رکھتے ہیں۔

لیلیٰ مجنوں۔ خرد نامہ اسکندری۔

سلسلۃ الذہب۔ سلطان حسین کے نام پر معنون کیا ہے۔ بر وزن ہفت پیکر۔ مذہبی نظم۔ تین دفتر پر منقسم ہے۔

سبحۃ الابرار۔ مذہبی نظم بروزن نہ سپہر امیر خسرو۔ سلطان حسین کے نام۔

یوسف زلیخا۔ نظامی کے خسرو شیریں کے وزن پر سلطان حسین کے نام بہت مقبول نظم ہے۔ جرمنی اور یورپ میں اسکی قدر کی گئی ہے۔

لیلیٰ مجنوں۔ نظامی کی لیلیٰ مجنوں کے وزن پر مدت تصنیف چار ماہ فی یوم دو گھنٹہ ۳۷۶۰ اشعار بیت ہیں فرانسیسی جرمنی میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا۔

خرد نامہ اسکندری۔ سکندر نامہ نظامی کے وزن پر سلطان حسین کے نام پر۔ جامی کے خمسہ کی آخری تصنیف

سلامان وابسال۔ منطق الطیر عطار کے وزن پر۔ بظاہر عاشقانہ ہے۔ اور درحقیقت عشق حقیقی ہے۔ انگلش میں ترجمہ ہوا اور تصحیح (شاہ یعقوب کے نام پر تہدیہ متوفی ۸۹۶ھ)

تحفۃ الاحرار۔ مخزن الاسرار نظامی کے ہموزن اس میں ۱۲ مقالے ہیں۔ دیباچہ میں ناصرالدین خواجہ عبیداللہ احرار کی تعریف ہے۔ احرار اسی کی طرف منسوب ہے۔ ختم تصنیف ۸۸۶

انشائے جامی

اس مختصر کتاب میں مولانا کے وہ رقعات ہیں۔ جو انہوں نے خواجہ عبیداللہ۔ قاضی مجدالدین حسن یزدی۔ سید معین الدین محمد۔ سلطان شاہجہان المتخلص بہ حقیقی۔ محمد رومی۔ ملک التجار اور دوسرے احباب و مشائخ کو لکھے ہیں۔ رقعات مختصر اور صرف شوق ملاقات۔ اظہار محبت۔ تہنیت۔ تعزیت۔ شکایت وغیرہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ زبان پاکیزہ ادائے بیان دلربا۔ اشعار برجستہ قابل تحسین بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ ان رقعات میں کوئی ایسا مضمون نہیں جس سے مولانا جامی کے سوانح لکھنے والے کو کوئی مدد مل سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان رقعات کو جمع کرتے وقت خود پرائیویٹ مضامین کو نکال ڈالا ہوگا۔ انشاپردازی میں ترقی کرنے کے شوقین کو یہ انشا بہت کچھ مدد دے سکتی ہے۔ اگر اس کتاب کو خود مولانا جامی مرتب نہ فرماتے، بلکہ ان کے اصل رقعات کو کوئی دوسرا شخص جمع کرتا، تو ان اصل رقعات میں

یقیناً بہت سے ایسے مضامین موجود ہوتے جو اُس زمانہ کے اخلاق و معاشرت اور مولانا کے نجی تعلقات پر روشنی ڈالتے اور اسی وجہ سے نہایت مختصر بھی ہیں۔

تصنیفاتِ مذہبی

شرح اربعین ۔ چہل حدیث کی شرح نظم فارسی میں کی ہے۔ ہر حدیث کی تشریح دو شعر میں ہے۔ یہ منظوم شرح بحر رمل میں ہے۔ اپنی وفات سے بارہ سال پیشتر ۸۸۶ھ میں یہ شرح لکھی ہے۔

علم فقہ ۔ **مناسک الحج** ۔ اثنائے سفر حجاز میں کچھ دنوں کے لئے بغداد میں قیام فرمایا تھا ۔ وہیں مسائل حج کے متعلق یہ رسالہ لکھا۔ ائمۂ اربعہ میں کسی مسئلہ کے متعلق جو اختلاف ہیں، وہ بھی بیان فرماتے ہیں۔

علم کلام ۔ اعتقاد نامہ ۔ اس رسالہ میں اسلامی عقائد کا مفصل بیان ہے۔

علم تاریخ ۔ شواہد النبوۃ ۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحمری ہے۔ انجیل و توراۃ اور دیگر کتب سماویہ میں جو نبی کریمؐ کے متعلق تصریحات و اشارات ہیں۔ ان کو بھی مفصلاً درج کیا ہے۔ آپ کے معجزات صحابہ کرام اہل بیت اور دیگر بزرگان دین کی کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کا ماخذ امام مستغفری کی کتاب دلائل النبوۃ ہے۔ شواہد النبوۃ کا ترجمہ مولانا لمعی نے ترکی زبان میں کیا ہے۔

(باقی دارد)

کلامِ افسر

ڈھونڈنے والے جو پیدا ہوں تو سب کچھ ہے یہیں
چھپنے والا کہہ رہا ہے ڈھونڈنے والے نہیں

اُف رے یہ ذوقِ عبادت کی عجائب کاریاں
دل کہیں ہے ہیں کہیں سجدہ کہیں ہے سر کہیں

مدعا دل کا بر آیا بھی تو کیا حاصل ہوا
آرزوئیں اب سے پہلے تھیں مگر ایسی نہ تھیں

چاہتے ہیں اب تو یہ سودائیانِ جستجو
کاش منزل پر کوئی کہدے کہ یہ منزل نہیں

بُعد ظاہر کچھ نہیں ہلکے سے پردے کے سوا
ہم یہیں ہیں تم یہیں گو ہم کہیں ہوں تم کہیں

ہیں مرے اشعار افسرؔ اگلی نسلوں کے لئے
سُننے والے میرے نغموں کے ابھی آئے نہیں

حامد اللہ افسرؔ (میرٹھی)

رباعیات

(۱)

ہنگامۂ جوشِ زندگانی ہوں میں
سرمستِ نشاطِ نوجوانی ہوں مَیں
ہر لحظہ حیاتِ جاوداں ہے میرا
دل یہ نہیں مانتا کہ فانی ہوں مَیں

(۲)

کرتا ہے عجیب خواہشوں کا اظہار
لاتا نہیں ہیں زباں پہ حرفِ انکار
ازبس ہے عزیز مجھ کو خاطر اس کی
ہادؔی مرا دل ہے ایک طفلِ بیمار

(۳)

ہے میرے سکوت میں تکلّم پنہاں
تہ میں ہے سکوں کی اک تلاطم پنہاں
لبریز نوائے راز ہوں میں ہادؔی
پردے میں ہے ساز کے ترنّم پنہاں

محمد ہادی حسین

کلامِ آزاد

نہ چھوڑا کوئی در میں نے۔ نہ چھوڑا کوئی گھر میں نے
کسی کی جستجو میں چھان مارے بحر و بر میں نے

چلو۔ میں نے پھرایا تم کو رسوا در بدر میں نے
چلو۔ میں نے ستایا تم کو قصّہ مختصر میں نے

کسی کی آرزو کر کے بڑھالی زیست کی کلفت
کسی کی آن پر مر کے بنالی جان پر میں نے

یہ کس نے مجھ کو اُلفت میں پھنسایا۔ خود مری مت نے
یہ کس نے دِل کو روزِ بد دکھایا۔ سربسر میں نے

وفاداری سے کس نے کردیا خائف مجھے۔ تم نے
جفاکاری میں کس نے کردیا تم کو نڈر۔ میں نے

مری قسمت۔ دکھایا مجھ کو آنکھوں نے ترا جلوہ
مری شامت۔ بنایا تجھ کو منظورِ نظر میں نے

کسی کو یوں ترا مفتوں نہیں پایا۔ مگر دِل کو
کسی نے یوں ترا دھوکا نہیں کھایا۔ مگر میں نے

تمہیں دیکھو کہ مجھ کو غیر سمجھا آج تک تم نے
مجھے دیکھو۔ کہ تم کو دوست رکھا عمر بھر میں نے

کسی کی کیا خطا۔ اظہارِ حرفِ آرزو کر کے
بگاڑی آرزو کی بات میں نے خاصکر میں نے

بس اب اے قلبِ صد پارہ۔ سوائے صبر کیا چارہ
کیا جو نالہ سر میں نے وہ دیکھا بے اثر میں نے

نہ اُلفت میں مزا آیا نہ کلفت میں مزا آیا
لگایا جو شجر میں نے وہ پایا بے ثمر میں نے

توجہ کر۔ توجہ کر کہ امیدِ توجہ پر
گنوا رکھا ہے زر میں نے۔ لُٹا رکھا ہے گھر میں نے

جو باچشمِ یقیں دیکھا تو دِل میں جاگزیں دیکھا
تمہیں ڈھونڈا کدھر میں نے تمہیں پایا کدھر میں نے

بہت کچھ صبر کر دیکھا بہت کچھ جبر کر دیکھا
نہ دیکھا پر نہ دیکھا تجھ سے امکانِ مضر میں نے

اِسے بھی خوش نظر آیا۔ اُسے بھی خوش نظر آیا
ترے غم میں بحالِ شادماں کردی بسر میں نے

اب اے آزاد! دردِ دل بلا سے لب تک آجائے
کیا ضبطِ دروں تا حدِ امکانِ بشر میں نے

آزاد انصاری

یادِ نشاط

نہ وہ عالم جلوہ زار نشاط	نہ وہ جلوہ ہائے بہار نشاط
نہ وہ طاقت انتظامات عیش	نہ وہ قدرتِ اختیار نشاط
نہ وہ فرصت انصرامات عیش	نہ وہ رُخصت کاروبار نشاط
نہ وہ صورت ہستی انبساط	نہ وہ جان امیدوار نشاط
نہ وہ شکل بدمستیِ انبساط	نہ وہ خاطرِ دوستدار نشاط
نہ وہ سوز و ساز نوائے طرب	نہ وہ مطرب نغمہ کار نشاط
نہ وہ مستی جانفزائے طرب	نہ وہ ساقی بادہ یار نشاط
نہ وہ محفل مستِ صہبائے کیف	نہ وہ جلسۂ بادہ خوار نشاط
نہ وہ صحبت غرقِ دریائے کیف	نہ وہ بادہ خوشگوار نشاط
نہ وہ مجمعِ گلرخانِ صبیح	نہ وہ حسن صبح بہار نشاط
نہ وہ اجتماع بتان ملیح	نہ وہ لطف شبہائے تار نشاط
نہ وہ دور ایام لطف و خوشی	نہ وہ قسمتِ سازگار نشاط
نہ وہ عہد اتمام لطف و خوشی	نہ وہ طالع حق گزار نشاط
نہ وہ ہر طرف جلسہ ہائے طرب	نہ وہ ہر طرف انتشار نشاط
نہ وہ ہر طرف جلوہ ہائے عجب	نہ وہ ہر طرف اشتہار نشاط
نہ وہ بزم عشرت۔ نہ وہ دورِ جام	نہ وہ گردشِ روزگار نشاط
نہ وہ عیش کے نو بنو اہتمام	نہ وہ رنگ لیل و نہار نشاط
نہ وہ آرزو کامیابِ خوشی	نہ وہ شوقِ دل ہمکنار نشاط
نہ وہ خوش نصیبی نہ وہ خوش دلی	نہ وہ زندگی تحتِ کار نشاط
اِدھر حالِ دل فرطِ غم سے نزار	اُدھر جان حسرت شعار نشاط
جسے دیکھئے مضطرب۔ بیقرار	جسے پوچھئے سوگوار نشاط

بہارِ تغزّل

اسی بیقراریِ متصل سے غمِ وفا کو دوام ہے
جسے موت کہتے ہیں اہلِ دل وہ سکونِ قلب کا نام ہے

جو اسی کا نام بہشت ہے تو ہمارا اس پہ سلام ہے
نہ وہ حسنِ شعلہ مزاج ہے نہ وہ عشقِ شوخ کلام ہے

کبھی عیشِ وصل کی صبح ہے کبھی رنجِ ہجر کی شام ہے
نہ بہارِ غم کو ثبات ہے نہ سکونِ دل کو دوام ہے

میرے دل کا اب تو یہ رنگ ہے۔ نہ امنگ ہے نہ ترنگ ہے
نہ حریصِ نغمہ و چنگ ہے نہ حریفِ بادہ و جام ہے

یہ بجا کہ دہر میں کوئی شے ہے خدا تو دہر کی ذات بھی
مجھے ایک آپ سے کام ہے مجھے یاد آپ کا نام ہے

کہیں موجِ بادۂ نور ہے۔ کہیں برقِ وادیِ طور ہے
ترے حسن کا یہ ظہور ہے کہ بہارِ جلوۂ عام ہے

وہی میں ہوں پھر وہی زندگی وہی صبح و شام کی سرخوشی
وہی جلوۂ لبِ بام ہے کہ حریفِ ماہ تمام ہے

مجھے بیکسی کا ہو کیا گلہ کہ یہی تو فطرتِ عشق ہے
تری دلدہی میں قصور ہے نہ تری وفا میں کلام ہے

وہی ایک شعلہ طراز شے کہ تمام کہتے ہیں جس کو مے
ترے ساتھ ہو تو حلال ہے ترے بن پیوں تو حرام ہے

یہ بہارِ کیفِ مے سخن یہ بیانِ عابدِ سحر فن
کوئی حاسدوں سے کہے ذرا یہ کمالِ حسنِ کلام ہے

عابدؔ

جو میرے خاندان سے مخصوص تھی۔ اس میں تحرک کی روح دوڑ گئی۔ مجھے فوج میں کپتان کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ جہاں تک میں نکہت کی طبیعت کو سمجھ سکا تھا' مجھے احساس تھا کہ وہ مجھے فوراً لڑائی پر جانے کی اجازت دیگی۔ میرا خیال تھا کہ قربانیوں کے متعلق جو نظریے میں نے قائم رکھے ہیں، نکہت اُن سے ہم آہنگ ہوگی۔ ہماری فوج کے دستے کو عراق جانے کے قطعی احکام آپہنچے۔ اور میں جانے سے ایک ہفتہ پیشتر ہی نکہت سے ملا۔

وہ اپنے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی۔ ہمارا عشق جسے تم اپنے طنزیہ انداز میں مہذب عشق کہتے ہو۔ رسمیات کی جدوجہد سے بے نیاز تھا۔

میں نے کہا پیاری میں ایک ہفتہ تک جا رہا ہوں۔

ہم دونوں ایک روش پر بیٹھ گئے۔ اُس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں مسرت کا وہ اہتزاز موجود تھا جس کے لئے لوگ اپنی جانیں دے دیتے ہیں۔ جس کے لئے فرانس میں "ڈوئل" لڑے جاتے ہیں، جس کے لئے بادشاہ کے برخلاف علم بغاوت بلند کیا جاتا ہے۔ جس کے لئے زندگانی کی تمام مسرتیں قربان کی جاتی ہیں۔ جس کے لئے جان کی تکلیف نشاطِ حیات متصوّر ہوتی ہے۔

میری بات سُنکر اُس کی آنکھیں یکایک نم آلود ہوگئیں۔ اور آنسوؤں کے دو قطرے جن کی شبنم مثال تابانی شاید اُس نور سے پیدا کی گئی تھی جس سے فرشتوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ اُس کے روشن رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ وہ خاموش رہی لیکن جانتے ہو نا اُسکی خاموشی کسقدر طعن خیز تھی۔ وہ مجھے ملامت کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے، اور رو رہی تھی' رو رہی تھی اور یہ کہہ رہی تھی۔

میرا دل بیٹھ گیا۔ نکہت نے بھی اپنے فرض کا احساس نہ کیا۔ میں نے اپنے دل کو کڑا کر کے کہا۔

"آج سے چوتھے دن میں پھر رخصت لینے آؤنگا" لیکن میں جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں مسرت پھر لہر بن کر دوڑ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس مسرت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُس دن مجھے جانے سے روک لیگی۔ اور اپنی محبّت کو اپنے فرض کے احساس پر مقدم سمجھے گی۔ واپس جاتے وقت میرے پاؤں سو سو من کے ہو رہے تھے۔ میں بغیر اس سے ملے لڑائی پر چلا گیا۔

دو سال کے بعد میں واپس آیا۔ اور خط کے ذریعے اُسے اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کیا۔ اپنے قلب میں اُس آتشیں شعلے کا گداز لے کر جسے فرقت کہتے ہیں۔ اور اس شادابیٔ تمام کی گل ریزیاں لے کر

جسے وصل کہتے ہیں' میں اسی پائیں باغ میں جا پہنچا۔

نکہت اور ایک نوجوان شخص اُس روش پر وہیں جہاں میں اُس سے رخصت ہوا تھا۔ بیٹھے تھے نکہت کے رخسارے تمتا رہے تھے۔ عین اُس طرح جس طرح ایک کمسن لڑکی کے رخسارے اُس وقت تمتما اُٹھتے ہیں جب اُس کا محبوب اُس کے کان میں کوئی بے معنی مگر لطیف بات کہے۔

میں اُلٹے پاؤں واپس آ گیا۔ اب مصر جا رہا ہوں خدا جانے کیوں۔ شاید اس لئے کہ وہاں خلاق فطرت نے حسن اور اس کی دغابازی کو قلوپطرا کے جسم ملیح میں متشکل کر کے زمین کو آلودہ کرنے کے لئے روانہ کیا میرا پتہ کچھ نہیں۔ کیونکہ میں ایک جگہ نہیں ٹھیرونگا۔ خدا حافظ

تمہارا بدنصیب دوست

کلیم

---

(۲)

پیاری اختر۔ تمہارا خط ملا۔ شاید تم نے خط میں زہریلے نشتروں کو ملفوف کر کے بھیجا تھا۔ جس سے میرا ذہنی کرب بہت بڑھ گیا ہے۔ میں نے شادی کرنے سے کیوں انکار کیا۔ اس کا جواب پوچھتی ہو۔ شاید تم میرے منگیتر کو نہیں جانتی۔ جب تک مجھے یہ امید ہے۔ کہ وہ واپس آجائیگا اُس وقت تک تو میری شادی قطعاً ناممکن ہے۔ اور اس امید کے فنا ہو جانے کے بعد اگر میری شادی ہوئی تو محض اس لئے ہوگی کہ صنفِ نازک کی خون آلود تاریخ میں قربانی کے ایک نئے باب کا اضافہ ہو۔

اُس کا قد چھ فٹ سے اونچا تھا۔ ہلکی نیلگوں آنکھیں۔ اور ایسی بلند آواز ہنسی۔ جو شاید زمانہ ماقبل تاریخ میں سُنی جاتی ہوگی۔ باوجود اس ڈیل ڈول کے اُسکا چہرہ بھولپن کا مکمل نمونہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نیک نیتی کی وہ خطرناک چمک موجود تھی جس کو دیکھ کر گناہ کا ضمیر کانپ کانپ جاتا ہے۔

آہ۔ اختر۔ میں نے اس شخص سے محبت کی۔ اس سنگ مرمر کے مجسمے سے محبت کی۔ جو زندگی کے پتھریلے پہلوؤں سے تراشا گیا تھا۔

اختر جانتی ہو نا عورتیں کبھی کبھی بتوں سے بھی محبت کیا کرتی ہیں۔ سچ کہنا۔ کبھی تم نے تو ایسے شخص سے محبت نہیں کی۔ اگر کی ہے تو مبارکباد کی مستحق ہو۔ اگر نہیں کی' تو یاد رکھنا اپنے دل و دماغ کی تباہی کیلئے اس سے بہتر وسیلہ اور کوئی نہ پاؤگی۔ فریب کاریِ حسن کی کونسی بہارِ ناز ایسی ہوگی' جو اس کے انجمادِ حیات کو کم کرنے کے لئے صرف نہیں کی گئی۔ لیکن اسکی وہ خطرناک نیلگوں آنکھیں جن کو دیکھ کر گناہ کا ضمیر کانپ کانپ جاتا

تھا شعلۂ عشق سے اسی طرح بے نیاز رہیں جن دِنوں لڑائی چھڑ گئی۔ صرف اُس وقت مجھے محسوس ہُوا کہ شاید وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ اور آخرکار اُنہیں دنوں اُس نے بے معنی لفظوں میں مبہم سے فقروں میں اپنے تعشق کا اظہار کیا۔ اُنہیں دنوں ہماری نسبت قرار پاگئی۔ مَیں مسرور تھی۔ اس مسرّتِ قلب کو بیان کرنے کے لئے غالب کی شوخیِ تحریر درکار ہے۔ مجھ سے تو بن نہ آئیگا۔

اختر ـــ جب تم ایسے شخص سے محبّت کروگی جو تمہارے بس کا نہ ہو۔ اور اپنے بے پناہ سکون سے تمہاری شوخیِ عشق کو مجروح کر رہا ہو۔ اور پھر اتفاقی طور پر یکایک تم اُسے پالوگی۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ میری کیا کیفیّت ہُوئی ہوگی

فوجی خاندان کا وہ چشم و چراغ لڑائی پر جانے کے لئے تیار ہوکر مجھ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ اور اس کا لہجہ اسقدر محبوب تھا کہ میری آنکھوں میں مسرّت کے آنسو جھلک اُٹھے۔ آہ شاید وہ اپنی کامیابی کی اس روشن دلیل کو دیکھ کر مجھ سے برگشتہ ہوگیا۔ اس نے کہا۔ کہ مَیں تم سے پھر رخصت ہونے کے لئے آؤنگا۔ اور وُہ نہ آیا۔ ہائے اختر۔ کیا مَیں اُسے روکتی، کیا اگر وُہ جانا چاہتا تو مَیں اُسے روک سکتی تھی۔ مَیں جو اُس کی خواہشوں کے سمندر میں تنکے کی طرح بہے چلی جارہی تھی۔ لیکن اُسے مجھ سے پیار ہی کب تھا۔ وہ نہ آیا۔

اختر اس ستم ظریفی پر ماتم کرو۔ کہ اُسے مجھ سے عشق نہیں۔ اور وہ رسمی طور پر پیار کے لہجے میں مجھسے رخصت طلب کر رہا ہے۔

اختر اس ستم ظریفی پر ماتم کرو ـــ

دو سال کے بعد اس نے مجھے خط لکھا کہ مَیں آرہا ہوں۔

عورت کا دل فریب کے نقوش کو بہت جلد قبول کرتا ہے۔ مَیں نے سوچا۔ شاید وہ آہی جائے۔ میرا چچازاد بھائی جو دس سال بمبئی میں پڑھتا رہا تھا۔ ایک دن پہلے گھر واپس آیا۔ اُس نے میری شادی کے متعلق کوئی تذکرہ کیا، تو مَیں نے ایسی مسرّتِ قلب سے اپنے منگیتر کا نام لیا۔ کہ وہ بھی سمجھ گیا۔ کہ مجھے کلیم سے عشق ہے۔ ہم دونوں اُس روش پر جا بیٹھے، جہاں کلیم مجھ سے رخصت لینے آیا تھا۔ وہ مجھے کلیم کے آنے کی مبارکباد دے رہا تھا۔ اور میں اپنی کوشش تمام کے باوجود بھی اس احساس عشرت کو کم نہ کرسکتی تھی جو میرے رُخساروں کو سُرخ کر رہا تھا۔

اختر وہ اُس دن بھی نہ آیا۔

کیا ان حالات کے باوجود میں شادی کرسکتی ہوں۔ کہیں دُنیا کی لامحدود فضا میں ایک چھ فٹ لمبا شخص جس کا چہرہ اس قدر ڈبل ڈول کے باوجود

بھولپن کا مکمل نمونہ ہے۔ آوارہ پھر رہا ہے۔ آنکھوں کی اُن خطرناک نیلگونیوں کے ساتھ جن کو دیکھ کر گناہ کا ضمیر کانپ کانپ جاتا ہے۔

وہ میرا منگیتر اور میرا محبوب ہے۔

تمہاری
بدنصیب سہیلی
نکہت

عابد

غزل

پھر بہار آئی، ہُوا پھر گرم بازارِ جنوں ۔۔۔ شوق کے پھُولوں میں پھر تُلنے لگے خارِ جنوں
نالۂ بلبل نہیں تاثیرِ وحشت کے بغیر ۔۔۔ چاک دامانی ہے گل کی صاف اظہارِ جنوں
یاد ایا میکہ جب موجِ نسیمِ فصلِ گل ۔۔۔ کرتی تھی زنجیر ساں ہم کو گرفتارِ جنوں
ناصحِ ناداں کی حالت اور ہماری ایک ہے ۔۔۔ وہ ہے بیمارِ خرد، اور ہم ہیں بیمارِ جنوں
اہلِ دُنیا کی تگ و دو دیکھ کر دیوانہ وار ۔۔۔ ساری دُنیا مجھ کو آتی ہے نظر دارِ جنوں
بے تامل اسے دلِ وارفتہ کر اقرارِ عشق ۔۔۔ اعتباری ہے کسی مجنوں کا انکارِ جنوں؟

تجھ پہ وحشت کا اثر محرومؔ پھر ہونے لگا
پھر ترے اشعار میں پاتے ہیں آثارِ جنوں

تلوک چند محروم

خواجہ آتش رح

اس مضمون میں خواجہ آتش کی شاعری کے ایک ایسے پہلو سے
بحث کی گئی ہے جسے ارباب تنقید عموماً نظرانداز کر دیتے ہیں

عوام الناس کا ذکر کیا، لکھنؤ کے طبقہ خواص میں بھی یہ خیال وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے کہ لکھنوی وہی لوگ کہے جاسکتے ہیں، جو خاص گومتی کے کنارے پیدا ہوتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور گرتے مرتے ہیں۔ مگر غالباً ہر شخص کو اتنا تجربہ ضرور ہے کہ دُنیا میں بہتیری باتیں جس قدر مشہور و مسلم ہوتی ہیں اُسی قدر غلط اور بے معنی بھی ہوتی ہیں۔ انہیں باتوں میں سے اہل لکھنؤ کا مذکورہ بالا خیال بھی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جو شخص گومتی کے کنارے پیدا ہو، اور گومتی کا پانی پی کر پروان چڑھے یا پر پرزے نکالے، گو اُسے لکھنؤ کے ساتھ بحیثیت وطن کے ضرور نسبت ہے لیکن لفظ لکھنوی کا اطلاق اُن بلند معنوں میں جو اس کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں۔ اُس پر ہونا لازمی نہیں۔ اگر لکھنویت کا یہی معیار تسلیم کر لیا جاتا۔ تو طبقہ جہلا کے افراد بھی سب کے سب بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے۔ مگر ایسا تو نہیں ہے۔ صحیح معنوں میں لکھنوی کہے جانے کے مستحق وہ لوگ ہیں جن کی ذات لکھنؤ کے لئے خاص امتیاز و شرف کا باعث ہو۔ نہ وہ لوگ جو لکھنؤ کو اپنی ذات کے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں نے لکھنؤ کے تمدن و تہذیب میں نمایاں حصہ لیا اپنے فضل و ہنر کی روشنی پھیلائی، جن لوگوں نے لکھنؤ کے علم ادب، لکھنؤ کی زبان، لکھنؤ کی شاعری میں پاکیزہ رُوح پھونکی، بگڑے ہوئے مذاق کی اصلاح کی، اور اپنے کمال ہنر مندی کی بدولت لکھنؤ کو لکھنؤ بنایا۔ وہی صحیح طور پر لکھنوی کہے جاسکتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ کون تھے؟ اور کہاں کے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ہرگز لکھنؤ کے نہ تھے۔ وہ گومتی کے کنارے نہیں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کا ہر غیرذمہ دار شخص اپنی زبان سے لکھنوی بننے کو بن جائے مگر حقیقت شناس نگاہوں میں کبھی ایسے لوگ لکھنؤ سے منسوب نہیں کئے جاسکتے

لکھنوی ذہنیت کی یہ بوالعجبی بھی کتنی مضحکہ انگیز ہے۔ کہ چوک۔ نخاس۔ شاہ گنج۔ منصور نگر۔ مفتی گنج۔ نواز گنج

اور چند مخصوص محلوں کے سوا اور جس قدر دُنیا بستی ہے، وہاں کے باشندے سب کے سب گنوار ہیں۔ مگر اس خیال کو پیشِ نظر رکھ کر یہ مُعمّا سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر حضراتِ لکھنؤ میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہ۔ خواجہ آتش رح، شیخ ناسخ۔ اُستاد سحر۔ خواجہ وزیر۔ میر وزیر علی صبا اور نواب سید محمد خاں رند وغیرہم پر کیوں فخر کرتے ہیں؟ غالباً ان بزرگواروں کو بھی حضراتِ لکھنؤ نے لکھنوی نژاد سمجھ لیا ہے اگر فی الحقیقت ایسا ہی سمجھ لیا ہے تو اس سے بڑھ کر لاعلمی کیا ہوگی۔ کوئی تاریخ کوئی تذکرہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ مذکورالصدر اساتذہ میں سے ایک بھی گومتی کے کنارے پیدا ہُوا۔ پھر ان پر لکھنوی ہونے کی حیثیت سے فخر کرنا چہ معنی دارد۔ بُرا ہو خود فراموشی کا۔ اکثر لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کن لوگوں کے دم قدم سے لکھنو لکھنؤ بنا۔ یہ بیرونیوں اور محض بیرونیوں کا طفیل ہے۔ کہ لکھنؤ نے یہ عظمت وشہرت حاصل کی۔ انہیں بیرونیوں میں ایک خواجہ آتش رح تھے۔ جن کی شاعری کے ایک ایسے پہلو سے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم اس مضمون میں مجملاً بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اس بد مذاقی کا کیا ٹھکانا ہے کہ خواجہ آتش ایسے وہبی شاعر کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو کس سے؟ شیخ ناسخ سے۔ جنہیں حقیقی شاعری کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ بہتیرے ایسے بھی تھے (اور افسوس یہ ہے کہ اب بھی ہیں) جو خواجہ آتش کو ناسخ کے مقابلہ میں جاہل سمجھتے ہیں۔ مگر یہ کتنا بڑا دھوکا ہے! یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ "کتابے چند" کا بوجھ لاد لینا اور بات ہے۔ اور وجدانی شاعری کا حقیقت آشنا ہونا اور بات ہے۔

دیکھئے وہبی شاعر کی شان یہ ہے ۔

سامنے جو پڑ گیا دیوانہ بیباک تھا
پھاڑ کر آنکھیں جسے دیکھا گریباں چاک تھا
(آتش)

کسی کو اکتسابی علم وفضل پر کتنا ہی دسترس ہو حسن وعشق کی ایسی زندہ تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔ اس شعر میں شاعر نے جو تصویر کھینچی ہے۔ کہ کوئی مصوّر اس کی نقل اُتارنے کی جُرأت کر سکتا ہے اور اگر جُرأت کرے تو بھی کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ شاعر نے "سامنے جو پڑ گیا" کیوں کہا۔ "سامنے جو آ گیا" کیوں نہ کہا۔ کلام میں اس قسم کے نازک فرق کو وہی ملحوظ رکھ سکتا ہے، جو فصاحت وبلاغت کے نکتوں سے آگاہ ہو۔ اسی شعر سے لڑتا بھڑتا بلکہ انصاف یہ ہے۔ کہ اس کی ایک ترقی یافتہ صورت مرزا یاس یگانہ عظیم آبادی کا (جنھوں نے لکھنؤ کی بجھی ہوئی لکھنوی شاعری کے مقابلے میں حقیقی شاعری کا ایک مرقع پیش کیا ہے) یہ شعر ہے۔

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے
(یاس)

دونوں اشعار کے مجموعی محاسن کا مقابلہ کرنے کے بعد

یہی کہنا پڑتا ہے کہ الفضل للمتقدم

خواجہ آتش کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

چشم نامحرم کو برقِ حسن کر دیتی تھی بند
دامنِ عصمت تر آلودگی سے پاک تھا

کہنے کو غزل کا شعر ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے دل کتنے مقدس جذبات و تصورات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور روح میں کتنی بیداری محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ بھی دیکھنے کی بات ہے۔ یہ شعر جس طرح حسن مجازی کی شان کو نمایاں کر رہا ہے اسی طرح حسنِ حقیقی پر بھی روشنی ڈال رہا ہے۔ اصحاب صورت و ارباب معنی دونوں اپنے اپنے مذاق کے مطابق کیفیت اٹھا سکتے ہیں۔

دیدۂ عارف سے جب دیکھا تو یہ روشن ہوا
مظہر نورِ الٰہی حسن مشتِ خاک تھا

یہ شعر اور کسی کے دیوان میں ہوتا تو مایۂ ناز سمجھا جاتا۔ مگر خواجہ صاحب کے لئے مایہ ناز نہیں ٹھہر سکتا۔ شاعر کی زبان اور ہے صوفی کی زبان اور۔ یہ شعر صوفی کی زبان سے کہا گیا ہے۔ یعنی محض اک "خشک فلسفہ" کا حامل ہے۔ شعریت نہیں پیدا ہو سکی۔

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی
ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

خواجہ صاحب کا یہ شعر اک ایسا راز ہے، جسے اک مردِ عارف اور صاحب بصیرت ہی سمجھ سکتا ہے اوروں کو اس کا صحیح مفہوم سمجھا دینا نہایت دشوار ہے الفاظ اتنے سادہ ہیں کہ شعر کی گہرائی کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ راہ کون سی راہ ہے؟ سالک سے کیا مراد ہے؟ بوئے آشنا سے کس کی طرف اشارہ ہے؟ ٹھہر جانے کا کیا مطلب ہے؟ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ ع یہ راز کی باتیں ہیں کوئی انہیں کیا سمجھے۔ مجاز کا مجاز۔ حقیقت کی حقیقت۔ ازل سے ابد تک کے سفر دراز میں معلوم کتنے منازل طے کرنا پڑتے ہیں اور کہاں کہاں یہ "بوئے آشنا" دامن پکڑتی ہے۔ الٰہیات کا فلسفہ جن رموز کو دریافت کریمیں صدیوں تک الجھتا ہے۔ شاعر انہیں اپنی الہامی قوت کی بدولت اس آسانی سے قیدِ تحریر میں لے آتا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس شعر سے خواجہ صاحب کے جس احساس و ادراک کا پتہ چلتا ہے اسے قیدِ تحریر میں لانا تو کجا اُس کی تہ کو پہنچنے والا بھی مشکل سے مل سکتا ہے۔ اوّل اوّل مولانا شادؔ عظیم آبادی نے اس شعر کی گہرائی کی طرف اپنے تلامذہ کو متوجہ کیا۔ بعد ازاں میرزا یاسؔ کی

وساطت سے اہلِ لکھنؤ کی آنکھیں کھلیں، ورنہ پہلے انہیں خبر تک نہ تھی۔ کہ اردو لٹریچر میں ایسا شعر بھی موجود ہے جس کے مصنف خواجہ آتش ہیں۔

نہ روزِ حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے
جفائے یار کے آڑے مری وفا آئی

کہنا تو یہ ہے کہ میں نے روزِ حشر کو بھی دوست کے ظلم وستم پر داد خواہی مناسب نہ سمجھی۔ کیونکہ دوست سے انتقام لینا خونِ وفا کا مرتکب ہونا ہے۔ مگر قوّتِ متخیلہ نے وہ انوکھا اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ پامال مضمون میں تازہ جان پڑگئی۔ یعنی خود میری وفا جفائے یار کے آڑے آگئی!

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے پردہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردہ سے تری آواز کا

خواجہ کے اسی شعر سے ملتا جلتا غالب کا ایک شعر ہے اور غالباً اس سے زیادہ وجد انگیز ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تفاوتِ زمانی کے اعتبار سے ان دونوں اشعار میں شرفِ تقدم کسے حاصل ہے مگر اس واقعہ کو مدِ نظر رکھ کر کہ خواجہ آتش کا انتقال غالب سے بائیس برس پہلے ہو چکا ہے۔ خواجہ کے شعر کو نقشِ اول اور غالب کے شعر کو نقشِ ثانی ماننا پڑے گا۔

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی سے پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

شاعر کی تخیل نے مناظرِ قدرت کے مشاہدے سے علمِ معاشرت کا ایک اصول اخذ کیا ہے۔ دُنیا میں سیدھی سادی امن پسند زندگی بسر کرنے والی قوموں کو جابر قوموں کی دست درازیوں سے جو صدمے اُٹھانا پڑتے ہیں، اُن سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ماہرین فطرتِ انسانی کا یہ نظریہ کبھی باطل نہیں ہو سکتا کہ ہر نوعِ مخلوق کی بقا اُس کی جارحانہ زندگی پر موقوف ہے۔ مدافعانہ زندگی بسر کرنے والے اپنے حریف پر کبھی غالب نہیں آ سکتے۔ اپنی طاقت کا مظاہرہ کئے بغیر دُنیا میں بسر کرنا ممکن نہیں۔ اسی نظریہ کو شاعر کی قوّتِ تخیل نے مناظرِ قدرت سے ثابت کیا ہے۔

بجا کیا اسے توڑا جو سر سے دریا کے
حباب لے کے یہ خالی پیالہ کیا کرتا

یہاں بھی شاعر نے ایک منظرِ قدرت کے مشاہدہ سے ایک فلسفیانہ نکتہ پیدا کیا ہے۔ اور اس صوفیانہ مسلک کی طرف اشارہ کیا ہے، جو اس چند روزہ زندگی

کو ہستی مطلق میں فنا کر دینے اور اس طرح حیاتِ ابدی
حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی مضمون کو خواجہ صاحب
نے اپنے مطلع سرِ دیوان میں یوں فرمایا ہے ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا

افسوس ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ اصحاب نے
نیچرل شاعری کا بالکل غلط مفہوم سمجھا ہے۔ وہ مناظرِ قدرت
کی محض بے نتیجہ نقالی کو کمالِ شاعری سمجھتے ہیں۔ "بادل
گرج رہا ہے"۔ "بجلی چمک رہی"۔ "کوندا لپک رہا ہے"
"غنچہ چٹک رہا ہے"۔ "مینہ برس رہا ہے"۔ "مور ناچ
رہا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ بھلا ان مہملات کی "دندان تو جملہ
در دہان اند" سے زیادہ کیا وقعت ہو سکتی ہے؟
نیچرل شاعری تو وہ ہے کہ مناظرِ قدرت سے کوئی اہم نتیجہ
نکالا جاتے۔ جس سے انسان کا دل و دماغ روشن ہو جائے
نیچرل اور مسلسل نظموں پر آجکل بہت زور دیا جا رہا ہے
ادبی رسالوں کے قیمتی صفحات مسلسل مجموعۂ خرافات سے
سیاہ کئے جا رہے ہیں۔ ان مجموعۂ خرافات کو حقیقی شاعری
کے معیار پر پرکھو گے تو ساری کی ساری نظم میں دو ایک
شعر سے زیادہ نہ ملے گا۔ جو صحیح معیارِ شاعری پر ٹھیک
اُترے۔ دو ہی چار شعر کہو مگر اُن میں حسنِ بیان کے ساتھ
حقیقت و صداقت اتنی ہو کہ بھلائے سے نہ بھولے۔

شاعری کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔ دیوانِ غالب کا بیشتر حصہ
اور دیگر اساتذہ کے ہزاروں متفرق اشعار فقط شعراء کے
حافظہ میں نہیں، بلکہ عام و خاص سب کے حافظہ میں
موجود ہیں۔ ایک ایک شعر انسان کی سیرت اور اُس
کی زندگی پر علانیہ یا پوشیدہ اثر ڈالتا رہتا ہے۔ کیا
دیوانِ غالب مسلسل نظموں کا مجموعہ ہے؟ محض تسلسلِ شعر
کو زندہ رکھنے اور بکار آمد ثابت کرنے کے لئے کافی
نہیں۔ مسلسل لفاظیوں مسلسل تک بندیوں سے شاعری
کا حق ادا نہیں ہوتا۔ جب تک نظم کے قالب میں حقیقی
شاعری کی رُوح موجود نہ ہوگی اُس کی بقا محال ہے۔

خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردودِ دوستاں ہو
جدا ہوا شاخ سے جو پتا غبارِ خاطر ہوا چمن کا

دیکھئے یہاں بھی مناظرِ قدرت شاعر کی نگاہوں
کے سامنے عبرت انگیز نظارہ پیش کر رہے ہیں۔ خشک
پتّوں کو شاخ سے جدا ہوتے دیکھ کر قوتِ متخیّلہ اُن بدنصیبوں
کی تصویر پیش کر دیتی ہے۔ جو دوستوں پر بارِ خاطر ہو کر
الگ کر دئے جاتے ہیں۔ یہ ہے نیچرل شاعری۔
ان اشعار سے ناظرین ضمناً یہ اندازہ بھی کر سکتے
ہیں کہ مرکب استعارے پیدا کرنے میں خواجہ آتش کو
مبداءِ فیاض سے کتنی بڑی قوتِ اختراعی عطا ہوئی

تھی۔ استعاروں کا اگر صحیح مصرف لیا جائے تو کلام میں وہ زور پیدا ہو جاتا ہے جو سادہ انداز بیان سے ممکن ہی نہیں۔ مگر اس بات کی تمیز بھی خداداد ہوتی ہے۔ کہ کس مقام پر کس قسم کے استعاروں سے کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کن مقامات پر کن استعاروں سے کلام اُلجھ کر گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔ اگر بعض شعرا کا کلام استعاروں کی بدولت پیچیدہ اور دور از فہم ہو جاتا ہے تو اس سے استعارہ کی خوبیوں پر حرف نہیں آسکتا بلکہ شاعر کے پھوہڑپن کا ثبوت ملتا ہے۔ زبان کا جوہر فکر سے کُھلتا ہے۔ اور فکر کا جوہر زبان سے۔

خواجہ صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

دکھایا آئینہ فکر نے جب صفائے آبِ دُرِ سخن کا
دہن کو جوہر کھلا زباں کا زباں کو عقدہ کھلا دہن کا

مختصر یہ ہے کہ شاعری نیچرل ہو یا دجدانی مسلسل ہو یا غیر مسلسل جب تک دماغ میں قوتِ فکر اعلیٰ درجہ کی نہ ہوگی اور فکر کے ساتھ زبان پر غیر معمولی قدرت نہ ہوگی کلام زندہ نہ رہ سکیگا۔

آتشِ گل سے کیا ہے مری طینت کو خمیر
دامنِ بادِ بہاری مجھے بھڑکاتا ہے

جن طبیعتوں کو قدرتی طور پر شعر گوئی کا صحیح ذوق عطا ہوتا ہے، وہی اس راز کو سمجھ سکتی ہیں۔ کہ شاعر کا معیار کمال یہ ہے۔ کہ گہرے سے گہرا فلسفہ شعریت میں اتنا غرق ہو جائے کہ بادی النظر میں فلسفہ معلوم ہی نہ ہو۔ خواجہ صاحب کا یہ شعر بھی اسی قسم کی ایک بہتر سے بہتر مثال ہے۔ خدا بخشے مولانا اکبر الہ آبادی کی زبان سے جس نے اس شعر کو سُنا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت اکبر کو خواجہ کے اس شعر پر کیا شاعرانہ وجد آتا تھا۔ ایک حاسد منکر تو یہ کہکر ٹال دیگا۔ کہ شعر میں فقط رعایتِ لفظی اور مناسبت ظاہری اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آتش گل کے لئے بادِ بہاری۔ بادِ بہاری کے لئے بھڑکانا۔ اور بھڑکانے کے لئے دامن طینت کے لئے خمیر وغیرہ وغیرہ۔ مگر ایک نکتہ رس سمجھ سکتا ہے کہ فطرت انسانی کے فلسفہ کو شاعر نے کتنی پاکیزہ زبان میں بیان کیا ہے۔ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ وہ ایسے ماحول میں رکھا گیا ہے جہاں جذبۂ عشق و محبت کا بھڑکنا ناگزیر ہے۔ عشق کی آگ پہلے ہی سے موجود اور اس پر حسن کی کارفرمائی ایسی ہی ہے جیسے باد و آتش کا اختلاط۔ ایسی حالت میں گناہ سے بچنا غیر متوقع کیا غیر ممکن ہے۔ عمر خیام نے تو سیدھی سادی زبان میں کہدیا کہ ع،

آنکس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو

مگر یہاں شاعر نے وہ انداز بیان کیا ہے، کہ سارا

فلسفۂ فطرتِ انسانی شعریت میں غرق ہوکر رہ گیا۔ سرسری نگاہ سے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ خواجہ کا یہ شعر کسی گہری فلاسفی کا حامل ہے۔ مگر یہ کون سمجھے ؟

آتش
سمجھتا کوئی تو اس اندھی نگری میں زباں میری
الٰہی کاش میں پیدا ہوا ہوتا گنواروں میں

ناصر حسین ایم اے

جرعات

ہنگامہ ہائے رونقِ دُنیا کو کیا کروں!　　　مَیں آبدیدہ رنگ تماشا کو کیا کروں ؟
کم کر سکے نہ کچھ بھی اگر کاہشِ فراق　　　اس گلستانِ گنبدِ مینا کو کیا کروں!
پھر اضطرابِ کشمکشِ موت و زیست ہے　　　حسنِ طلسمِ وعدہ فردا کو کیا کروں!
اب خاک ہوکے بھی ہیں وہی بے قراریاں　　　اے حسنِ دوست تیری تمنّا کو کیا کروں!
اندوہِ زندگی کا مداوا اگر نہیں　　　آبِ حیات و دستِ مسیحا کو کیا کروں!
پیشِ نظر نہیں ہے وہ سرمایۂ نشاط　　　آغوشِ جام و گردنِ مینا کو کیا کروں!

سیلابِ اضطراب ہے رگ رگ میں اے اثرؔ
اس دل کے شعلہ زارِ تمنّا کو کیا کروں!

اثر صہبائی

سحر سامری

(۱)

عشق میں مغموم رہنا ہے خوشی میرے لئے
باعثِ تسکین ہے دل کی بیکلی میرے لئے

دل میں روشن ہے چراغِ عاشقی میرے لئے
اِک طلسمِ بیخودی ہے زندگی میرے لئے

آرزوؤں کی کشاکش سے سدا محفوظ ہوں
رُوح پرور کس قدر ہے بیدلی میرے لئے

اُس کی چشمِ مست کہتی ہے زبانِ حال سے
ہیچ ہے سب ہیچ سحر سامری میرے لئے

اے خُدا غیروں کو حاصل ہو فروغِ حسنِ دوست
اور یہ اندوہ درد بیکسی میرے لئے

ہیں فروزاں داغہائے دل مثالِ برقِ طور
شامِ ہجراں میں ہُوئی ہے روشنی میرے لئے

ہوں مبارک زاہدوں کو جاوداں حور و قصور
عالمِ فانی کا حسن عارضی میرے لئے

مَیں نے اکبرؔ اس کو پہچانا ہے تا حدِّ کمال
ہے فلک آسا زمینِ شاعری میرے لئے

(۲)

بہارِ زندگانی گلفشاں معلوم ہوتی ہے
تری تصویر سینے میں نہاں معلوم ہوتی ہے

مصیبت کشمکشہائے محبت کی نہیں جاتی
وفا کی ٹیس درد جاوداں معلوم ہوتی ہے

فروغِ بیخودی ہے اُن کے پیراہن کی رنگینی
کوئی موجِ شرابِ ارغواں معلوم ہوتی ہے

تری چشمِ خمار آلود میں اِک سحرِ قاتل ہے
نگاہِ مہربانی جانستاں معلوم ہوتی ہے

تری فرقت میں تاروں کی طرح سب داغ روشن ہیں
زمینِ دل حریفِ کہکشاں معلوم ہوتی ہے

وہ عالم ہے کہ پہروں سانس سینے میں نہیں آتا
شبِ اندوہ مرگِ ناگہاں معلوم ہوتی ہے

بہارِ ناز سے اُس نو گلِ رعنا کی اے اکبرؔ
محبت گلستاں در گلستاں معلوم ہوتی ہے

جلال الدین اکبرؔ

خیال آفرینیاں

شیون فضول اور فغاں رائگاں ہے اب
اس گلستاں میں کون میرا ہمزباں ہے اب

واماندگی سے راحتِ منزل ہوئی نصیب
غوغائے سارباں نہ جرس کی فغاں ہے اب

حائل رہا کوئی نہ کوئی وصلِ یار میں
اصرار اُٹھ گیا تو حیا درمیاں ہے اب

وہ دن گئے کہ دورِ مسرت نصیب تھا
ہے خونِ آرزو کہ مئے ارغواں ہے اب

منقار شعلہ گیر ہے درکار اسے ہما
انگارہ سوزِ عشق سے ہر استخواں ہے اب

کچھ مالِ نقدِ دل ہی بازارِ عشق میں
سودا ہے سود ہے نہ خیالِ زیاں ہے اب

اے چرخ رنج خانہ بدوشی نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ مکاں لامکاں ہے اب

خونابہ جگر ہے رواں آنسوؤں کے ساتھ
سارا زمانہ آہ میرا راز داں ہے اب

جھونکا کہیں سے آئے نسیمِ مراد کا
کشتی مری حیات کی بے بادباں ہے اب

فیروزؔ اُٹھ گئیں وہ خیال آفرینیاں
سرمایۂ کمال زباں ہی زباں ہے اب

مژدہ ملک الموت کو لبیک قضا کو
بیمارِ الم زہر سمجھتا ہے دوا کو

ظلم اُن کو نہ آیا کہ ستم اُن کو نہ آیا
افسوس نہ سیکھے تو نہ سیکھے وہ وفا کو

بیخود ہوں تو کیا عیب؟ نہ آجوش ہیں واعظ
آخر یہ خودی تو نہیں منظورِ خدا کو

کیا کم ہے کہ عادت تو ہوئی نیک گماں کی
مانا کہ وفا کہتے ہیں وہ اپنی جفا کو

گرنا ہے مرا عین سنبھلنے کا تقاضا
دیکھو نہ حقارت سے مری لغزشِ پا کو

دل نغمۂ اندوہ سے لبریز ہے فیروزؔ
سُن جاؤ جو چھیڑا ہے کسی تلخ نوا کو

راز دہر

اتفاقاً ایک محفل میں ہُوا میرا گزر
ہو گیا مَیں وقفِ حیرت رنگِ محفل دیکھ کر

مجتمع کچھ اہل دانش تھے وہاں کچھ باکمال
اپنی اپنی جا ہر اک ان میں سے تھا روشن خیال

کوئی صوفی، کوئی شاعر، کوئی تھا سائنسدان
منطقی تھا کوئی، کوئی ماہرِ علمِ بیان

کوئی تھا کامل محدّث کوئی تھا یکتا ادیب
کوئی تھا ماہر ریاضی کا کوئی حاذق طبیب

اِک طرف کچھ فلسفی تھے اِک طرف قانون دان
دلکش و دلچسپ تھا ہر ایک کا طرزِ بیان

مسئلہ درپیش تھا اس خاکدانِ دہر کا
اپنی اپنی کہہ رہا تھا جو وہاں موجود تھا

سب سے پہلے اس طرح گویا ہُوا اِک فلسفی
"چند ذرّوں پر بنا ہے خاکدانِ دہر کی

ذرّہ ہائے خاک ہیں سرمایہ دارِ کائنات
گردشِ ذرّات ہی پر ہے مدارِ کائنات

مختلف رکھتے ہیں رائیں اس میں گو اہلِ یقین
ہے حقیقت یہ کہ اس میں شک کی گنجائش نہیں"

سُن کے یہ قانون داں اِک اس طرح کہنے لگا
"گردشِ ذرّات سے ہم کو نہیں کچھ واسطا

ہاں مگر اِک منضبط قانون ہے اِس دہر کا
منحصر ہے جس کے اُوپر ابتدا و انتہا

بس اسی قانون پر دُنیا کا ہے دار و مدار
ہے کوئی مخلوق دُنیا میں نہ ہے پروردگار"

ماہرِ علمِ ریاضی اُٹھ کے یوں گویا ہُوا
"کچھ نہیں دُنیا مرقع ہے فقط اشکال کا

شکل ہی پر منحصر ہے بس وجودِ کائنات
شکل ہی ہر ایک خود ہے مجمعِ ذات و صفات

یوں گہرافشاں ہوا پھر صوفیِ عالی مقام — "مظہرِ انوارِ قدسی یہ جہاں ہے لا کلام

خالق و مخلوق میں تفریق کچھ مطلق نہیں — متفق ہیں اس کے اوپر اہلِ دل اہلِ یقیں

نورِ حق ہی جلوہ فرما پیکرِ خاکی میں ہے — جلوہٴ مطلق سراپا پیکرِ خاکی میں ہے

کل ہے خالق اور اس کا جزو ہے سارا جہان — پرتوِ نورِ ازل ہیں یہ زمین و آسمان"

شاعرِ شیریں بیاں پھر اس طرح گویا ہوا — "کچھ نہیں دنیائے فانی عشق و الفت کے سوا

حسن ہے یہ جسم فانی، عشق ہے روحِ رواں — ہے انہی سے منضبط شیرازہٴ بزمِ جہاں"

پھر مورخ ایک اٹھا اور کی یہ گفتگو — "رات دن رہتی ہے مجھ کو بس یہی اک جستجو

کب بنی دنیائے فانی، اور کب سازِ حیات — روح پرور کب سے ہے یہ نغمہ زارِ کائنات؟

سخت حیرت میں ہوں لیکن بھید کچھ کھلتا نہیں — کب سے قائم آسماں ہے کب سے قائم ہے زمیں؟

بات اتنی پایہٴ تحقیق کو پہنچی ضرور — ہے مسبّب عالمِ اسباب کا کوئی ضرور

کون ہے، لیکن، وہ کب سے ہے؟ پتہ چلتا نہیں — آسماں ہے اس کا مسکن یا ٹھکانا ہے زمیں

سن کے سب کی گفتگو میں محوِ حیرت ہو گیا — چلدیا اس انجمن سے دل میں یہ کہتا ہوا

"کچھ بھی ہو دنیائے فانی بات ہے اتنی ضرور
ہے کسی کی شانِ خلاقی کا یہ ادنےٰ ظہور"

عالی لکھنوی بی-اے

فریبِ نظر

(جناب عبدالستار خاں ٹیگور کے ترجمے جس سلاست روانی سے کرتے ہیں میں اس کا قائل ہوں، اور میں یہ کہونگا کہ اُن کے ترجمے عام مترجمین ٹیگور کیلئے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہوتے ہیں) ایڈیٹر

ابھی کانتی چندر کی عمر ہی کیا تھی پھر بھی اُنہوں نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کا مطلق خیال نہ کیا۔ سیر و شکار میں اپنا تمام وقت صرف کرنے لگے۔ ان کا قد لانبا اور بدن چھریرا تھا۔ نظر تیز تھی نشانہ کبھی خطا نہ کرتا تھا۔ وہ تھے تو بنگالی لیکن اُنکی وضع قطع اور پوشش ہندوستانیوں جیسی تھی۔ اُن کے ہمراہ مشہور پہلوان اور خوش آواز گویّے رہا کرتے تھے۔ خوشامدی اور بیکار مصاحبوں کی بھی کمی نہ تھی۔

چند احباب کو ہمراہ لیکر اگھن کے مہینے میں وہ شکار کی غرض سے نید تگھی کی ندی کے کنارے جا پہنچے۔ ندی کے اندر انہوں نے دو بڑی کشتیوں پر قیام کیا۔ چند کشتیاں اور بھی ساتھ تھیں۔ ان میں مصاحبوں اور خادموں کا قیام تھا۔ ان کشتیوں کی موجودگی کے باعث گاؤں کی عورتوں کا دریا میں نہانا دھونا اور آنا جانا بند سا ہو گیا۔ دن بھر بندوقوں کی آواز سے سطحِ آب میں تلاطم اور خشکی میں لرزہ بپا رہتا۔ رات کو گویوں کی تانوں سے گاؤں والوں کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں۔

ایک روز صبح کانتی چندر اپنے بجرے میں بیٹھے ہوئے بندوق کی نلی صاف کر رہے، اتنے میں قریب ہی بطخ کی آواز سنائی دی اُنہوں نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ ایک لڑکی دو بطخیں اپنے سینہ سے چمٹاتے گھاٹ پر کھڑی ہے۔ یہ ندی چھوٹی سی تھی۔ اور اس میں روانی گویا تھی ہی نہیں۔ لڑکی نے بطخوں کو پانی میں چھوڑ دیا۔ اور انہیں اپنے قریب ہی رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی محبت آمیز انداز سے انہیں اپنے ہاتھوں سے روکے ہوئے تھی۔ تاکہ وہ دُور نہ چلی جائیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی بطخیں چھوڑ کر چلی جایا کرتی تھی۔ لیکن ان دنوں شکاریوں کے خوف سے چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

اس کا حُسن نرالے انداز کا تھا۔ گویا صنّاعِ حقیقی نے ابھی گڑھ کر اس کے جسم میں جان ڈالی ہو۔ اس کے سن کا تخمینہ لگانا مشکل تھا۔ شباب کے آثار ہویدا ہو چلے تھے۔ لیکن اس میں بھولپن تھا۔ اور ایسا کہ وہ اپنے سن کے اثرات سے گویا متاثر ہی نہیں، اُسے اپنے شباب کی خبر ہی نہیں

کانتی چندر تھوڑی دیر کے لئے اپنی بندوق کی نلی صاف کرنا بھول گئے۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہے

ہوں۔ انہیں یہ کبھی خواب میں امید نہ ہو سکتی تھی کہ ایسی
جگہ ایسی صورت نظر آئیگی۔ پھول اپنی ٹہنی ہی پر زیادہ
خوبصورت نظر آتا ہے۔ طلائی گلدستہ میں نہیں۔ کنارِ دریا
کا منظر جاڑوں کی شبنم اور صبح کی دھوپ میں عجیب
دلکش نظر آتا تھا۔ اس دلفریب سمے میں لڑکی کی بھولی
بھولی شکل دیکھ کر کانتی چندر پر محویت کا عالم طاری
ہو گیا۔

یک بیک لڑکی نے خوفزدہ ہو کر ایک چیخ ماری
رونا سا منہ بنا کر بطخوں کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور کچھ کہتی
ہوئی چلی گئی۔ کانتی چندر نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے
وہ اس کا سبب معلوم کرنے کی غرض سے بجرے کے
باہر آئے۔ کیا دیکھا کہ ان کا ایک رسیا مصاحب لڑکی
کو ڈرانے کے خیال سے تمسخراً اپنی بندوق سے اُس
کی بطخوں کا نشانہ لگا رہا ہے۔ کانتی چندر نے پیچھے سے
آ کر اُس کی بندوق چھین لی، اور اس کے گال پر ایک
طمانچہ رسید کیا۔ اچانک اپنے رنگ میں یہ بھنگ دیکھ کر
وہ مصاحب وہاں سے ٹل گیا۔ کانتی چندر بجرے کے
اندر جا کر اپنی بندوق صاف کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد کانتی چندر نے ایک کبوتر پر فیر کیا۔
کبوتر زخمی ہو کر تھوڑی دور پر جا گرا۔ کانتی چندر اس کا
پتہ لگاتے ہوئے گاؤں کی طرف چلے۔ انہیں زیادہ
تجسس نہ کرنا پڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک مکان کے
سامنے پیپل کا درخت ہے۔ اس کے نیچے وہی لڑکی
اسی گھائل کبوتر کو لئے بیٹھی ہے۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی
ہے۔ اور محبّت سے اپنا ہاتھ اُس کبوتر پر پھیرتی جاتی
ہے۔ قریب کے درختوں کے تھالوں میں اپنا آنچل تر
کر کے اُس نیم جاں کبوتر کے حلق میں پانی نچوڑتی جاتی
ہے۔ اُس کی بلّی بھی قریب ہی پیر پھیلائے بیٹھی ہے
اور اپنی للچائی ہوئی نگاہوں سے کبوتر کو دیکھتی جاتی ہے
لیکن وہ لڑکی اپنی انگلی کے اشارہ سے اُس کی آرزو
کو پامال کر دیتی ہے۔

دوپہر کا وقت تھا، گاؤں میں سناٹا چھایا
ہوا تھا۔ اس میں یہ حسرت فزا منظر ایسا دردناک تھا،
کہ اس نے کانتی چندر کے قلب پر اپنا دائمی اثر ثبت
کر دیا۔ درخت کے پتّوں میں سے دھوپ چھن چھن کر
لڑکی پر پڑ رہی تھی۔ وہیں پاس ہی ایک موٹی تازی گائے
آرام سے بیٹھی جگالی کرتی تھی۔ اور اپنے سینگوں اور
دُم سے مکھیاں ہانکتی تھی۔ ہوا سے بانس کی پتیاں ہلتی
تھیں تو اُن سے ایک شور پیدا ہو رہا تھا۔ صبح جو لڑکی
دریا کے کنارے جنگل کی دیوی نظر آئی تھی، وہی یہاں
محبت کا مجسمہ بنکر گھر کی لکشمی کی شکل میں ظہور کئے
ہوئی تھی۔

کانتی چندر ہاتھ میں بندوق لئے اُس لڑکی کے سامنے اچانک آگئے۔ آتے ہی محجوب ہوکر کھڑے ہوگئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا چور مع مالِ مسروقہ کے گرفتار ہوگیا ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ کہیں کہ یہ کبوتر مجھ سے گھائل نہیں ہوا ہے۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ سلسلہ جنبانی کیسے کروں کہ اتنے میں اندر سے کسی نے آواز دی۔ "سدھا!" لڑکی چونک سی پڑی پھر آواز آئی "سدھا!" کبوتر ہاتھ میں لئے ہوئے لڑکی اندر چلی گئی۔ کانتی چندر نے اپنے دل میں کہا "ماشاء اللہ نام خوب ہے، کتنا پیارا ہے۔ سدھا!"

کانتی چندر واپس آئے بندوق کشتی میں رکھدی اور اُسی مکان کے صدر دروازہ پر جا موجود ہوئے۔ دیکھا ایک برہمن چاروں ابروؤں کا صفایا کئے چبوترے پر بیٹھا بھگت مال پڑھ رہا ہے۔ بشرہ سے سکون اور متانت ٹپک رہی ہے۔ کانتی چندر کو اس برہمن کے عارفانہ پُرسکون چہرہ کی تجلی میں اور اس لڑکی کے غمخوار چہرہ کی ضیا میں یگانگت نظر آئی۔

کانتی چندر نے برہمن کو نسکار کیا۔ اور کہا۔ "مجھے پیاس معلوم ہوتی ہے۔ پانی پلائیے۔" برہمن نے نہایت احترام سے انہیں قریب بٹھالیا۔ اندر جاکر پانی اور کچھ بتاشے لائے، اور اپنے معزز مہمان کے سامنے رکھ دئے۔

کانتی چندر جب پانی پی چکے تو برہمن نے اُن سے پُوچھا۔ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

کانتی چندر نے اپنا نام اور پتہ بتایا۔ کہا۔ "اگر میں آپ کی خدمت کرسکا تو اُسے اپنا فخر سمجھونگا۔"

اُس برہمن کا نام نوین چندر تھا۔ اُس نے کہا۔ "مجھے کوئی ایسی خواہش نہیں۔ آپ مجھ پر کونسا احسان کرسکتے ہیں؛ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف ایک فکر ہے۔ میری ایک لڑکی ہے۔ اُس کا نام سدھا ہے اُسی کی شادی کی فکر میں ہوں۔ خاندانی اور لائق لڑکے کی تلاش ہے۔ یہاں کوئی ایسا نہیں۔ میں باہر اور دور جانے کے قابل نہیں۔"

کانتی چندر نے کہا۔ "آپ میری کشتی پر تشریف لائیے۔ میں آپ کو اچھا لڑکا بتاؤنگا۔"

کانتی چندر نے سدھا کے متعلق تمام حالات دریافت کرنے کی غرض سے چند آدمیوں کو گاؤں میں بھیجا۔ لوگوں نے ان سے لڑکی کی بڑی تعریف کی۔

دوسرے دن نوین چندر بجرے میں آئے۔

کانتی چندر نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا۔ اور اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں خود ہی آپ کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ برہمن جب اس غیر متوقع

خوش نصیبی سے واقف ہوا تو اس کے استعجاب کی کوئی حد نہ رہ گئی۔ اُسے وہم و گمان میں بھی یہ خیال نہ تھا۔ بلکہ اُس نے سمجھا کہ کانتی چندر کو مغالطہ ہو گیا ہے اس نے مکرر دریافت کیا۔ "کیا آپ میری لڑکی سے شادی کرنے کے متمنی ہیں؟"

"جی ہاں۔ اگر آپ منظور فرمائیں تو یہ میرے لئے باعثِ فخر ہو گا۔"

نوین چندر نے پھر پوچھا۔ "سدھا سے؟"

جواب ملا۔ "جی ہاں"

نوین چندر نے سنجیدہ لہجہ میں پھر کہا۔ "نہ تو آپ نے اُسے دیکھا ہی ہے۔ اور نہ اُس کے متعلق آپ کو کسی قسم کا علم ہے۔"

کانتی چندر نے ایسے انداز سے جواب دیا۔ کہ گویا اُس نے یقیناً اُسے نہ دیکھا ہو۔ "اس کی آپ مطلق فکر نہ کیجئے۔"

نوین نے خوش ہو کر کہا۔ "میری سدھا بڑی نیک ہے۔ امور خانہ داری میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔ جس طرح تم بغیر دیکھے اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گئے ہیں میں بھی دعا دیتا ہوں کہ وہ تمہاری تابعدار رہ کر تمہیں خوش رکھے۔"

ماگھ میں شادی طے ہو گئی۔

گاؤں کے رئیس مدا بابو کا مکان شادی کے لئے منتخب کیا گیا۔ وقت پر دولہا مع ساز و سامان اور باجے گاجے کے آگیا۔

شادی میں مانگ میں سیندور بھرنے کے وقت دولہے نے دلہن کی طرف دیکھا۔ سدھا مارے حجاب کے سر جھکائے ہوئے تھی۔ کانتی چندر جیسا آدمی بھی اُس کو اُس وقت اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ گویا اسکی آنکھوں میں خوشی کی بجلی کوند گئی۔

خاندانی رسم کے مطابق دولہے کو ناشتہ کے لئے اندر جانا پڑا۔ وہاں ایک عورت نے دولہے سے دلہن کا گھونگھٹ کھلوایا۔ نقاب اُلٹتے ہی کانتی چندر گویا چونک پڑے۔

یہ تو وہ لڑکی نہیں! بجلی گر پڑی۔ ایک لمحہ کے اندر تاریکی چھا گئی۔ اس تاریکی نے دلہن کے چہرہ کو بھی تاریک بنا دیا۔

کانتی چندر نے اپنے دل میں شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ لیکن تقدیر نے چشم زدن میں یہ عہد توڑ ڈالا۔ اچھے اچھے گھروں سے پیغام آئے لیکن کانتی چندر نے منظور نہ کیا۔ اعلیٰ خاندانوں کے تعلق کا خیال اور فخرِ دولت کا لالچ اور حسن کی طمع کانتی چندر کو اپنے عہد سے پھیر نہ سکی تھی۔ آخر کار ایک گمنام گاؤں میں ایک مجہول التعریف

نادار شخص کے یہاں دھوکے میں پھنس گیا۔ اب لوگوں کو کیا منہ دکھائیگا۔

پہلے اسے اپنے خسر پر غصّہ آیا۔ اس ٹھگ نے ایک لڑکی دکھا کر دوسری سے شادی کر دی۔ پھر اس نے سوچا۔ نوین چندر نے تو لڑکی دکھائی نہیں، بلکہ وہ شادی سے قبل لڑکی دکھانے پر راضی تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ اپنی سمجھ کی غلطی کو ظاہر نہ ہی کرنا کانتی چندر نے مناسب سمجھا۔

اس نے دوا کے کڑوے گھونٹ کی طرح اسے بھی حلق سے نیچے اُتار لیا۔ مگر چہرہ پر ملال کا اثر ظاہر ہو ہی گیا۔ سسرال کی عورتوں کا مذاق اسے برا معلوم ہونے لگا۔ اسے اپنے پر اور دوسروں پر سب ہی پر غصّہ آتا تھا۔

اتنے میں اس کی نویلی دُلہن، جو اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ خوف سے چیخ اُٹھی۔ اس کے قریب سے ایک خرگوش کا بچّہ دوڑتا ہُوا نکل گیا تھا۔ اس بچّہ کے پیچھے پیچھے اس دن والی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ بچّہ کو پکڑ کر اپنے گال سے اس کا گال لگا لیا۔ اور اُسے دلارنے لگی۔ "وہ پگلی آگئی۔" کہہ کر سب عورتیں اُسے اشارہ سے وہاں سے جانے کو کہنے لگیں۔ اُس نے اس کا مطلق خیال نہ کیا۔ دُولہا دُلہن کے سامنے بیٹھ کر بچوں کی طرح تعجب سے دیکھنے لگی۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک عورت نے اُسے زبردستی اُٹھانا چاہا۔ کانتی چندر نے کہا۔ "اسے بیٹھی رہنے دو۔" اس کے بعد کانتی چندر نے اس لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

اُس لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور دولہے کا مُنہ دیکھنے لگی۔ جتنی عورتیں وہاں بیٹھی تھیں ہنسنے لگیں۔

کانتی چندر نے پھر پوچھا۔ "تمہاری بطخیں اچھی ہیں؟"

پھر بھی کوئی جواب نہ دیکر لڑکی بے حجابانہ انداز سے کانتی چندر کا مُنہ دیکھتی رہی۔

کانتی چندر نے جُرأت کر کے پھر پوچھا۔ "تمہارا وہ کبوتر اچھا ہو گیا؟" اس مرتبہ بھی کچھ جواب نہ ملا۔ سب عورتیں یوں ہنسنے لگیں کہ گویا دولہے کو دھوکا ہو گیا ہے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہُوا، کہ وہ لڑکی گونگی اور بہری ہے۔ گاؤں کے سب جانور اور چڑیاں اس کی ساتھی ہیں۔ اُس دن جو وہ سدھا کا نام سُنکر اندر آگئی تھی وہ محض ایک امر اتفاقیہ تھا۔

کانتی چندر یہ سُنکر چونک سے اُٹھے۔ جن کے نہ ملنے سے اُن کو دُنیا سونی معلوم ہونے لگی تھی۔ آج اسی سے چھٹکارا پاکر اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہو گئے۔ اپنے دل میں کہنے لگے۔ "مَیں کہیں اس لڑکی کے باپ کے پاس

پہنچ جانا اور اس کا باپ اسے میرے سر منڈھ کر اس سے نجات پانے کی کوشش کرتا تو!"

جس وقت اس لڑکی کی محبت اُنکے قلب میں طوفان برپا کئے ہوئی تھی۔ اس وقت تک وہ اپنی بیوی کی طرف سے اندھے ہو رہے تھے۔ انہیں تو یہ خواہش بھی نہ تھی کہ یہ دیکھیں کہ اُن کے پاس غم غلط کرنے کا اور بھی ذریعہ ہے یا نہیں۔ مگر جونہی انہیں اس لڑکی کے گونگے اور بہرے ہونے کا حال معلوم ہوا اُن کی نگاہوں کے سامنے سے وہ سیاہ غلاف اُٹھ گیا۔ کانتی چندر نے اپنے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اور موقع پاکر اپنی دُلہن کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ انہیں لکشمی سے بھی زیادہ حسین نظر آئی اتنی دیر بعد انہیں معلوم ہو کہ نوین چندر کی دعائیں بے اثر نہ جائیں گی۔

(ٹیگور) عبدالستار خاں

قطعہ

بسال وفات بہ اندوہ جناب برج نرائن صاحب چک بست لکھنوی ۱۹۲۶ء

شاعر نکتہ رسے برج نرائن چک بست
سخت دشوار ہے اُن کا سا سخنداں ہونا

ذیل کے شعر میں بتلاتے ہیں اس مسئلہ کو
زیست کیا ہوتی ہے کیا چیز ہے بیجاں ہونا

"زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترکیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا"

قول کو اپنے عمل سے بھی کیا اب ثابت
ہے بجا موت پر ان کی مرا نالاں ہونا

شعر مذکور ہی تاریخ کا ماخذ ہو اگر
بات ہی کیا ہے اس اشکال کا آساں ہونا

کچھ تصرف سے یہ شاداں نے کہا سن وفات
ہے حد[۱] مرگ عناصر کا پریشاں ہونا

۱۹۲۶ء

سید اولاد حسین شاداں بلگرامی

---

[۱] اصطلاح منطق میں تعریف شے بذاتیات کو حد کہتے ہیں۔

جرعات

(۱)

اب شیوۂ میکشی ہے عام اے ساقی ممکن نہیں اس کی روک تھام اے ساقی
کمظرف کہاں شراب گلفام کہاں ارزانیِ مے کا ہے یہ کام اے ساقی

(۲)

فانی ہے بہار زندگانی ساقی دے جامِ شراب ارغوانی ساقی
رنگینیِ خواب شادمانی ہے شباب قائم رہے خوابِ شادمانی ساقی

(۳)

تنویرِ جمال ہے جوانی میری شادابِ وصال ہے جوانی میری
رنگینیِ عشق سے ہے لبریز نظر فردوسِ خیال ہے جوانی میری

(۴)

عشرت سے ہے شام ارغوانی میری ہنستی ہے بہارِ کامرانی میری
آغوشِ خیال میں ہیں گلہائے جمال گلزار بدامن ہے جوانی میری

(۵)

کیا خاتمِ جمشید ہے کیا افسر کے بیکار ہے زرفشانیِ حاتم طے
میں بادہ گسار ہوں مجھے کافی ہے یا ساغرِ ماہتاب یا ساغرِ مے

(۶)

گلریزی شاخہائے عشرت فانی شادابیِ تنویرِ مسرت فانی
دنیا میں حسین صورتیں لاکھوں ہیں آجاؤ کبھی کہ ہے محبت فانی

عابد

فریبنہ

برطاف اپنے زمانۂ شباب میں شاہی باڈی گارڈ میں افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے سالہا سال تک نمایاں خدمات انجام دے چکا تھا، مگر اُس عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی جب کہ ملکی قانون کے مطابق اس کو اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونا چاہیئے تھا۔ وہ کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر مستعفی ہوگیا اس نے اپنی خاندانی جاگیر میں جو دار الخلافہ سے دُور دراز فاصلہ پر واقع تھی، مستقلاً سکونت اختیار کرلی۔ اور تاحیات کسی دوسری طرف کا رُخ نہ کیا۔ اس نے ایک غریب مگر شریف النسل حسین دوشیزہ سے شادی کی، اور پُورے اطمینان وسکونِ قلب کے ساتھ اپنی رفیقِ زندگی کی معیت میں دادِ عیش دینے لگا۔ لیکن تین سال کے بعد ہی اس کی زندگی میں پھر ایک انقلاب رونما ہوا۔ جس نے اس کے شیشۂ دل کو پاش پاش کردیا۔ یعنی اس کی چاہتی بیوی نے ایسے وقت میں اس سے دائمی مفارقت اختیار کی، جبکہ وہ اپنی عملداری میں دورہ پر گیا ہُوا تھا۔ اس سانحۂ ہوشربا و رُوح فرسا کی خبر پاکر وہ بعجلت اپنے مستقر پر واپس آیا۔ اور تقریباً ایک سال تک اپنی شریک حیات کی ابدی جُدائی کا ماتم کرتا رہا۔ اگر اُس کے ظلمتکدۂ غم میں الیکزی کے حسین معصوم لب برق پاشی نہ کرتے ہوتے، تو شاید وہ ہمیشہ کے لئے دُنیاوی زندگی سے دست کش ہو جاتا، اور یا تو اپنی جان جان آفریں کی سپرد کرکے یا کسی دور افتادہ جنگل کے ایک گوشہ میں اپنا مسکن بنا کر دُنیا کی ہنگامہ آرائیوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر الیکزی، مرنے والی کی تنہا یادگار الیکزی کی موجودگی اُس کے لئے حیات بخش ثابت ہُوئی، اور وہ ایک سال کے بعد بدستور سابق اپنے کاروبار کی نگرانی کرنے لگا۔

اُس نے ایک مرتفع ہموار میدان میں ایک عالیشان محل تعمیر کرایا، پارچہ بافی کا ایک بڑا کارخانہ جاری کیا۔ اور اپنی جائداد کی آمدنی کو بہترین طریقہ پر صرف کرنے لگا۔ جس کی وجہ سے بہت جلد اُس نے ایک ہوشیار منتظم اور دُور اندیش مدبّر کی حیثیت اختیار کرلی۔ اُس کے ہمسایہ جاگیردار پہلے سے زیادہ اُس کی قدرومنزلت کرنے لگے۔ اُس کی جفاکشی وکفایت شعاری ضرب المثل ہوگئی۔ اور اُس کے حسن اخلاق کے افسانوں کی صدائے بازگشت سے ملک گونج اُٹھا۔ عام طور پر

وہ ہر دلعزیز تھا۔ مگر صرف ایک شخص اس کا ہمسایہ جاگیر دار گریگوری ضرور ایسا تھا۔ جس کے ساتھ اس کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ اور جو اس کی روز افزوں ترقیٔ دولت و عزت کو رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

گریگوری ایک قدیم شریف روسی خاندان سے تھا۔ وہ برسوں انگلستان و فرانس کے حسن کدوں میں ایک ہیرو کا پارٹ ادا کرتا رہا تھا۔ اور اپنی خاندانی دولت کا بیشتر حصہ عیاشی و فضول خرچی کی نذر کر چکا تھا۔ اس کی شریکِ زندگی اس کے اس طرزِ عمل سے ہمیشہ نالاں رہی اُس کو راہ راست پر لانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی مگر بیکار ثابت ہوئی۔ لیکن بیوی کے انتقال کے بعد یکایک اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اور وہ اپنی تمام بداعمالیوں سے تائب ہوکر خانہ نشین ہوگیا۔ تاہم فضول خرچی کی عادت جو اس کی طبیعت ثانی بن چکی تھی۔ اب بھی بدستور باقی رہی۔ لیکن اب اس کا اسراف ایک دوسری قسم کا تھا۔

اُس نے فرانسیسی وضع پر ایک عالیشان محل تعمیر کرایا۔ اور ایک خوشنما باغ لگایا۔ اپنی لختِ جگر لیزا کے لئے ایک فرانسیسی اُستانی کی خدمات حاصل کیں، خادموں کے واسطے فرانسیسی وضع کی وردیاں تیار کرائیں، حتیٰ کہ اپنے کھیتوں کو بھی فرانسیسی طرز پر جوتنے اور بونے کا سامان مہیا کیا۔ غرض فرانسیسی طرز و وضع کا وہ اسقدر دلدادہ تھا کہ ہر بات میں اس کی تقلید کرتا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھا۔ کہ غیر ملکی طرزِ معاشرت کسی کے لئے طرۂ امتیاز نہیں ہوسکتا۔ اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ فرانسیسی طرزِ کاشت روسی فصلوں کے لئے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ " ہر ملکے و ہر رسمے " کی اصلیت سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ یہی وجہ تھی، کہ کفایت شعاری و جزرسی پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اس کی مالی حالت درست نہ ہوئی۔ بلکہ دن بدن تنزل پذیر ہوتی گئی۔ اس کے بہی خواہ اس کے ان افعال پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ جن میں برستاف سب سے پیش پیش رہتا اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔

برستاف کے یہاں جب کوئی مہمان یا دوست آتا، اور دوران گفتگو میں وہ اس کی کفایت شعاری اور اس کے حسن انتظام کی تعریف کرتا، تو وہ مسکرا کر طنزاً جواب دیتا " افسوس! میں ایسا کفایت شعار اور منتظم نہیں ہوں۔ جیسا میرا باعزت ہمسایہ مسٹر گریگوری ہے" اور پھر متانت کے ساتھ دلسوزی کے لہجہ میں کہتا۔ " افسوس! کہ غیر ملکی طرزِ معاشرت کی کورانہ تقلید کرکے ہم اپنی دولت و عزت کو برباد کرتے ہیں۔ اور اپنی ملکی و قومی روایات وخصوصیات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

جو ہمارے حق میں ہر طرح مفید ہیں۔"

غرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اعتراضات مہمانوں اور ملاقاتیوں کے ذریعہ سے ہمیشہ گریگوری کے گوش گزار ہوتے رہتے تھے۔ اگرچہ برسٹاف کے ملامت آمیز اعتراضات محض اُس ہمدردی کی بناء پر تھے۔ جو ایک بہی خواہِ ملک و قوم کو اپنے ملک و قوم سے ہوتی ہے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ گریگوری غیر ملکی معاشرت کی تقلید سے دست کش ہو کر اپنے مُلک کے رسم و رواج پر عامل ہو۔ لیکن گریگوری کی طبیعت پر فرانسیسی وضع کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے وہ برسٹاف کی نکتہ چینی کو ہمیشہ اس کے۔ شک و حسد پر محمول کرتا رہا۔ اور اس کا دل کینہ و غضب کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

برسٹاف کے چراغ خانداں الیکزی نے ماسکو کی یونیورسٹی سے اعلےٰ تعلیم کی سند حاصل کی۔ اور اپنے گھر واپس آ گیا۔ وہ فوجی محکمہ میں ملازمت کرنا چاہتا تھا مگر برسٹاف نے اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر اسکو اجازت نہ دی۔ بلکہ فوجی محکمہ کے بجائے دوسرے مُلکی محکموں میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ لیکن اس پر وہ خود رضامند نہ ہُوا۔ چونکہ باپ بیٹے دونوں اپنی اپنی رائے پر قائم رہے۔ اس لئے الیکزی نے ایک غیر محدود زمانے کے لئے ایک شریف رئیس زادہ کی طرح زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور سر دست حصولِ ملازمت کا خیال اپنے دل سے دُور کر دیا۔

الیکزی ایک تنومند خوشرو نوجوان تھا۔ اگر اس کو فوجی یا کسی سول محکمہ میں کوئی عہدہ مل جاتا، تو ہر صورت میں وہ اپنے فرائض منصبی بوجہ احسن انجام دیکر نام آوری و عزت حاصل کر سکتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وہ فطرتاً آزاد منش اور دُنیا و مافیہا سے کچھ بے نیاز سا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برسٹاف نے اس کو فوجی محکمہ میں ملازمت کرنے سے باز رکھا تھا۔ کیونکہ اس محکمہ میں بہت زیادہ مستعدی اور جوش و خروش کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ الیکزی کی دلچسپی کا بہترین شغل صرف شکار تھا۔ اور اس فن میں اس کو کافی مہارت تھی۔

نوجوان لڑکیاں الیکزی کو حیرت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھتیں، بعض اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی بھی کوشش کرتیں، مگر ہمیشہ ناکام رہتیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ کسی کے دامِ محبت میں گرفتار ہے یا پھر فریب خوردۂ محبت ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کسی حسین سے حسین دوشیزہ کی طرف بھی نہیں دیکھتا۔

جن لوگوں کو دیہاتی زندگی بسر کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ وہ ان حسین دیہاتی لڑکیوں کی کرشمہ سازیوں کا تصور نہیں کر سکتے۔ کھلی ہوئی فضا اور صاف و لطیف ہوا میں ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اور وہ پُر فضا باغوں میں خوشبودار پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر صرف کتاب کے مطالعہ ہی سے زندگی کے ہر شعبہ میں پوری پوری واقفیت حاصل کر لیتی ہیں۔ تنہائی، آزادی اور مطالعہ کتب کی بدولت کمسنی ہی میں وہ ان انسانی جذبات سے آگاہ ہو جاتی ہیں جن سے شہری لڑکیاں عموماً نصف عمر تک بے خبر رہتی ہیں۔ صبح و شام میدانوں میں چہل قدمی کرنا، اور فطرت کے دلکش گوناگوں مناظر سے لطف اندوز ہونا ان کے لئے صرف صحت بخش ہی نہیں ہوتا بلکہ انکے احساسات قلبی کو برانگیختہ اور ان کی روحوں کو بالیدہ کرنے میں بھی ممد و معاون ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں، اُن کی بعض حرکتیں مضحکہ خیز خیال کی جاسکتی ہیں لیکن اُن سے اُن کی خلقی و حقیقی صفات پر کوئی حرف نہیں آسکتا، جن میں جوہر عصمت خاص طور پر قابلقدر ہے۔ اور جس کے بغیر ایک عورت "عورت" کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ شہری لڑکیوں کو دیہات سے بہتر تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ مگر شہر کی ہنگامہ خیز فضا میں ان کے عادات و اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔

ایلکزی کی بے التفاتی سے ان بدمستان شباب پر جو اثر پڑ سکتا تھا۔ اس کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ صرف وہی ایک ایسا شخص تھا جو ان کو افسردہ و اندوہگیں نظر آتا تھا۔ اس کی یہ بے حسی و بیگانگی اس جگہ جہاں ہر ذی رُوح ہستی بادۂ مسرت سے مخمور تھی بالکل ایک نئی بات تھی۔ ان لڑکیوں میں ایک ایسی بھی تھی۔ جس کا رجحان سب سے زیادہ ایلکزی کی طرف تھا۔ یہ گریگوری کی نورِ نظر لیزا تھی۔ اگرچہ خاندانی مناقشات و منافرت کی وجہ سے لیزا کو ایلکزی سے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مگر صرف اس کے حالات سُنکر وہ اس کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ تمام محفلوں اور مجمعوں میں عموماً موضوع سخن ایلکزی کی حالت پر نقد و نظر ہوتا تھا۔

شانزدہ سالہ حسین لیزا نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی، لاڈ اور پیار نے اس کو بیحد شوخ اور ضدی بنا دیا تھا۔ اُس کی فرانسیسی گورنیس ہمیشہ اس کی شرارت پر اس کو تنبیہ کرتی رہتی تھی۔ مگر اس کا باپ اس کی شوخیوں پر بہت مسرور ہوتا تھا۔ اس کی خاص خادمہ ناسٹیا بھی جو اس کی خلوت و جلوت کی شریک تھی، اُس کی

ہم عمر اور اسی کی طرح شوخ و شریر تھی۔ لیزا اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی رازدار اور شوخی و شرارت کرنے میں مددگار تھیں۔

ایک دن صبح کے وقت حسب معمول ناسٹیا لیزا کے بال بنا رہی تھی اور اس کی بزلہ سنجی سے لیزا مسرور تھی کہ ناسٹیا نے کہا:۔

"پیاری لیزا! کیا آپ آج مجھے باہر جانے کی اجازت دے سکتی ہیں؟"

"ضرور۔ مگر تم کہاں جاؤ گی؟"

"برسٹاف کے یہاں۔ الیکزی کے خاص خادم ایوان کی لڑکی کی آج سالگرہ ہے۔ مجھے اس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔ آقا تو ایکدوسرے کی صورت سے بیزار بلکہ خون کے پیاسے ہیں۔ اور خادموں میں رشتۂ مواخات و موانست قائم ہے!"

"اوہ! یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ میں تو صرف آپکی خادمہ ہوں۔ آپ کا اور نوجوان الیکزی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ بڑوں کو لڑنے دو۔ شاید انکو اسی میں کچھ مزہ ملتا ہو ہمیں اس سے کیا غرض۔"

"اچھا، لیکن تمہارا فرض یہ ہوگا کہ تم الیکزی سے ملو۔ اس کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرو۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کس وضع اور اخلاق کا آدمی ہے۔"

"بہتر ہے۔"

لیزا دن بھر ناسٹیا کی واپسی کا بے صبری سے انتظار کرتی اور الیکزی کے متعلق خیال آرائیوں میں مصروف رہی۔ قریب شام ناسٹیا واپس آئی اور لیزا کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اُس نے کہا۔

"میں نے نوجوان الیکزی کو اچھی طرح دیکھا۔ اُس سے گفتگو کی، اور دن بھر وہ ہمارے ساتھ رہا۔"

لیزا حیرت زدہ سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کیونکہ الیکزی کے متعلق جو روایات مشہور تھیں، ان کے مقابلہ میں ناسٹیا کا یہ کہنا کہ "وہ دن بھر ہمارے ساتھ رہا" ضرور حیرت افزا تھا۔ آخر لیزا نے بیتابانہ انداز سے دریافت کیا۔

"ناسٹیا! کیا تیرے ہوش و حواس درست ہیں؟ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ الیکزی تجھ سے گفتگو کرے، اور دن بھر تیرے ساتھ رہے؟ ذرا تفصیل سے حالات بتا تاکہ تیرا جھوٹ سچ ظاہر ہو۔"

"بہت اچھا۔ سُنئے۔ میں، انیسیا، نیلا، اور دو تین لڑکیاں ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہوئیں۔ ہم ٹھیک وقت پر وہاں پہنچے۔ کھانے کا کمرہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی دسترخوان بچھایا گیا،

انواع و اقسام کے کھانے چُننے گئے۔ اور سب نے مزے لے لے کر کھانا شروع کیا۔ کھانا کھانے کے دوران میں ہنسی مذاق اور لطائف و ظرائف کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ اور ــــ"

لیزا نے جو بہت بے صبر معلوم ہو رہی تھی قطع کلام کرتے ہوئے کہا:۔

"ناسٹیا! خدا کی پناہ! تیری تفصیل تو تکلف معلوم ہوتی ہے۔"

"آخر آپ اس قدر بے صبر کیوں ہیں۔ سُنئے تو سہی میزبان نے سیرچشمی و کشادہ دلی سے مہمانوں کی شکم نوازی کا انتظام کیا تھا۔ ہم نے بھی مزے لے لے کر کھایا۔ پورے ایک گھنٹہ کے بعد ہم نے دستر خوان سے ہاتھ کھینچا۔ اور ہم چند ہم عمر لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے باغ میں چلی گئیں۔ الیکزی بھی ہمارے پیچھے پیچھے باغ میں آگیا۔ اور ہمارے ساتھ کھیل میں شریک ہوا۔"

"ناسٹیا! کیا بیہودہ بک رہی ہے؟"

"خطا معاف! میں تو سچ ہی عرض کر رہی ہوں۔"

"اچھا، یہ تو بتاؤ کیا الیکزی واقعی ایسا ہی حسین ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے؟"

"یقیناً وہ حسین ہے۔ بیضاوی چہرہ، بلند و بالا کشادہ سینہ، مضبوط جسم، غرض مردانہ حسن کی تمام شانیں اس میں موجود ہیں۔"

"لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ کسی کے دامِ محبّت میں گرفتار ہے اور ہمہ وقت افسردہ و اندوہگیں رہتا ہے؟"

"میں نے تو کوئی بات ایسی نہیں دیکھی۔ مجھے تو وہ خوش و خرم ہی نظر آیا۔ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ ایسا شوخ، خوش مزاج اور ظریف نوجوان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔"

"تعجب ہے۔ آہ! ناسٹیا! میں اس کو دیکھنے کی کسقدر مشتاق ہوں!"

"پیاری ملکہ! یہ کونسی بڑی بات ہے۔ ٹوگیلو یہاں سے کچھ دُور نہیں۔ صرف چند فرلانگ کا فاصلہ ہے کسی دن ٹہلتے ہوئے یا گھوڑے پر سوار ہو کر اُس طرف چلی جائیے، آپ اس کو دیکھ لینگی۔ وہ روزانہ علی الصبح شکار کے لئے سوار ہوتا ہے۔"

"نہیں ناسٹیا! ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھے گا، کہ دوسری لڑکیوں کی طرح میں بھی اس کا تعاقب کر رہی ہوں۔ علاوہ ازیں ہمارے خاندانی تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ لیکن مجھے اس کے دیکھنے کی ضرور آرزو ہے۔ اور میں ایک بار ضرور اُس سے ملونگی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔"

"آپ کس طرح اپنی آرزو کو پُوری کرینگی؟"

"ایک عجیب و غریب طریقہ سے۔ میں کسی دن

ایک دہقانی دوشیزہ کا لباس پہنکر ڈگیلو کی طرف جاؤں گی اوراس کے دیدار کی تمنّا پوری کروں گی۔ اگراس سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ تو میں اس کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دونگی مجھے دہقانی لب ولہجہ میں بات چیت کرنے کا کافی ملکہ ہے۔"

ناسٹیا نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور اس تدبیر پر عمل کرنے کی تاکید کی۔

دوسرے دن صبح لیزا نے ناسٹیا کی وساطت و امداد سے موٹے کپڑے کی دہقانی پوشاک مہیا کی۔ اور اُس کو پہنکر قد آدم آئینہ کے مقابل ہو کر اپنے خط وخال کا جائزہ لیا۔ اس کو خود معترف ہونا پڑا کہ وہ اس سادہ لباس میں پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ پھراس نے اپنا پارٹ ادا کرنا شروع کیا۔ ناسٹیا کو مخاطب کرکے ٹھیٹ دہقانی لہجہ میں بات چیت کی۔ دہقانی انداز خرام سے اِدھر اُدھر کمرہ میں ٹہلی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ناسٹیا اور خود اس کو اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ وہ اپنا پارٹ بحسن وخوبی انجام دے سکے گی۔ لیکن برہنہ پا ہوکر جب وہ صحن میں گئی، تو اسکے نرم ونازک تلووں میں ایک تکلیف محسوس ہوئی۔ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے تلووں میں چبھ گئے۔ ناسٹیا نے فوراً اس کی تلافی کی صورت نکالی اور بازار سے ایک دہقانی وضع کا جوتہ منگالیا۔

دوسرے دن خلاف معمول سورج نکلنے سے پہلے لیزا بیدار ہوئی، لباس تبدیل کیا اور ناسٹیا سے کچھ سرگوشیاں کرکے باغ کے پشت کے دروازہ سے باہر نکل گئی۔ گھر بھر سوتا رہا۔ اوراُس کے جانے کا حال کسی کو معلوم نہ ہوا۔

مشرق میں آفتاب ضیا بار کے طلوع ہونے کے آثار نمایاں تھے۔ ابر کے سفید وسنہرے ٹکڑے مہر جہانتاب کی آمد کے اس طرح منتظر تھے، جس طرح درباری بادشاہ کے قصر شاہی سے برآمد ہونے کے انتظار میں کمربستہ کھڑے رہتے ہیں۔ صبح کے روشن وپُرسکون منظر، نسیم سحر کے خوشگوار وروح پرور جھونکوں اور سحر خیز پرندوں کے دلکش نغموں نے حسن مجسم لیزا کے دل میں نئی اُمنگ اور نیا جوش پیدا کر دیا۔ ایک اجنبی شخص سے ملنے کا خوف جو قدم قدم پر اُس کا سدِ راہ ہو رہا تھا۔ اس کے دل سے دور ہوگیا۔ اُس کے سُست قدموں میں خود بخود تیزی پیدا ہوگئی۔ اور وہ قریب قریب دوڑنے لگی۔ جس طرح غزالِ رعنا سبزہ زار میں چوکڑیاں بھرتا ہے لیکن اس جنگل کے نزدیک پہنچکر جو اس کے باپ اور برسٹاف کی جاگیروں کے درمیان حد فاصل تھا، اُس کی رفتار خود بخود سُست ہوگئی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ آہوئے دم خوردہ کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اُس نے جنگل کے اندر قدم رکھا۔ درختوں کی شاخوں نے سر جھکا کر اس کو سلام کیا۔ پتّوں نے جوشِ مسرت میں اس کی آمد پر نعرہائے شادمانی بلند کئے۔ اور نسیمِ سحر نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ اپنے خیالات میں مستغرق خراماں خراماں آگے بڑھی، اور اپنے دل میں کہنے لگی "کون کہہ سکتا ہے کہ ایک حسین و نازک اندام دوشیزہ، موسمِ بہار کی کیف انگیز صبح کو جنگل کی خاموش و تنہا فضا میں کسی کے دیدار کی تمنّا دل میں لئے ہوئے اس طرح آوارہ ہو سکتی ہے؟"

یکایک ایک خوفناک شکاری کُتّا بھونکتا ہوا لیزا کی طرف دوڑا۔ وہ چونک پڑی اور خوفزدہ ہو کر چلّا اٹھی فوراً کسی نے کُتّے کو آواز دی۔ اور ایک لمحہ کے بعد ایک نوجوان شکاری جھاڑیوں کی آڑ سے برآمد ہوا۔ اُس نے لیزا کے سراپا پر ایک غائر نظر ڈالی۔ جو خوف کی وجہ سے رعشہ براندام تھی۔ اور کہنے لگا۔

"حسین لڑکی! تم خوف نہ کرو۔ میرا کُتّا کسی کو نہیں ستاتا۔"

لیزا نے کچھ خوف اور کچھ شرم آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

"جناب عالی! ممکن ہے آپ کا کُتّا کسی کو نہ ستاتا ہو، مگر دیکھئے وہ میری طرف کیسی غضبناک نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے تیور دیکھ کر میری تو رُوح فنا ہوئی جاتی ہے۔ آپ اس کو اپنے پاس بُلا لیجئے تاکہ مَیں اپنا راستہ لوں۔"

"اگر تم کو ایسا ہی خوف ہے تو میں تم کو تمہارے گھر تک پہنچا سکتا ہوں۔ کیا تم اس کو پسند کر سکتی ہو؟"

"جناب! آپ کو کون روک سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کا مختار ہے۔ شارعِ عام ہر ایک کے لئے کھُلا ہے۔"

الیکزی یہ برجستہ و بیباکانہ جواب سُن کر حیرت سے لیزا کی طرف دیکھنے لگا۔ اور چند لمحوں کے بعد اُس نے پوچھا:۔

"تم کون ہو اور کہاں رہتی ہو؟"

"مَیں وسیلی حدّاد کی لڑکی ہوں، اور پروشیا میں رہتی ہوں۔ اور آپ؟ مَیں خیال کرتی ہوں کہ جناب ٹوگیلو میں رہتے ہیں۔"

"ہاں مَیں نوجوان شہزادہ الیکزی کا ملازم ہوں۔"

لیزا مُسکرائی۔

الیکزی چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو ایک خادم کی حیثیت میں ظاہر کر کے لیزا کے ساتھ دوستانہ مراسم و تعلقات قائم کرنے کی طرح ڈالے، مگر لیزا اس کے فریب کو سمجھ گئی، اور کہنے لگی۔

"جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مَیں اتفاقاً

بیوقوف نہیں ہوں کہ ایک خادم و مخدوم میں تمیز نہ کر سکوں
میرے خیال میں تو آپ خود شہزادہ صاحب ہیں "
"تم کیوں ایسا سمجھتی ہو ؟"
یہ تو ایک معمولی بات ہے۔ کیا آقا اور ملازم
میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کیا آپ کا لباس ایک شریف
رئیس زادہ جیسا نہیں ہے ؟ کیا آپ کا انداز کلام یہ ظاہر
نہیں کر رہا کہ اپ ایک تعلیم یافتہ مہذب شریف زادہ
نہیں ؟ "
البکزی یہ مدلل جواب سُنکر مُسکرایا اور لیزا
کی طرف بڑھا۔ تاکہ اس کو گلے لگا کر اس کی پیشانی پر
بوسۂ محبت ثبت کرے۔ مگر لیزا اس کا مقصد سمجھ کر
پیچھے ہٹ گئی۔ اور متانت کے ساتھ کہنے لگی۔
"جناب والا! آپ اپنے رتبہ کو نہ بھُولئے۔
آپ شاہ ہیں مَیں گدا۔ کُجا آفتاب عالمتاب، کجا
ذرۂ بیمقدار!"
البکزی کا قدم جو آگے بڑھنے کے لئے اُٹھا تھا
رُک گیا۔ اُس نے پُوچھا۔
"آخر یہ عقلمندی کی باتیں تم کو کس نے سکھائیں؟
کیا ایک لوہار کی لڑکی جیسا تم نے اپنے آپ کو بتایا ہے
ایسی عقلمند اور سلیقہ شعار ہو سکتی ہے ؟ ہاں بتاؤ۔ اس
میں کیا راز ہے اور تم دراصل کون ہو ؟"

اب لیزا کو احساس ہُوا کہ وہ اپنی مصنوعی حیثیت
سے آگے بڑھ گئی ہے۔ اُس نے اپنے دہقانی لباس
پر نظر ڈالی اور اپنی حالت کو درست کرتے ہوئے جواب دیا
"جناب! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام دہقانی
لڑکیاں بیوقوف اور بدسلیقہ ہوتی ہیں ؟ اگر ایسا خیال
ہے۔ تو معاف کیجئے آپ غلطی پر ہیں اور آپ کو کافی تجربہ
نہیں ہے۔ ہم دہقانی لڑکیوں میں سے اکثر ایسی ہیں جنکو
وقتاً فوقتاً اپنے یہاں کے رئیسوں اور زمینداروں کے
یہاں جانا پڑتا ہے۔ اور اس طرح ہم وہاں کے آداب گفتگو
اور دوسری باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتی ہیں۔"
"اچھا تمہارا نام کیا ہے ؟"
"اکولینا"
"تو مَیں کسی دن تمہارے یہاں آؤنگا۔ کیا تم
مجھے اس کی اجازت دے سکتی ہو ؟"
"نہیں جناب! نہیں۔ خدا کے لئے آپ
ایسا نہ کیجئے گا۔ میرے غریب خانہ پر آپ کا تشریف لانا
اگر ایک طرف آپ کی شان کے منافی ہے تو دوسری
طرف میرے لئے بھی خطرہ سے خالی نہیں۔ خدا معلوم
دُنیا کیا خیال کرے۔"
"لیکن مَیں تم سے دوبارہ ملنے کا آرزومند ہوں"
"اوہ! تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ مَیں کسی دن پھر

اسی جگہ حاضر ہو سکتی ہوں۔"

"کب ؟"

"کل صبح اسی وقت یا پھر جب آپ پسند فرمائیں"

"شکریہ۔ پیاری اکولینا! شکریہ۔ میرے دل کی آرزو تھی کہ تمہارے نازک ہاتھوں کو بوسہ دیتا مگر۔ اچھا تو تم کل ضرور آؤ گی۔"

"ضرور"

"مجھے امید ہے کہ تم مجھے دھوکا نہ دو گی۔"

"ہرگز نہیں"

"اچھا تو قسم کھاؤ"

"جناب! آپ اسقدر کیوں بدگمان ہیں؟ ہم دیہاتی لڑکیاں کسی کو فریب دینے یا جھوٹ بولنے سے نفرت کرتی ہیں۔ آپ مطمئن رہئے۔ میں کل صبح اسی وقت حضور کے سلام کو حاضر ہونگی۔ آپ کے مزید اطمینان کے لئے قسم بھی کھا سکتی ہوں۔ کل جمعہ کا دن ہے۔ اور میں اسی مقدس دن کی قسم کھاتی ہوں۔"

دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہکر جدا ہو گئے۔

لیزا بعجلت تمام گھر کی طرف واپس ہوئی۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچکر جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ اور ناستیا کے سوالات کا اُلٹا سیدھا جواب دیکر فوراً نشستگاہ میں چلی گئی۔ کیونکہ ناشتہ کا وقت ہو چکا تھا۔ اور اسکا باپ اس کی آمد کا منتظر تھا۔

لیزا اس کے باپ اور اس کی گورنیس مس جیکسن تینوں نے ایک میز پر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ کھانے کے دوران میں گریگوری نے مس جیکسن کو مخاطب کر کے اصولِ صحت پر ایک مختصر خطبہ پڑھا۔ اور حفظانِ صحت کی کتابوں سے چند اقتباسات بیان کر کے بتایا۔ کہ علی الصبح بیدار ہونا اور کھلے ہوئے میدانوں میں چہل قدمی کرنا تندرستی کے لئے مفید اور عمر درازی کا سبب ہوتا ہے پھر لیزا کے آج خلاف معمول صبح سویرے اُٹھنے اور ہواخوری کے لئے باہر جانے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تعریف کی اور اس امر پر زور دیا۔ کہ وہ آج کی طرح روزانہ بلاناغہ چہل قدمی کے لئے باہر جایا کرے۔

لیزا بظاہر اپنے باپ کی گفتگو بغور سن رہی تھی مگر حقیقت میں ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ آج صبح کے پیش آمدہ واقعہ پر غور کر رہی تھی۔ اور الیکزی سے ملنے کے بعد جو اثر اس کے دل و دماغ پر ہوا تھا اس کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس نے اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے اس امر کو باور کرنے کی بیکار کوشش کی کہ الیکزی کے ساتھ اس کا طرزِ عمل اخلاقی حدود سے متجاوز نہ ہوا تھا۔ اور اُس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوا

تھا، جو موجب ملامت قرار دیا جاسکے، مگر اُس کے ضمیر نے اس کے خلاف فتویٰ دیا۔ اور کل صبح بازدید کا وعدہ یاد دلایا۔ اس وقت اس کو ایک قسم کی روحانی تکلیف سی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اپنے قول سے انحراف کرے اور الیکزی سے ملنے کے لئے نہ جائے۔ مگر یہ سوچ کر کہ اگر وہ معہودہ وقت پر مقررہ جگہ پر نہ پہنچ سکی تو بہت ممکن ہے کہ الیکزی اس کی تلاش میں گاؤں کا رُخ کرے۔ اور وسیلی حداد کی لڑکی اکولینا سے ملنے کے بعد جو دراصل ایک فربہ اندام اور کریہہ منظر لڑکی ہے اس کا راز فاش ہو جائے۔ اور اس کو ندامت و شرمساری کا مُنہ دیکھنا پڑے۔ اس خیال کے دل میں آتے ہی وہ کانپ اٹھی اور اُس نے وعدہ وفا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

مگر لیزا کے برخلاف الیکزی مسرت و شادمانی کے ایک بے پایاں سمندر میں غرق تھا۔ دن بھر وہ لیزا کے حسن کی سادگی و شوخی اور اس کی شستہ و برجستہ گفتگو پر غور کرتا رہا۔ رات کو بھی عالمِ خواب میں وہ اسی کے دلکش خواب دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کوئی نہ کوئی مسرت ناک خواب دیکھ کر چونک پڑتا اور آنکھیں مل کر کمرہ میں چاروں طرف بغور دیکھنے لگتا۔ تمام رات وہ تقریباً بیدار رہا۔

صبح ہونے سے پہلے الیکزی اپنے بستر سے اٹھا لباس تبدیل کیا۔ بندوق سنبھالی اور اپنے وفادار کُتّے کو ساتھ لیکر حسب معمول شکار کے لئے گھر سے نکلا۔ آج اس کو ایسے غزالِ رعنا کو شکار کرنا تھا۔ جس کے تیر نظر سے وہ خود زخمی ہو چکا تھا۔ طرح طرح کے منصوبے دل میں باندھتا ہوا وہ مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ اور مصنوعی اکولینا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

اس کو انتظار کرتے کرتے آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ اور اس کا دل امید و یاس کا جولانگاہ بن گیا۔ یکایک خشک پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ سُنکر وہ ہوشیار ہوا۔ اور بیتابانہ اکولینا کے خیر مقدم کے لئے آگے بڑھا۔ جو خراماں خراماں اس کی طرف آرہی تھی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور فرطِ مسرت میں اس کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ صرف اس کی تشکر آمیز نظریں جذباتِ دل کی ترجمانی کر سکیں۔

لیزا کا چہرہ خلاف توقع اُترا ہوا تھا۔ اس پر افسردگی و پژمردگی کے آثار طاری تھے۔ الیکزی اس کی صورت دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ آخر اس نے اس کی افسردگی و دلگرفتگی کا سبب معلوم کرنے پر اصرار کیا۔ جس کے جواب میں لیزا نے اس کو بتایا کہ وہ اس طرح اس سے ملنے کو اچھا خیال نہیں کرتی، نیز یہ کہ انکی ملاقات کا کوئی بہتر نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس لئے اُسنے صاف صاف

کہدیا کہ اگرچہ وہ آج حسب وعدہ اُس سے ملنے کے لئے آگئی ہے۔ مگر یہ ملاقات آخری ملاقات سمجھنی چاہیئے۔

لیزا کا لب و لہجہ ٹھیٹ دہقانی تھا۔ مگر اُس کے خیالات ایسے بلند تھے جو ایک ادنےٰ طبقہ کی سادہ دل لڑکی کے دماغ میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے الیکزی اس کی گفتگو سے بہت متاثر و متحیر ہُوا۔ اُسنے لیزا کو اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کی ترغیب دی اِس کو یقین دلایا کہ وہ صرف دوستانہ و مخلصانہ تعلقات قائم کرنے کا متمنی ہے۔ اور کبھی کوئی ایسی حرکت اس سے سرزد نہ ہوگی، جس کا انجام پریشانی و ندامت ہو سکے۔

آخرمیں اُس نے اس امر پر زور دیا کہ اگر وہ روزانہ اُس سے نہیں مل سکتی، تو کم ازکم ہفتہ میں ایک بار ہی سہی۔ الیکزی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ صداقت و محبت میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ اور درحقیقت اس وقت اس کا دل صداقت و صدق محبت سے لبریز تھا۔ لیزا کے دل پر اس کا بہت اثر ہُوا۔ اور وہ الیکزی کی مخلصانہ دعوتِ ملاقات کو رد کرنے کی جراٗت نہ کرسکی۔ اُسنے کہا۔

"میں صرف ایک شرط پر آپ کے ارشاد کی تعمیل کرسکتی ہوں۔ اگر آپ سختی سے اس شرط پر کاربند ہونے کیلئے آمادہ ہوں۔ یعنی مقررہ دن کے سوائے آپ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔ اور میری تلاش میں کبھی پرولشیا نہ آئیں۔ اگر آپ کو یہ شرط منظور ہو تو میں ہر ہفتہ جمعہ کے دن اسی جگہ حاضر ہُوا کرونگی۔"

الیکزی نے بصد تشکر و امتنان یہ شرط منظور کرلی۔ اور دونوں ایک دوسرے کی محبت کو اپنے اپنے دل میں لئے ہُوئے جدا ہو گئے۔

ناظرین! اگر آپ ان دونوں دلدادگانِ یکدگر کی ہر ملاقات اور ہر ملاقات کی گفتگو بیان کرنے کی مجھے اجازت دیں تو آپ کو معلوم ہو کہ کس طرح وہ دونوں ہر ملاقات کے بعد ایک دوسرے کے دامِ محبت میں گرفتار ہوتے چلے گئے۔ مگر یہ تفصیل اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوسکتی تاہم میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں اکثر ایسے بھی ہونگے جو اس قسم کی تفصیل کو پسند نہیں کرتے لہٰذا میں اس کو قلم انداز کرتا ہوں۔ صرف اسقدر لکھنا یقیناً کافی ہوگا کہ صرف دو ماہ کی قلیل مدت میں دونوں ایک دوسرے کے پرستار بن گئے۔ اور موجودہ صورت حال پر قانع و مطمئن ہو کر مستقبل کی فکر کو طاقِ نسیاں کی سپرد کر دیا۔

رشتۂ محبت کو استوار و مستحکم کرنے کا خیال اکثر ان کے دماغوں میں پیدا ہُوا۔ مگر وہ قصداً اس موضوع پر گفتگو کرنے سے گریز کرتے رہے۔ الیکزی باوجود دلدادۂ حسن و محبت ہونے کے ہنوز اپنی شخصیت اور

لیزا باکولینا کی حیثیت کو نظر انداز نہ کر سکا تھا اور لیزا اُس اختلاف کی بناء پر جو اس کے اور الیکزی کے والدین کے درمیان مدت سے تھا۔ تعلقات کو مضبوط بنانے کے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دے سکتی تھی۔

موسم بہار کی ایک روشن و خوشگوار صبح کو گریگوری شکار کے لئے روانہ ہوا نسیم سحر کے رُوح پرور جھونکوں اور مناظر فطرت کی کیف انگیزیوں نے اس کے دل میں ایک تازہ رُوح پھونک دی، اور سرسبز و شاداب کھیتوں سے گذرتا ہوا غیر ارادی طور پر جنگل کے نزدیک پہنچ گیا۔

یکایک اس کی نظر اپنے حریف ہمسایہ برسٹاف پر پڑی۔ جو ایک کی آڑ میں بیٹھا ہوا ایک خرگوش کو شکار کرنے کی تاک میں تھا۔ وہ برسٹاف کے اسقدر نزدیک پہنچ گیا تھا کہ اس کی نگاہ بچا کر وہاں سے واپس ہونا ناممکن تھا۔ برسٹاف کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ اب وہاں سے گریز کرنا اس کی بُزدلی کے مرادف تھا۔ مجبوراً وہ آگے بڑھا۔ برسٹاف اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور شریفانہ انداز سے اس کو سلام کیا۔ اُس نے بھی ظاہری طور پر سلام کا جواب دیا۔

ناگہاں خرگوش جھاڑی سے نکلا۔ برسٹاف کے شکاریوں نے شور مچایا اور شکاری کُتّے خرگوش کے پیچھے دوڑے۔ گریگوری کا گھوڑا اس شور و غل سے بھڑک اُٹھا۔ اور راکب پشت زین سے فرش زمین پر آ رہا۔ برسٹاف خرگوش کا تعاقب چھوڑ کر گریگوری کی طرف لپکا۔ اور سہارا دیکر اس کو زمین سے اُٹھایا۔ اس کی مزاج پُرسی کی۔ اور اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔

گریگوری برسٹاف کے اس غیر متوقع شریفانہ برتاؤ سے بہت متاثر ہوا۔ اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُس کے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ گھر پہنچکر گریگوری نے ناشتہ طلب کیا۔ اور دونوں حریفوں نے عمر بھر میں آج پہلی بار دوستانہ طریقہ پر ایک دسترخوان پر بیٹھ کر ناشتہ تناول کیا۔ پھر برسٹاف نے اپنی گاڑی میں سوار کر کے اس کو رُخصت کر دیا۔ اس طرح ان دونوں جاگیردار ہمسایوں میں جو مدت سے ایک دوسرے کے مخالف تھے، رشتۂ اخوت قائم ہو گیا۔

گریگوری جیسے ہی گھر پہنچا، لیزا اس کے خیر مقدم کے لئے دوڑی اور اپنے پیارے باپ کو پشت زین کے بجائے ایک اجنبی گاڑی میں سوار دیکھ کر اس کی وجہ دریافت کرنے لگی۔ گریگوری نے پُورا واقعہ بیان کیا۔ مگر لیزا کو یقین نہ آیا۔ وہ حیرت و تعجب کے ساتھ سوال پر سوال کرتی رہی۔ آخر بمشکل تمام گریگوری نے بیان کردہ واقعہ کا اس کو یقین دلایا۔ اُس کے حیرت و استعجاب و پریشانی

کی کوئی حد نہ رہی جب گریگوری نے کہا۔

"پیاری لیزا! کل صبح برسٹاف اور الیکزی ہمارے مہمان ہوں گے۔ تم کو چاہئے کہ ان کی خاطر و مدارات کا کافی انتظام کرو۔ کہ احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔"

"ابّا جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ برسٹاف کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے ہیں؟"

"بیشک۔ کیا تم کو ابھی تک یقین نہیں؟ خیر کل تم کو خود معلوم ہو جائیگا۔"

"تو ابّا جان! میں تو اُن کے سامنے نہ جاؤنگی۔"

"کیوں؟ آخر تم اسقدر کیوں شرماتی ہو؟ اگر تم ان کے روبرو نہ جاؤ گی تو وہ سمجھیں گے کہ ہمارے دلوں میں ہنوز ان کی طرف سے نفرت موجود ہے اور یہ بہت بُری بات ہوگی۔"

"جو کچھ بھی ہو مگر مَیں تو ان کے سامنے نہ جاؤنگی"

گریگوری نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا وہ جانتا تھا کہ لیزا فطرتاً ضدی واقع ہوئی ہے۔ اور یہ کہکر اس کو رخصت کر دیا۔ کہ وہ تنہائی میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر کل صبح اپنا ارادہ ظاہر کرے۔

لیزا باپ سے رُخصت ہو کر اپنے کمرہ میں چلی گئی اور ناسٹیا کو بُلا کر تمام واقعات بیان کر کے مشورہ طلب کیا

وہ اس وقت عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ باپ کی ناخوشی کا تو اس کو کچھ زیادہ خیال نہ تھا۔ مگر فکر یہ تھی کہ جب الیکزی مصنوعی اکولینا کو گریگوری کے یہاں دیکھے گا تو خدا جانے وہ اپنے دل میں کیا خیال کرے۔ نیز اس کی یہ خواہش بھی تھی۔ کہ وہ الیکزی سے ملے۔ اور دیکھے کہ حقیقی لیزا کو دیکھ کر وہ کیا رائے قائم کرتا ہے۔ آخر ناسٹیا کے مشورہ سے اُس نے ایک نئی تدبیر پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کیا کہ الیکزی اس کو پہچان بھی نہ سکے، اور وہ اسکی خاطر و تواضع بھی کر سکے۔

دوسرے دن صبح کو گریگوری نے لیزا کو بُلایا اور دریافت کیا کہ اُس نے برسٹاف اور الیکزی کے خیر مقدم کے لئے کیا فیصلہ کیا ہے۔ جس کے جواب میں لیزا نے کہا۔

"ابّا جان! مَیں ان کا استقبال ضرور کروں گی۔ بشرطیکہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں خواہ کیسے ہی لباس میں اُن کے سامنے جاؤں اور کیسے ہی انداز سے ان سے گفتگو کروں۔ مگر آپ ناخوش نہ ہونگے۔ اور میری تبدیل شدہ ہیئت پر اظہارِ تعجب نہ کرینگے۔"

گریگوری جو لیزا کی نت نئی شوخیوں سے بخوبی واقف تھا مسکرایا۔ اور کہنے لگا۔

"کیا کوئی نئی شرارت سوجھی ہے؟ اچھا تم جو چاہو کرو۔ جس قسم کا لباس چاہو پہنو، جیسی صورت پسند ہو،

بتاؤ۔ مگر اتنا خیال رہے کہ مہمانوں کی دلشکنی کسی طرح نہ ہو۔"

"آپ اطمینان رکھئے، کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آئے گا۔"

دس بجے دن کے قریب برسٹاف اور الیکزی آئے۔ گرگوری نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اپنے عالیشان قصر اور پُر بہار باغ کی سیر کرائی۔ پھر تینوں نشستگاہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اور اپنے اپنے عہد شباب کے افسانے دہرانے لگے۔ الیکزی خاموش بیٹھا ہُوا ان دونوں سن رسیدہ تجربہ کار بزرگوں کی گفتگو سنتا رہا۔ مگر دراصل وہ اس وقت کچھ کھویا ہُوا سا تھا۔ اگرچہ اکولینا کی محبت اس کی رگ رگ میں جاری و ساری تھی، تاہم لیزا کے حسن و جمال کا شہرہ اس کے گوش گزار ہو چکا تھا، وہ اس کے دیکھنے کا بیحد مشتاق تھا۔ اور اس کی آمد کا منتظر۔ یکایک کمرہ کا دروازہ کھُلا۔ اور لیزا ایک نئی شان سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرہ پر پوڈر لگا ہُوا تھا جس کی وجہ سے اس کے فطری و حقیقی خط و خال چھپ گئے تھے۔ شاہانہ لباس زیب جسم تھا۔ مصنوعی سیاہ بال شانوں اور پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ گرگوری نے مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔ الیکزی نے اس کے سراپا پر ایک غلط انداز نظر ڈالی اور نہایت بے پروائی و خودداری کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی یہ بے پروائی لیزا کے حق

میں بہت مفید ثابت ہُوئی۔ کیونکہ اُس نے لیزا کو بغور دیکھنے اور اس سے ہمکلام ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس طرح لیزا اور اکولینا میں جو مشابہت تھی اُس پر ظاہر نہ ہُوئی۔

دوسرے دن صبح لیزا حسب معمول الیکزی سے ملی۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد اُس نے کہا۔

"آپ کل ہماری شہزادی کے مہمان ہوئے تھے؟"

"ہاں"

"یقیناً آپ ہماری شہزادی سے مل کر خوش ہُوئے ہونگے۔"

"بالکل نہیں"

"کیوں؟"

"اس کا جواب دینا تو مشکل ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔"

"آخر اس کی وجہ؟"

"وہ ایک بدوضع لڑکی ہے۔"

"بدوضع! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہماری شہزادی تو نہایت حسین و جمیل سلیقہ مند اور خوش اخلاق ہے۔"

"ہوگی۔ میری نظر میں تو دنیا بھر میں صرف تم حسین ہو۔"

لیزا نے مسکرا کر ایک انداز دلربائی کے ساتھ نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور گردن جھکالی۔ چند لمحوں تک الیگزی ہمہ تن چشم بنا ہوا اس کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل جذبات محبت سے لبریز تھا۔ اور وہ از خود رفتہ ہو رہا تھا۔ آخر لیزا نے قفل خموشی توڑا اور گھر جانے کے لئے الیگزی سے رخصت طلب کی۔ الیگزی ہنوز جواب نہ دینے پایا تھا کہ لیزا نے اس کی بے خودی کو مدنظر رکھ کر خدا حافظ کہا اور بعجلت تمام اس سے جدا ہو گئی۔ الیگزی دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

چند ماہ گزر گئے۔ ایک طرف الیگزی اور لیزا میں اور دوسری طرف برسٹاف اور گریگوری میں ربط ضبط بڑھتا گیا۔ اور رشتۂ محبت و اخوت استوار ہو گیا۔ لیزا نے ابھی تک الیگزی کو فریب میں مبتلا کر رکھا تھا اور اکولینا کے پردہ میں اس کے دل پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔

ایک دن برسٹاف اور گریگوری نے جبکہ وہ اپنے ماضی و حال اور مستقبل پر گفتگو کر رہے تھے یہ فیصلہ کیا کہ لیزا اور الیگزی کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے، تاکہ دونوں بقیہ زندگی اطمینان و سکون کیساتھ بسر کر سکیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ تجویز کی گئی کہ الیگزی کو لیزا سے ملنے اور تبادلہ خیالات کرنے کا موقع دیا جائے، تاکہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں۔ الیگزی اس دن کے سوا سے جبکہ وہ اپنے باپ کے ہمراہ گریگوری کا مہمان ہوا تھا۔ آجتک اس کے یہاں نہ آیا تھا۔

گھر پہنچکر برسٹاف نے بیٹے کو بلایا اور اس طرح سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"الیگزی اب میں ضعیف ہو چکا ہوں۔ خدا معلوم موت کا پیغام کب آجائے۔ زندگی کا اعتبار ہی کیا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میری زندگی میں تمہاری شادی ہو جائے اور تم جاگیر کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لو۔ تاکہ میں بقیہ زندگی اطمینان و سکون کے ساتھ یاد الٰہی میں بسر کروں"

"میرا ارادہ تو ابھی شادی کرنے کا نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے۔ خدا کے فضل سے تمہاری عمر شادی کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ میں نے تمہارے لئے ایک حسین عالی خاندان دوشیزہ تلاش کی ہے اور مجھے امید ہے کہ تم بھی میرے انتخاب کو پسند کرو گے۔"

"وہ کون ہے؟"

"لیزا جو حسین ہونے کے علاوہ ایک بڑی جاگیر کی تنہا مالک ہے۔ اور ہر طرح تمہاری شریک زندگی بننے کے لائق ہے۔"

"مگر مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے میں اس کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔"

"ہاں ابھی تمہارے دل میں اس کی جگہ نہیں ہے۔ تم نے صرف ایک بار اس کو دیکھا ہے لیکن جب تم اس سے ملو گے تو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اس سے محبت کرنے لگو گے۔ وہ بہت ہی خوش اخلاق، شیریں زبان اور دلفریب لڑکی ہے۔"

"شاید ایسا ہو۔ مگر میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

"نہیں تم کو شادی کرنا چاہیئے، اور میری رائے کے مطابق کرنی چاہیئے۔ کیا تم میری حکم عدولی کرو گے؟"

ابا جان! اس میں حکم عدولی کی کونسی بات ہے آپ جو حکم دیں میں بسر و چشم اس کی بجا آوری کے لئے آمادہ ہوں لیکن لیزا کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔"

برسٹاف یہ جواب سنکر غضبناک ہو کر بولا۔

"جاؤ میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ تین دن کی مہلت دیتا ہوں، اچھی طرح سوچ سمجھ کر مجھے جواب دو۔ کہ تم میری رائے پر عمل کرو گے یا نہیں؟ یاد رکھنا کہ اگر تم اپنی ضد پر قائم رہے اور میری آرزو کو مجروح کیا، نیز میری رائے سے انحراف جائز رکھا، تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔ میں تم کو محروم الارث کر دونگا۔ اور اپنی تمام جائداد خیراتی کاموں کے لئے وقف کر دونگا۔"

الیکزی اپنے باپ کی افتاد طبع سے اچھی طرح واقف تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے ارادہ اور فیصلہ کو تبدیل نہ کر سکتی تھی۔ اکولینا کی محبت اس کے دل میں جگہ کر چکی تھی۔ وہ اس فکر میں تھا کہ کسی مناسب موقع پر اپنے باپ کی رضامندی حاصل کر کے اس سے شادی کر لے لیکن اب اس کو اپنی تمام امیدوں پر پانی پھرتا ہوا نظر آیا۔ اور وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

دو دن برابر وہ اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ خواہ انجام کچھ ہو، اس کو لیزا سے ملکر تمام واقعات اس کے گوش گزار کر دینے چاہئیں۔ اور صاف الفاظ میں کہدینا چاہیئے۔ کہ وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، تاکہ جب اس کو تمام باتیں معلوم ہو جائینگی، تو وہ اپنے باپ کی تحریک کی مخالفت خود کریگی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ سیدھا گریگوری کے گھر پہنچا۔ دربان سے معلوم ہوا کہ وہ علی الصبح برسٹاف سے ملنے کے لئے چلا گیا تھا۔ البتہ لیزا گھر میں موجود تھی۔

لیزا کا کمرہ معلوم کر کے الیکزی بغیر اطلاع و اجازت، آگے بڑھا۔ اور دروازہ کھول کر بلا تکلف اندر داخل ہو گیا۔ اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے کمرہ میں لیزا کی جگہ اکولینا کو بیٹھے ہوئے ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف پایا۔

الیگزی یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اس کی نگاہ غلطی تو نہیں کر رہی اکولینا اکولینا کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ لیزا جو ہمہ تن کتاب کے مطالعہ میں مستغرق تھی اور کمرہ کے دروازہ کھلنے اور الیگزی کے اندر داخل ہونے کی اس کو خبر بھی نہ ہوئی تھی، اکولینا کا نام سنکر گھبرا کر کھڑی ہوگئی، اور چاہتی تھی کہ کمرہ سے باہر نکل جائے، اگر الیگزی نے اسکا راستہ روک لیا، اور اس کے ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

"اکولینا! تم یہاں کہاں؟"

یکایک کمرہ کا دروازہ کھلا، برسٹاف اور گریگوری اندر داخل ہوئے۔ الیگزی اور لیزا کو اس حالت میں دیکھ کر ان کو حیرت ہوئی، اور بے ساختہ دونوں کی زبان سے نکلا۔

"اخاہ! ہم کو کیا خبر تھی کہ تم دونوں پہلے ہی سب معاملہ طے کر چکے ہو!!"

(ماخوذ)

راز چاند پوری

غزل

جو تری بزم سے آتا ہے نہال آتا ہے
دیکھ دل تھام کے یہ کون نڈھال آتا ہے

رنج مٹ جاتا ہے جب یاد تری آتی ہے
دل بہل جاتا ہے جب تیرا خیال آتا ہے

خاصکر مجھ سے مخاطب ہے اجازت کی نظر
لب پہ رہ رہ کے مرے حرفِ سوال آتا ہے

دل کی دنیا ہے مری خرمنِ نسرین و سمن
کہ تصور میں وہ گلزار جمال آتا ہے

ناصحا تیری نصیحت پہ عمل کون کرے
یہ وہ باتیں ہیں جنہیں سن کے ملال آتا ہے

ہائے وہ شام کہ ناکام فراق آتی ہے
ہائے وہ روز کہ شادابِ وصال آتا ہے

بے کمالی میں ہوں استاد زمانے کا ظہیر
مجھ کو آتا ہے اگر تو یہ کمال آتا ہے

ظہیر

ایک مزدور کی آواز

ہمارے زمانے کی جمہوریت پسندی کے اقتضا کے مطابق شاعری کا عام رجحان شخصی جذبات و حسیات کے اظہار کے علاوہ عوام کے مختلف طبقوں کے اظہارِ خیال کی طرف بھی ہوا ہے۔ مغرب، خصوصاً امریکہ اور انگلستان کی شاعری میں یہ رجحان نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے جمہور کی نیم بیداری کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ہندوستان کی شاعری پر ہونا چاہیئے تھا۔ اور ہوا ہے مگر بہت کم۔ بہرحال اُردو کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لحاظ سے اگر میں فاخر صاحب کی اس نظم کو اُردو کے دورِ حاضر کی نئی چیزوں میں شمار کروں۔ . . . .

. . . . تو یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہوگا۔ ایڈیٹر

(۱)

پیسے کی شیخی پر دُنیا یہ رنگ اور روپ بدلتی ہے
پیسے سے نہریں جاری ہیں پیسے سے گاڑی چلتی ہے

(۲)

پیسے سے دنیاداریاں ہیں مذہب بھی ہے ایمان بھی ہے
پیسا ہے اگر تو حج بھی ہے اور گنگا کا اشنان بھی ہے

(۳)

دُنیا کی عزت ہے پیسا یہ رونق ہے بازاروں کی
ہے پیسا پاس تو چاندی ہے چاندی سرمایہ داروں کی

(۴)

سب نعمتیں اچھی سے اچھی — ہیں ان کے دستر خوانوں پر
پڑتا ہے ہاتھ امیروں کا — ہر وقت مرغن کھانوں پر

(۵)

ہم ان کے جھوٹے ٹکڑوں سے — یہ پیٹ کا دوزخ بھرتے ہیں
اور اکثر یہ بھی نہیں ملتے — فاقوں پر فاقے کرتے ہیں

(۶)

ہر روز یہاں اِک فاقہ ہے — ہر رات وہاں دیوالی ہے
گو شہر میں لاکھ چراغاں ہو — مزدور کی دُنیا کالی ہے

(۷)

مزدور کی دُنیا پیٹ اِس کا — گُزران ہے کھانے پینے پر
کیا یہ بھی کوئی جینا ہے — لعنت ہے ایسے جینے پر

(۸)

دُنیا ہے امیروں کی دُنیا — مزدور کی دُنیا فانی ہے
ہے اُن کا پسینہ بھی عنبر — اور اس کا لہو بھی پانی ہے

(۹)

لیٹے ہیں نرم گدیلوں پر — دولت والے ایوانوں میں
اور چیتھڑے لٹکائے مفلس — پھرتے ہیں مسافر خانوں میں

(۱۰)

کٹتی ہیں امارت کی گھڑیاں — یا بنگلوں میں یا پارکوں میں
افلاس کا کوڑا کرکٹ سب — ہے ڈھیر پرانی بارکوں میں

(۱۱)

تقدیر پر آخر صبر کیا افلاس اور غم کے ماروں نے
دُنیا کو رل کر لُوٹ لیا کس نے؟ سرمایہ داروں نے

(۱۲)

ظاہر میں کچھ باطن میں کچھ بچنا ان دھوکہ بازوں سے
دیتے ہیں خُدا کو بھی رشوت یہ کافر لوگ نمازوں سے

(۱۳)

مزدور کی ہاؤ ہُو پہنچی جب مغرب کے ایوانوں میں
تو اِک ہل چل سی ہُوئی پیدا سب اصلاحی دیوانوں میں

(۱۴)

قانون مرتّب ہونے لگے آزادی کا دربار ہُوا
تدبیر کے گارے چُونے سے تہذیب کا گھر تیار ہُوا

(۱۵)

لیکن سرمائے سے ابتک آزادی کا دم ناک میں ہے
یعنی جمہور کے پردے میں اِنساں اِنسان کی تاک میں ہے

(۱۶)

آزادیِ رائے کیا معنی منصور بھی ہے اور دار بھی ہے
ہے ابراہیمی خُون مگر نمرود بھی ہے اور نار بھی ہے

(۱۷)

کیا علم اُبھارے گا تجھ کو قسمت کا اگر تو ہیٹا ہے
مزدور کا بیٹا کچھ بھی ہو پھر بھی مزدور کا بیٹا ہے

فاخر ہریانوی

جذباتِ ہادی

ہو بھلا کیونکر زباں کو حوصلہ تقریر کا
زندگی میری ہے نقشہ عالم تصویر کا

رائیگاں ثابت ہوئی فرہاد کی ہر جدوجہد
اک پیامِ مرگ ہر قطرہ تھا جوئے شیر کا

ایک دنیا سے فراغت ہے وہی میرے لئے
لوگ کہتے ہیں جسے حلقہ مری زنجیر کا

خونِ دل ٹپکے نہ کیوں بن بن کے اشک انبساط
زخم نے مدت میں منہ دیکھا ہے اُن کے تیر کا

اعتبار جذب منزل کا اثر اتنا تو ہو
نقش پا پر بھی مجھے دھوکا ہے اک رہگیر کا

میرا ہر انداز ہے افسانۂ رنج فراق
میری خاموشی میں بھی اک لطف ہے تقریر کا

اعتبار کاوشِ دل کا الہی یہ اثر
ہر نظر پر اس کی دھوکا تھا مجھے اک تیر کا

اب تو ہے ہر اشک سے ظاہر شکستِ دل کا رنگ
اب تو ہے ہر آہ اک شکوہ مری تقدیر کا

رسم پابندی رہائی میں بھی کرتا ہوں ادا
خواب اکثر دیکھتا ہوں خانۂ زنجیر کا

بیخبر پہلے علاج سخت جانی ہے ضرور
دیکھ اے قاتل کہیں ٹوٹے نہ دم شمشیر کا

کون ہے میرے سوا دنیا میں ناکام حیات
غم مجھی کو دیدیا اوروں کی بھی تقدیر کا

کیا کوئی رکھیگا اس درجہ زباں بندی کی شرم
خواب میں بھی حوصلہ ہوتا نہیں تقریر کا

نیش و نوش زندگی دونوں ہیں اس کی آنکھ میں
ٹل رہے گا خیر جو کچھ ہے مری تقدیر کا

ہے مری افتادگی کی بھی عجب مشکل میں جان
دیکھتا رہتا ہوں منہ مڑ مڑ کے ہر رہگیر کا

غم نصیبی کے تقاضوں کا نتیجہ یہ ہوا
وہ بھی شکوہ کر اُٹھے آخر مری تقدیر کا

میں تو ہادی لے کے آیا تھا ازل سے عمر شمع
میرا جینا بھی ہے اک چکر مری تقدیر کا

ہادی مچھلی شہری

کروگے مارچ میں گر سیر وادیٔ کشمیر
چمن چمن گلِ تازہ بہار دیکھو گے

بہشت میں بھی نہ رضواں نے دیکھے ہونگے کبھی
شگوفے جتنے سرِ رہگزار دیکھو گے

بہت ہی خوب کہا راؔجی نے رستے میں
ہر ایک موڑ پہ اِک آبشار دیکھو گے

سمجھ میں آئیگی تشبیہ سرو و قدّ بتاں
وہاں جو سروِ لبِ جوئبار دیکھو گے

فیوضِ نشو و نما سے رگِ عصا میں بھی
نشانِ زندگیٔ شاخسار دیکھو گے

کمال دیکھو گے ہر شے میں کلکِ قدرت کا
طلسم کاریٔ نقش و نگار دیکھو گے

نشاطِ باغ میں دیکھو گے رنگ رنگ کے پھول
چمن طرازیٔ بادِ بہار دیکھو گے

مری تو خیر ہوا اسقدر ہے توبہ شکن
کہ شیخ شہر کو بھی مے گسار دیکھو گے

لگے جو میلہ تو بادام باغ میں جاکر
کسی کے حُسن پہ دِل کو نثار دیکھو گے

نہ ہو گی دیدۂ مشتاق کو کبھی سیری
کسی کو دیکھو گے اور بار بار دیکھو گے

کبھی کسی کے رُخِ لالہ گوں پہ ہوگی نظر
کبھی تم اپنا دلِ داغدار دیکھو گے

برغمِ حاصلِ یک عمر زہد و دینداری
فروغِ حسنِ رُخِ شعلہ بار دیکھو گے

گناہگار تو ہے میرؔ بھی ولے ہر بار
کئے پہ اپنے اُسے شرمسار دیکھو گے

میر ولی اللہ

سلہ یعنے مہتہ راجمید اس صاحب دت بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل ایبٹ آباد جو اس دفعہ سیر کشمیر میں میرے رفیقِ راہ تھے۔

غزل

(دورِ حاضر کے متغزلین میں حضرت جگرؔ کا رتبہ مسلّم ہے۔ ہزارداستان ان کی عنایات کی پہلی قسط حاصل کرنے پر اپنے آپ کو مبارکباد کے قابل سمجھتا ہے)

لے کے نکلا ہے مرا جوشِ لطافت مجھ کو
خوب پہچان لے آج اے مری صورت مجھ کو

منزلِ غم میں کہاں وقفۂ راحت مجھ کو
ہر نفس تازہ ہے درپیش قیامت مجھ کو

گر پڑی رُوح تعیُّن کدۂ ہستی میں
کاش ہوتا ہی نہ احساس محبت مجھ کو

بیخودی نے مری صدہا کئے منظر پیدا
وہ سمجھ بیٹھے تھے زندانیِ حیرت مجھ کو

لے لیا کام جو لینا تھا غمِ ہستی نے
گرچہ ثابت نہ ہوئی میری ضرورت مجھ کو

رندِ میخوار وہ ہوں میکدۂ ہستی میں
ہر خمِ موج ہے محرابِ عبادت مجھ کو

قلزم آشامیِ یک قطرۂ بیتاب تو دیکھ
گم کئے دیتی ہے میری ہی محبت مجھ کو

علم کے جہل سے بہتر ہے کہیں جہل کا علم
میرے دل نے یہ دیا درس بصیرت مجھ کو

فردِ عصیاں کو مری اے عرقِ شرم نہ دھو
اس سے ہوتا ہے کچھ اندازۂ رحمت مجھ کو

اُڑ چلا ہوں نگہِ یار سے شوخی لے کر
اب جو ممکن ہو تو روکے مری حیرت مجھ کو

عشق نے خدمت دشوار وہ کی ہے تفویض
خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت مجھ کو

گُل ویرانہ کو کیا اہلِ ہوس سے مطلب
ننگ ہے میری پریشانیِ نکہت مجھ کو

یوں تو ہونے کو جگرؔ اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغرؔ[1] سے ارادت مجھ کو

جگرؔ

[1] جناب اصغرؔ گونڈوی جن کے مجموعۂ کلام "سُرودِ نشاط" پر انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں تبصرہ ہوگا۔ ایڈیٹر

عہدِ اسلام میں ہندوستان کی علمی حالت

(ذیل کا تاریخی مضمون جو حکومتِ اسلامی کے ماتحت ہندوستان کی عہد بعہد علمی ترقیوں کا تبصرہ ہے۔ایک ہونہار نوجوان کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔امید ہے قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے) ایڈیٹر

مقدمہ۔ہندوستان میں مسلمانوں کے عالیشان جنگی کارناموں۔عدیم المثال سیاسی خدمات اور ملکی انقلابات کے دردانگیز واقعات اور عبرت خیز نتائج نے ہندوستان کے راحت پسند اور امن آشنا مورخوں کے متحیر دل ودماغ پر وہ اثر کیا جس نے انہیں علمی دُنیا کی درپردہ مگر غیر معمولی تبدیلی کی طرف ایک نظر بھی ڈالنے کی مہلت نہ دی۔اور اگر ع۔

"غم دُنیا سے کچھ پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی"

تو ہندوستان کی علمی سرگرمیوں کو دمشق۔قاہرہ۔مکہ شیراز۔سمرقند۔بغداد وغیرہ یونیورسٹیوں کی علمی خدمات کے مقابلہ میں ناقابلِ تذکرہ سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔لیکن اس پرآشوب زمانہ میں ایسے ہوشمند اور دُوررس مورخ بھی موجود تھے۔جنہوں نے سطحی حالات اور ظاہری نتائج کی بجائے روحانی فیوض اور معنوی اثرات کی تحقیق کو اپنا فرض منصبی تسلیم کرکے علمی عروج و ترقی کی صحیح تاریخ ترتیب دینے کی کوشش کی اور ہمارے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا۔انہوں نے اس پوشیدہ حقیقت کو آشکارا کیا۔کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں فاتحانہ داخلہ یہاں کی مدنی اور سیاسی زندگی میں انقلاب کا باعث ہونے کے علاوہ علمی دُنیا میں بھی بہت بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ہُوا۔

الناس علیٰ دین ملوکھم

ایک ایسی قوم کا جو صدیوں کی پُرانی تہذیب کی مالک تھی۔اور عروج وترقی کے بیشمار مدارج طے کر چکی تھی ہندوستان میں مستقل قیام اور پھر اس کا ملک بھر میں سیاسی اقتدار قدرتی طور پر مفتوح قوم کے پُرانے تمدن کے لئے غیر مفید ثابت ہُوا۔حکام اور حکومت کی تمام تر توجہ اسلامی علوم کی ترقی و ترویج کی طرف منعطف ہو گئی۔اور ملکی تعلیم کو انکی حوصلہ افزا سرپرستی سے محروم رہنا پڑا۔تھوڑے ہی عرصہ میں وید مقدس کے بھجنوں اور بدھ مذہب کے گیتوں کے دوش بدوش قرآن پاک کی آیات اور پیغمبر اسلام کی احادیث کا غلغلہ فضائے ہند میں گونجنے لگا۔درسگاہوں کے انہدام۔کتب خانوں کی بربادی ملکی تعلیم کے معلموں کے قتل وجلاوطنی کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ بعض مواقع پر ملکی تعلیم کو کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر فاتح قوم کے ہاتھوں عملی طور پر مٹنا پڑا۔مگر دماغی انقلاب

اور ایک نئی قوم کی پیدائش کے دن تھے، جبکہ پُرانے قانون کسی نئے نظام کے لئے جگہ چھوڑ رہے تھے۔ اس لئے ان ناگفتہ بہ حالات کے لئے مورد الزام انقلاب کے سوا اور کسی کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔

شخصی حکومتوں کے زمانہ میں جبکہ بادشاہ کا تنہا وجود ملکی کاروبار کے ہر شعبے کے لئے مرکز کلی کا حکم رکھتا تھا۔ بادشاہ کے مذاق میں ذرا سی تبدیلی اور اس کے خیالات میں خفیف سا انقلاب ملک بھر کی علمی زندگی میں خود بخود محسوس کیا جاتا تھا اور اس کے مطابق عوام کے مذاق میں تغیر پیدا ہو جاتا تھا۔ پس اگر کوئی بادشاہ علمدوست ہوتا تھا تو اس کا دربار علم کی زندگی میں تازہ روح پھونکنے والے اہل علم کا مسکن ہوتا تھا۔ اور امرا بھی اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی علمی تقلید کرتے تھے۔ برعکس اس کے اگر کوئی فرمانروا علم سے بیگانہ ہوتا تھا، تو اس کے دربار میں اہل علم کے لئے مایوسی اور علم کے لئے سوائے کس مپرسی کے اور کچھ نہ تھا۔ اسی امر کو مدنظر رکھ کر ہم یقین کرتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے ذاتی حالات اور انکی علمی معلومات اور خدمات سے صحیح واقفیت حاصل کر کے ہم اس زمانہ کی علمی زندگی کا درست اندازہ کر سکتے ہیں۔ پس اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے مسلمان فرمانروایان ہند کی ذاتی قابلیتوں، علمی خدمتوں اور علمی سرگرمیوں کے صحیح حالات انکے زمانے کی مستند سیاسی، علمی اور ادبی تاریخوں کے مسلمہ و مصدقہ واقعات کی مدد سے بہم پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

سلطان محمود غزنوی

اگرچہ حقیقت حال سے ناواقف لوگ سلطان محمود غزنوی کو محض بت شکن ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن غیر جانبدارانہ تحقیق حالات اسے ترقی علم کے لئے سرچشمۂ فیض اور اہل علم کا سرپرست ثابت کرتی ہے ہندوستان میں اس کے فرضی مظالم مثلاً مندروں اور بتکدوں کے انہدام۔ بتوں کے توڑنے، ہندوستانیوں کے بے رحمی سے قتل و غارت اور ملک میں عام ابتری و پریشانی کے پھیلانے کی داستانوں نے عام ہندوستانیوں کی ذہنیت کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ بے تعصب تحقیق کر سکیں۔ اور اس صاحب کمال بادشاہ کی فطرت کے اصلی جوہر کو بے نقاب کر سکیں۔ ہندوؤں کے نزدیک اس کی ذات ہر قسم کی برائیوں اور ستم شعاریوں کا مجموعہ تھی۔ حالانکہ جن علاقوں میں محمود نے بت خانے گرائے ہیں، وہاں پرانی وضع کے بتوں کی ابھی تک موجودگی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ کہ محمود نے صرف اُسی بتکدہ

کو گرایا ہے جس نے اس کے دشمنوں کو پناہ دے کر اس کے مقابلہ میں ایک مستحکم قلعے کا کام دیا۔ اور جو حملہ آور بھی محمود کی جگہ ہوتا وہ وہی کرتا جو اس عالیشان بادشاہ نے کیا تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ پتھر کے بتوں کے توڑنے سے کہیں زیادہ کوشش اس نے جہالت کے بتکدوں کے مسمار کرنے میں صرف کی ترقی علم کے لئے اس کی بخشش مستند اور بارش کی طرح تخصیص مقامی کی پابندیوں سے بالکل بے نیاز تھی۔ اور اس میدانِ علم میں وہ قومی اور ملکی تعصبوں سے بالکل آزاد تھا۔ جب محمود نے گوالیار کا محاصرہ کیا تو نندارائے والیِ گوالیار نے بہت سے تحفے ایک سو مست ہاتھی (بقول فرشتہ) بھیج کر صلح کی درخواست کی۔ جب محمود نے ہاتھیوں کی مستی سے آگاہی پائی، وہ بہت غضب میں آیا۔ لیکن ان تحفوں میں ایک قصیدہ نندارائے کا لکھا ہوا محمود کی شان میں نکل آیا۔ محمود کا تمام غصّہ رحمت سے بدل گیا۔ اس نے نندارائے کو پندرہ قلعوں کی سرداری جن میں جونپور بھی داخل تھا، بخش دی۔ نظم و نثر کی تاریخ میں یہ شاندار فتح بیمثال ہے۔ اور محمود کے تعصب سے پاک اور وسیع مذاق علمی پر دلالت کرتی ہے۔

بعض مورخ لکھتے ہیں۔ کہ محمود نے غیر مذاہب کے مقلدوں کی ہمت افزائی اور غیر علوم کی ترقی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ مگر راقم الحروف کی رائے میں والیِ گوالیار کا واقعہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے کوئی ذی ہوش اسے ماننے کو تیار نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ بات درست ہے۔ کہ محمود نے ہندوؤں کی تعلیم کے لئے کوئی مدرسے نہیں بنوائے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہندو محمود کو اپنے مذہب، ملک اور آزادی کا دشمن سمجھ کر اس سے نفرت کرتے تھے۔ اور اس سے کسی قسم کی مدد حاصل کرنیکو قومی غیرت اور خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ دوسری طرف محمود کو ہندوستان کی قلیل مدتِ قیام میں کوئی لمحہ امن کا نصیب نہیں ہوا۔ جس میں وہ ہندوستانیوں کے علمی مشاغل کی طرف رجوع کر سکتا۔ اور اسکا مرکزِ حکومت غزنی، ہندوستان سے بہت دور تھا۔ جہاں ہندو لوگ جو ان کی زبان سے بھی بالکل ناآشنا تھے۔ جانے کا خیال تک نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تمامتر کوششیں غزنی تک محدود رہیں۔ "تاریخ گزیدہ" بتاتی ہے کہ محمود ہر سال اہل علم اور شعرا کی مدد کے لئے ۴۰۰۰۰ دینار تقسیم کرتا تھا۔ محمود نے علم کی باقاعدہ ترقی کے لئے درسگاہوں اور مدرسوں کی بنیادیں رکھیں۔ اور ان کی مدد کے لئے سالانہ امدادی وظائف مقرر کئے۔ ایک بہت بڑی مسجد اور ایک درسگاہ غزنی میں ایسی بنوائی جس میں بہت بڑا

ذخیرۂ کتب طلبہ اور مدرسوں کے مطالعہ کے لئے رکھا۔ اس مدرسہ کی بنا کے لئے زرکثیر وقف کیا گیا۔ اور بروایت فرشتہ عنصری عہد کا سب سے بڑا فاضل اس درسگاہ کا معلم اعلیٰ مقرر ہوا۔

خدمتِ علم کے لئے اس قدر بخشیش ہونے لگیں کہ دور دور سے باکمال انسان اور بڑے بڑے فاضل غزنی کی طرف آنے شروع ہو گئے۔ اور تھوڑے عرصہ میں غزنی علاوہ سیاسی مرکز ہونے کے بہت بڑا علمی مرکز بن گیا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں اتنے عالم نہ تھے جتنے کہ محمود کے دربار میں جمع ہو گئے۔ تاریخ یمانی کے مصنف پر بہت نوازشیں ہوئیں۔ عزیزی رازی کو ایک دفعہ ۱۴۰۰۰ درہم ایک مدح پر انعام ملے۔ اسدی طوسی جس نے فردوسی کے بعد چار ہزار شعر شاہنامہ میں بادشاہ کی فرمائش پر بڑھائے بادشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ منوچہری اور عنصری پر بھی ہر وقت بخششوں کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔ فرخی اور عسجدی بھی دربار کے بڑے شاعروں سے تھے۔ بہت سے شاعر اور اہل علم کی باریابی عنصری کی سفارش سے ہوتی تھی۔ فردوسی جس کے ہاتھ سے دنیا ابھی تک فارغ نہیں ہو سکی۔ وہ دربار میں ایک نظم کی داد لینے آیا تھا لیکن یہاں عنصری کی سفارش سے درباری شاعروں میں داخل ہوا اور اسے شاہنامہ مکمل کرنے کی خدمت ملی۔ اور فی شعر ایک دینار کا وعدہ دیا گیا۔ لیکن جب فردوسی نے ساٹھ ہزار شعر تیار کر کے پیش کئے، تو بادشاہ نے مصاحبوں کے مشورہ سے ۶۰۰۰۰ درہم عطا کئے۔ فردوسی دل برداشتہ ہو کر واپس طوس چلا گیا۔ لیکن جب بادشاہ نے سفر سے آکر دیں شاہنامہ کے چند شعر سنے، تو فردوسی کی شاعری کی پوری داد دی۔ اور ۶۰۰۰۰ دینار اس کے وطن بھیج دئے، یہ تھا محمود کا ذوق علم جس کی بدولت اس نے غزنی کو تمام امصار و دیار میں ممتاز بنا دیا تھا۔

اگرچہ محمود کے جانشین مسعود میں باپ کی جوانمردی اور شجاعت کا جوہر اس درجہ باقی نہیں رہا تھا لیکن خدمت علم کا وہی مقدس جذبہ مسعود کے سینہ میں تھا۔ جس کا امانتدار اس کا باپ تھا۔ اس نے غزنی کی وہی شان قائم رکھی۔ اس کے دربار کا سب سے بڑا شاعر فلاسفر منجم انوریحاں خوارزمی تھا۔ جس کو علم نجوم پر ایک معقول بحث لکھنے پر ایک ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی انعام ملی۔ ابو محمد نے امام ابو حنیفہ کے عقائد پر ایک کتاب لکھی۔ جس پر بہت سا انعام پایا۔ مسعود نے حصولِ علم میں آسانی پیدا کرنے کے لئے بیشمار مدرسے اور مسجدیں بنوائیں۔ اور ان کی مدد کے لئے زرکثیر وقف کیا۔ صاحب روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ یہ اہل علم کی

صحبت کا بڑا اشتاق تھا۔ البیرونی کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں عربی، فارسی، سنسکرت اور یونانی کے پوشیدہ علمی خزانوں کی تلاش میں بڑی سرگرمی سے کام لیا جاتا تھا۔ اہلِ شوق ہر قسم کے علوم مثلاً ریاضی۔ نجوم۔ فلسفہ۔ حکمت۔ سائنس وغیرہ کے حصول میں مصروف تھے۔ غیر علوم کی کتابوں کے ترجمے فارسی اور عربی میں ہو رہے تھے اس عہد میں فنِ کتابت نے بہت ترقی کی۔ مسعود نے خود اپنے ہاتھ سے دو قلمی قرآن شریفوں کے نسخے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں تحفۃً بھیجے۔

مسعود کا جانشین بہرام باپ سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ اُس نے اپنی بخششوں سے علم میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ اس کے دربار کے اہلِ علم میں سے شیخ نظامی مصنّف مخزنِ اسرار اور سیّد حسن غزنوی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں سلطان بہت سی غیر زبانوں کے ترجمے فارسی میں کرائے۔ ان کتابوں میں کلیلہ دمنہ بھی تھی جسے اُس نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اور جس کا نام انوارِ سہیلی ہُوا۔

خاندانِ غور

اس خاندان کی ابتدا علم و ہنر کا اختتام اور اس دور کی صبح تعلیم و تعلم کی شام تھی۔ غزنی جیسا رشکِ فردوس شہر، علاؤالدین غوری کے زمانے سے متواتر تین دن تک بے پناہ آگ اور خون تشنہ تلوار کے رحم پر چھوڑ دیا گیا۔ عالیشان شاہی محل اور قومی عمارتیں گرد و غبار بنا دی گئیں امن کی جگہ فتنہ۔ رونق کی جگہ ویرانی اور آبادی کی جگہ بربادی نظر آنے لگی۔ تمام شہر میں سوائے محمود۔ مسعود اور ابراہیم کے تیروں۔ مضطرب مجروحوں اور مقتولوں کی لاشوں کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ اس پچاس سالہ بدنظمی کے زمانہ میں علم بالکل کس مپرسی کی حالت میں رہا۔ اور اہلِ علم بستیوں کو چھوڑ کر گمنامی کے گوشوں میں جا چھپے۔ پھر اس عہدِ تاریک کا ردِّ عمل شہاب الدین غوری کے عہد میں ہُوا۔ خاندانِ غور کا یہ بادشاہ ملک گیری اور ملک داری کے لحاظ سے محمود غزنوی سے بھی بڑھ چڑھ کر نکلا۔ اس نے پھر ترقیِ علم کی طرف رجوع کیا۔ مولانا حسن نظامی کی تحقیق ہے کہ غوری نے اجمیر میں بتکدہ مسمار کرا کر وہاں مدرسہ اور کالج بنوائے۔ اور اسلامی علوم کو رواج دینے کی کوشش کی۔ اس کی حقیقی اولاد نہ تھی۔ اور اس نے چند ترکی غلاموں کو اپنی زیرِ نگرانی تعلیم دلوائی۔ اور ان کی مناسب تربیت کی۔ ان کو شہزادوں کا لقب ملا۔ اور ان میں سے تاج الدین یلدیز کو غزنی۔ ناصر الدین کو ملتان و سندھ اور قطب الدین کو ہندوستان کی حکومت عطا ہُوئی۔ ان تینوں حاکموں نے اپنی ذاتی قابلیت و شجاعت اور حسنِ انتظام سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہوں نے

کسی اہل ذوق علم دوست اور صاحب بصیرت کی سرپرستی میں تربیت پائی تھی۔

خاندان غلاماں

شہاب الدین کے بعد ہندوستان کی قسمت اس کے جانشین قطب الدین کے رحم پر چھوڑ دی گئی۔ یہ سب سے پہلا مسلمان حکمران ہے جس نے افغانستان سے مرکز حکومت بدل کر دہلی میں قائم کیا۔ اس میں شک نہیں کہ محمود و محمد ہندوستان کے فاتح اور بادشاہ تھے لیکن ان کی ہندوستان میں آمد اور واپسی طوفان کے مدوجزر سے زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔ ان کے مدِنظر صرف اپنے وطن کی خوشحالی ہوتی تھی لیکن قطب الدین اور اس کے بعد کے حکمرانوں کو ہندوستان میں بسنا اور اتنے بڑے ملک میں امن و انتظام قائم کرنا تھا جو نسبتاً زیادہ توجہ اور مصروفیت کا محتاج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قدرتی طور پر علم و حکمت کی خدمت کے لئے اتنا وقت نہیں دے سکتے تھے۔ جتنا کہ ان کے پیشرو دے سکے۔

قطب الدین نے ابتدائے عمر میں عربی، فارسی اور سائنس کی تعلیم نیشاپور میں حاصل کی۔ اس کے عہد میں مذہبی پیشواؤں اور طلباء سے پُر بہار کی یونیورسٹی اور بنگال کے علمی دار الخلافہ ندیا کی یونیورسٹی کو سیاسی مصلحت اور ملکی ضرورتوں کا شکار ہونا پڑا۔ جس کی ذمہ دار حاکم و محکوم کی باہمی سب بے اعتمادیاں ہیں۔ قطب الدین کے جرنیل بختیار نے ندیا کے کھنڈرات پر کالج اور مسجدیں بنوائیں اس ابتدائی زمانہ میں یہاں کی مسجدیں یورپ کے ازمنۂ متوسط کے گرجوں کی طرح علاوہ عبادتگاہوں کے درسگاہیں بھی ہوتی تھیں۔

عہدِ التمش

امیر کوحانی جو چنگیز خاں کے ظلموں سے تنگ آکر ہندوستان میں پناہ لینے آیا تھا۔ اس نے قیام دہلی کے زمانہ میں بہت سی نظمیں لکھیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں بہت خوش تھا۔ علامہ ناصر الدین اور فخر الملک خلیفہ بغداد کا مشیر سلطنت جو بعد میں التمش کا وزیر مقرر ہوا، دونوں بادشاہ کے مصاحبانِ خاص میں سے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں دہلی اہلِ علم اور اربابِ کمال کا مسکن تھا۔ التمش نے ایک مدرسہ بنوایا۔ جسکو ایک سو سال کے بعد فیروز تغلق نے مرمت کروایا۔ اس نے اپنے بیٹے محمود کی تعلیم و تربیت کا فرض اچھی طرح انجام دیا۔ اپنی لڑکی رضیہ سلطانہ کو پوری تعلیم دی جس سے وہ حکومت کرنے کے قابل ہوسکی۔ اور مشرق و مغرب کی حکمران عورتوں کی صفِ اوّل میں کھڑی ہونے کے قابل ہوئی۔ بقول فرشتہ یہ قرآن اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا کہ عربی بخوبی جانتی تھی اہل علم کی ہمت افزائی کرتی تھی۔

انہیں مدد دیا کرتی تھی۔ اسکے عہد میں   کالج کا پتہ چلتا ہے۔
رضیہ کے بعد بہرام اور مسعود کی دو سالہ حکومت ہے جس میں علم نے کوئی خاص قابلِ ذکر ترقی نہیں کی۔ اس عہد میں سراج الطبقات ناصر بادشاہ کا منظورِ نظر اور ناصریہ کالج کا معلم اعلیٰ تھا۔

اس کے بعد ہندوستان کی حکومت ناصرالدین کے سپرد ہوئی اس کے عہد میں پھر علم و حکمت کا ستارہ اوج پر ہوا۔ یہ خود تمام عمر طالب علم رہا۔ اہلِ علم سے گفتگو کرنے کا بڑا مشتاق تھا۔ ان کی صحبت کو فیضِ روحانی کا سامان سمجھتا تھا۔ اس کی بست سالہ مدت حکومت اہلِ علم کی ہمت افزائی اور علم کی خدمت میں صرف ہوئی کتابت کا بہت شوق تھا۔ تمام عمر اسی فن کی آمدنی کو ذریعہ معاش بنایا۔ اور شاہی خزانہ کو خلق اللہ کا مال اور امانت سمجھا۔ اسکے ایک صدی بعد ابن بطوطہ نے اسکے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن قاضی کمال الدین کے پاس دیکھا۔ جس کو اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔ طبقات ناصریہ اس کے دربار میں لکھی گئی اس زمانہ میں علاوہ اور بہت سے مدرسوں کے جالندھر میں ایک بڑا مدرسہ تھا۔

ناصرالدین کے جانشین   کا دربار بھی عالموں اور فاضلوں کی جائے پناہ تھا۔ اسوقت چنگیز خاں خراسان میں قتل و غارت کا طوفان بپا کر رہا تھا۔ اور بڑے بڑے فاضل اور شہزادے دربارِ سلطان میں پناہ ڈھونڈنے کو آ رہے تھے۔ جہاں ان کی مدد کے لئے مناسب وظائف مقرر کئے گئے۔ سلطان کا بیٹا محمد بڑا علم دوست تھا۔ اس نے علمی مجلسوں اور بزموں کو رواج دیا۔ محمد امیر خسرو کا شاگرد تھا۔ اس نے تمام شاعروں کے دیوانوں سے شعر انتخاب کر کے ایک بیس ہزار اشعار کی بیاض تیار کی جو اپنے وقت تک لاثانی تھی۔ محمد نے ترقی علم میں بہت سرگرمی سے کوششیں کیں۔ دُور دُور سے اہلِ کمال کو اپنے دربار میں آنے کی دعوتیں دیں۔ شیخ سعدی شیرازی اور شیخ عثمانِ توران کو قاصد بھیجکر دربار میں بلایا لیکن وہ نہ آ سکے۔ محمد میدان جنگ میں بھی اہلِ علم کو اپنے ہمراہ رکھتا تھا چنانچہ جس جنگ میں وہ شہید ہوا وہیں امیر خسرو قید ہوئے اس سے محمد   اور اس وقت کی علمی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ محمد نے فتح بنگال کے بعد اہلِ علم کو بہت انعام دئے۔ اس کے دربار میں شیخ شکر گنج شیخ بہاؤالدین۔ شیخ بدرالدین۔ قطب الدین بختیار کاکی سید مولا وغیرہ اہلِ کمال موجود تھے۔ سید مولا نے ایک مدرسہ بنوایا۔ جس سے عوام کے مذاق علمی کا پتہ چلتا ہے۔

بلبن کے بعد حکومت   کے سپرد ہوئی جس نے دو سال کی قلیل مدت حکومت میں اپنے پیشروؤں کی سالہا سال کی محنتوں کو ضائع کر دیا۔ شراب نوشی اور شاہد بازی کا دور شروع ہوا علم کی ترقی بالکل رک گئی۔ تمام ملک پر عیش پرستی کا رنگ غالب آگیا۔ اہلِ علم تلاشِ روزگار اور مدد معاش کیلئے سرگرداں رہنے لگے۔

ملک انور لطیف

فطرت نگار سُدرشن کو پانچسو روپیہ انعام

گورنمنٹ پنجاب نے فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کتاب پر انہیں پانسو روپیہ انعام دیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب کیسی ہوگی، اور اس میں کیا ہوگا۔ مگر سچ کہا جائے، تو اُن کی ہر ایک کتاب اس قابل ہے کہ اُس پر کئی کئی ہزار روپیہ انعام دیا جائے۔ یہ کتاب مُصنّف نے ہندی میں لکھی تھی۔ اور اب احباب کے اصرار پر خود ہی اُسکا اُردو ترجمہ کرکے شائع کرا دیا ہے۔ اس اُردو کتاب کا نام **محبّت کا انتقام** ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ محبّت جب انتقام کی بھوکی ہو جاتی ہے، تو کیا کرتی ہے محبّت کا ایثار کئی مصنّفوں نے لکھا ہے۔ مگر محبّت کا انتقام لکھنا قدرت نے سُدرشن کے لئے اُٹھا رکھا تھا۔ اور اب وہ چیز تیار ہے۔ اگر آپ کو عورت کی فطرت اور محبّت کا فلسفہ نیز انسانی دل کی بلندیوں اور پستیوں کا علم حاصل کرنا ہو، تو محبّت کا انتقام دیکھئے۔ زبان پُر سحر۔ کاغذ چکنا۔ کتابت حسین۔ چھپائی پیاری۔ عورت، مرد، بچے، بُوڑھے سب کے کام کی چیز ہے۔ قیمت عہ

چندن } اِس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی پندرہ دلچسپ کہانیاں درج ہیں۔ ہر کہانی پڑھکر یہی خیال گزرتا ہے کہ اس سے اچھی کہانی مُصنّف بھی نہ لکھ سکیگا مگر ہر دوسری کہانی اس خیال کو رد کر دیتی ہے گورنمنٹ پنجاب نے **محبّت کا انتقام** پر انعام دیا ہے لیکن سُدرشن کی نگاہوں میں چندن کا درجہ اُس سے بہت بلند ہے۔ اور انہیں اس کتاب کے مُصنّف ہونے پر فخر ہے۔ دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے۔ قیمت (عہ) سُنہری ریشمی جلد دو روپے

بہارستان } فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ جس پر مُصنّف کو خود ناز ہے اور جسکے متعلق کئی دوستوں کی رائے ہے کہ یہ سُدرشن کا ماسٹر پیس ہے اگر آپ کو بہترین کہانیاں دیکھنا ہو تو بہارستان دیکھئے جسکے مقابلہ کی کتاب اُردو زبان میں آجتک شائع نہیں ہوئی بینظیر کہانیاں ہیں زبان صاف پلاٹ دلکش نتیجے دل میں اُتر جانیوالے۔ کاغذ خوبصورت کتابت نہایت حسین اور چھپائی پیاری دیباچہ منشی پریم چند صاحب نے لکھا ہے قیمت عہ سُنہری ریشمی جلد عہ

قوم پرست } یہ کتاب بنگال کے شہرہ آفاق ڈراماسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے کے ایک ناٹک کا ترجمہ ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ انسانی جذبات کا موجیں مارتا ہُوا سمندر دیکھنا ہو تو یہ کتاب پڑھئے۔ جو آپ کی آنکھوں سے زبردستی آنسو نچڑوائیگی۔ عہ

چُٹکلیاں } نئی طرز، نئی ادا، درختوں، پتھروں اور ندی نالوں کے سر من۔ چاند تاروں کے اور پھولوں پھلوں کے لذّت آشنا خیالات، ایک ایک مضمون میں مصنّف نے دِل نکالکر رکھ دیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ قیمت چار آنے ۔ ۔ ۔ (۴ر)

کُنجِ عافیت } یہ ناول غضب کا دلفریب ہے۔ جس میں ہندوستانی عورت کا بلند ترین چلن دکھا کر اُس کے ساتھ یُورپین عورت کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس ناول کو خود پڑھئے آپ ہندوستانی ہونے پر فخر کرنے لگینگے اپنی بیوی کو پڑھائیے۔ اُس کی زندگی اور بھی بلند ہو جائیگی۔ قیمت ۶ر

ناٹک ساگر

اس لاجواب کتاب میں ہندوستان چین جاپان سیلون افریقہ ایران عرب ٹرکی یونان اٹلی سپین پرتگال فرانس جرمن انگلستان سویڈن ناروے روس اور امریکہ کے مشاہیر ڈرامہ نگاروں اور ایکٹروں کی زندگی کے حالات ڈراموں پر نقد و نظر سٹیج کی حالت بنا کر فن ڈراما کے رموز آشکارا کئے گئے ہیں۔ باوجود تاریخی باتوں پر مشتمل ہونے کے کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ بغیر ختم کئے نہیں چھوڑ سکتے۔ اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کا کتب خانہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں آجکل ہندوستان بھر میں اسی کتاب کا چرچا ہے۔ ٹریبیون۔ زمیندار۔ سیاست۔ پرتاپ نے زبردست ریویو لکھے ہیں۔ طباعت۔ کتابت اور کاغذ نفیس حجم قریباً ..۵ صفحات۔ قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے بلاجلد عہ مجلد طلائی ہے۔

موجودہ لندن کے اسرار

اردو زبان میں کوئی کتاب موجود نہیں جو فلسفہ جرائم پر روشنی ڈالتی ہو۔ اس کتاب کی اشاعت نے بہت حد تک اس کمی کو پورا کیا ہے۔ لندن کی سنسنی پیدا کرنے والی وارداتوں کو سامنے رکھ کر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ جرائم کے حیرت انگیز طریقے صاف نظر آجاتے ہیں بن گھڑت قصہ کہانیوں کو ان حقیقی واقعات سے دور کی بھی نسبت نہیں ہو سکتی۔ مگر باوجود اس کے کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ناول بھی اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔ اگر آپ دنیا میں رہ کر کسی فریب کا شکار ہونا نہیں چاہتے، تو اس کتاب کو حرزِ جاں بنائیے اگر آپ تحقیقِ جرائم میں دلچسپی لیتے ہیں۔ تو ہر وقت اس کتاب کو اپنے سامنے رکھئے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ

مینیجر رسالہ نونہال چیمبرلین روڈ۔ لاہور

اُردو کا ماہانہ رسالہ شمع۔ آگرہ

جنوری ۱۹۲۵ء سے شمع نہایت آب وتاب سے شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ، غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ اور تاریخی سیاسی۔ اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ اعلےٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں۔ اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں۔ اور محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ اس میں کوئی ذاتی فایدہ شامل نہیں۔ اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم ۱۱۲ صفحہ قیمت سالانہ چھ روپے۔ نمونہ کا پرچہ ۱۰/

المشتہر: مینجر رسالہ شمع حسن منزل شاہ گنج آگرہ

آسمان نسائیت کا آفتاب درخشاں

یعنی

نورجہاں

افق صحافت سے طلوع ہو گیا

اور اس بدیع المثال زنانہ رسالہ کا نمونہ کا نمبر ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو گیا۔ جو دلچسپ نہایت پُر مغز اور مفید و دلآویز مضامین سے پُر ہے۔ جس میں زمانہ بھر کی نسوانی تحریکوں پر نظر ڈالنے کے علاوہ عورت کی زندگی کے مختلف علمی و عملی پہلوؤں پر نامور اہلِ قلم اصحاب نے لطیف روشنی ڈالی ہے۔ ارباب نظر نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس پایہ کا کوئی زنانہ رسالہ زبانِ اُردو میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوا۔ اس کا حجم ۸۰ صفحات ہے آپ ۹/ آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ طلب کیجئے۔ یا پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر سال بھر تک اس کا لطف اُٹھائیے۔

جنوری ۱۹۲۶ء میں رسالہ کا پہلا باقاعدہ نمبر شائع ہو گیا ہے۔ ۱۰۰/ اپنی درخواستیں مع زرچندہ بھیجئے۔ اور انعامات کے مقابلہ میں شامل ہو جائیے۔

مینجر نور جہاں امرتسر

درس حیات

مصنفہ محمد اکبر مراد پوری بی اے بی ٹی - یہ کتاب نوجوانوں کے لئے عموماً اور طلباء کے لئے خصوصاً نہایت ہی مفید ہے۔ اگر ایک ناکارہ محض اور سست الوجود نوجوان اسے ایک دفعہ پڑھ لے۔ تو یقین ہے کہ وہ زندگی کے اصلی مقصد کو ضرور سمجھ جائیگا۔ اس میں جگہ جگہ ہر مذہب ملت کے بزرگوں اور مشاہیر کے اسوۂ حسنہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح دُنیا کے بعض نامور اور لائق آدمی قعرِ گمنامی میں سے نکل کر بامِ عظمت پر پہنچے۔ مختلف عنوانوں کے ماتحت زندگی کے مختلف مدارج پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً مشکلات کا مقابلہ مصائب کے فوائد - کیرکٹر - خودداری - جدوجہد - کتب بینی وقت کا استعمال - خود ضبطی - دوستی - مطالعہ - اور بتایا گیا ہے۔ کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے آجکل کے نوجوان طلباء کس طرح اپنی زندگی کا اصلی مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ - کاغذ بڑھیا - ضخامت ۱۴۳ صفحات قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک۔ طلباء کے لئے از حد مفید ہے۔

مینیجر اُردو ہاؤس چیمبرلین روڈ لاہور سے طلب کریں

گراموفون!

آٹھ آنہ میں

کس طرح حاصل کر سکتے ہیں ؟

(۱) آپ مبلغ دو روپے آٹھ آنہ بذریعہ منی آرڈر بھیجکر اپنا نام درج رجسٹر کروالیں (۲) آپ کے روپے وصول ہوتے ہی ہم آپکو پانچ عدد ٹکٹ روانہ کردینگے۔ آپ ان میں سے چار عدد ٹکٹ آٹھ آٹھ آنہ میں اپنے چار دوستوں میں فروخت کردیں۔ اس سے ان چار ٹکٹوں کی قیمت آپ کو دو روپے وصول ہو جائیگی۔ (۳) آپ جس شخص کے ہاتھ ٹکٹ بیچیں اس سے کہیں، کہ وہ مبلغ دو روپے مع اس ٹکٹ کے جو اُس نے آپ سے ۸ر میں خریدا ہے ہمیں بذریعہ رجسٹری روانہ کردے (۴) آپ کے فروخت شدہ چاروں ٹکٹ اور آپ کے دوستوں کے روپے وصول ہوتے ہی آپکی خدمت میں نو گراموفون روانہ کر دیا جائیگا۔ اور آپکے ان چاروں دوستوں کو جنہوں نے ایک ایک ٹکٹ آپ سے خریدا تھا اور دو روپے اپنے پاس سے ڈاک میں بھیجے تھے۔ پانچ پانچ نئے ٹکٹ روانہ کردینگے۔ اب آپکی طرح وہ بھی چار عدد ٹکٹ مبلغ دو روپے میں اپنے دوستوں میں فروخت کر کے ہم سے گراموفون آٹھ آنے میں حاصل کریں۔

اے بی برادرز اینڈ کمپنی (کوپن ڈیپارٹمنٹ) بیڈن روڈ نزد مال لاہور

۳۳	سید عابد علی صاحب عابد بی اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس انتظامیہ
۳۴	میاں محمد صادق صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج
۳۵	خواجہ سعید احمد صاحب رفیقی ممبر مجلس ادبا
۳۶	پنڈت دولت رام کالیہ بیرسٹرایٹ لاء فیروز پور
۳۷	مسٹر محمد اسلم خاں صاحب بی اے وکیل میانوالی
۳۸	مسٹر مشتاق احمد زاہدی بی اے پرنسپل کالج ریاست بہاولپور
۳۹	شیخ غلام جیلانی صاحب تاجر خیمہ لاہور
۴۰	مسٹر روشن لال نیّر
۴۱	مرزا یاس عظیم آبادی
۴۲	مولانا فیض احمد صاحب ایم اے اسلامیہ کالج لاہور
۴۳	حضرت جگر مراد آبادی
۴۴	چودھری [illegible] بخش صاحب پروفیسر لاء کالج ممبر مجلس ادبا
۴۵	پنڈت رام [illegible] مل صاحب طالب لکھنوی ممبر مجلس ادبا
۴۶	منشی [illegible] علی خاں بدایونی
۴۷	مسٹر [illegible] خاں صاحب [illegible] سکریٹری انجمن
۴۸	مسٹر [illegible] اللہ شاہ صاحب بی اے [illegible]
۴۹	چودھری فضل الٰہی صاحب بی اے
۵۰	شیخ محمد حسین صاحب آنریری اسسٹنٹ سکریٹری مجلس نظم
۵۱	ڈاکٹر محمد عالم صاحب بی اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لاء ممبر مجلس ادبا
۵۲	سیٹھ عبدالمجید صاحب
۵۳	شیخ عطاء اللہ صاحب
۵۴	ڈاکٹر نند لعل صاحب ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لاء سرپرست
۵۵	مسٹر محمد ہادی حسین بی اے (آنرز)
۵۶	بخشی مہاراج کرشن صاحب مہتمم اجلاس
۵۷	مسٹر محمد صدیق صاحب رکن مجلس ادبا
۵۸	اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی رکن مجلس ادبا
۵۹	شیخ غلام جیلانی صاحب
۶۰	مسٹر ایم اے مقبول
۶۱	صاحبزادہ محمد عمر صاحب
۶۲	مسٹر خوشتر گرامی
۶۳	میاں افتخار الدین صاحب رئیس باغبانپورہ
۶۴	مسٹر محمد اسلم خاں صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل میانوالی۔

انجمن اربابِ علم پنجاب

کا
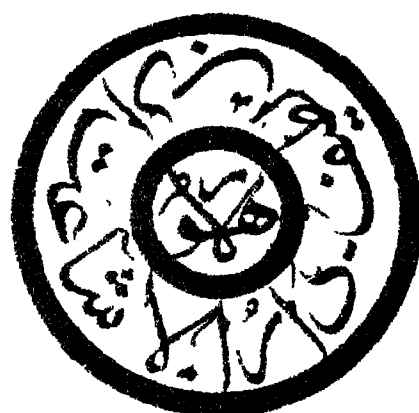
ماہوار رسالہ اپریل ـ مئی ۱۹۲۶ء

ہزار داستان

مرتبہ

سیّد عابد علی عابدؔ بی اے ایل ایل بی وکیل (مدیر اعزازی) محمد ہادی حسین قریشی بی اے (آنرز) (مدیر)

زیرِ نگرانی

خان بہادر شیخ عبد القادر بی اے بیرسٹر ایٹ لاء صدر انجمن

ڈاکٹر شانتی سرُوپ بھٹناگر ایم ایس سی ڈی ایس سی نائب صدر

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ دہلوی رکن انجمن

بلیغ الملک علامہ تاجورؔ نجیب آبادی سیکرٹری

دار الاشاعت ادبِ لطیف چیمبرلین روڈ ـ لاہور

فہرست اسمائے گرامی حضرات اراکین مجلس ادباء و مجلس انتظامیہ و مربیان

نمبر شمار	
۱	ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی سی آئی ای سرپرست
۲	خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لاء صدر مجلس انتظامیہ
۳	ڈاکٹر شانتی سروپ صاحب بھٹناگر ایم ایس سی ڈی ایس سی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی
۴	ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لاء نائب صدر
۵	راجہ نریندر ناتھ صاحب ایم اے ایم ایل سی بیرسٹرایٹ لاء صدر مجلس شعراء
۶	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی
۷	خواجہ دل محمد صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج نائب صدر مجلس شعراء
۸	رائےصاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی اے ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی سکول رکن مجلس انتظامیہ
۹	لالہ گلبہار سنگھ ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج رکن مجلس انتظامیہ
۱۰	شیخ نیاز محمد صاحب ایم اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس ادباء
۱۱	مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے آئی ای ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج صدر مجلس ادباء
۱۲	سردار اودے سنگھ صاحب شائق بی اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس انتظامیہ
۱۳	شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی فائنشل سکرٹری رکن مجلس انتظامیہ
۱۴	پنڈت میلارام صاحب وفا رکن مجلس انتظامیہ
۱۵	شیخ سراج الدین صاحب آذر ایم اے ایم او ایل پروفیسر اسلامیہ کالج رکن مجلس انتظامیہ
۱۶	ابوالمعانی حضرت اختر شیرانی رکن مجلس انتظامیہ
۱۷	پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی
۱۸	لالہ برج نرائن صاحب ایم اے پروفیسر سناتن دھرم کالج رکن مجلس انتظامیہ
۱۹	مسٹر محمد یوسف خاں سلیم بی اے پروفیسر کرسچین کالج رکن مجلس انتظامیہ
۲۰	مولانا تاجور نجیب آبادی سیکرٹری
۲۱	مولانا سیّد اولاد حسین صاحب شاداں لکھنوی پروفیسر اورینٹل کالج رکن مجلس انتظامیہ
۲۲	شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس ایس انسپکٹر مدارس لاہور رکن مجلس ادباء
۲۳	مولانا غلام محی الدین خاں صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل
۲۴	شیخ علاؤالدین صاحب جرنلسٹ
۲۵	قاضی فضل حق صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج ممبر مجلس ادباء
۲۶	مسٹر بھارت چندر ورما بی اے ایل ایل بی وکیل ممبر مجلس ادباء
۲۷	ابوالاعجاز حضرت سیفی صاحب سہواروی
۲۸	سیّد عابد علی صاحب عابد بی اے ایل ایل بی وکیل رکن مجلس انتظامیہ

ہزار داستان

جلد ۸ | فہرست مضامین بابت ماہ اپریل و مئی سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۴ و ۵

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر کے چھپا۔ اور دارالاشاعت ادب لطیف گنپت روڈ لاہور سے ... پبلشر و پروپرائٹر نے ... لاہور سے شائع کیا

تصنیفاتِ جامیؒ

(گزشتہ سے پیوستہ)

تصانیف تصوّف

تصوف کو چونکہ میں مذہب سے جدا مانتا ہوں۔ اس لئے تصوف کے متعلق جامی کی تصانیف کو علیحدہ عنوان قائم کر کے ذکر کرنا پڑا۔

نقد الفصوص[۵۱]۔ فصوص الحکم۔ شیخ اکبر علامہ محی الدین ابن العربی صاحب فتوحات مکیہ کی علم تصوف میں وہ انتہائی کتاب ہے۔ جس کے سمجھنے اور سمجھانے والے علما میں اب خال خال نظر آتے ہیں۔ اور ایسا غالباً جب سے تصنیف ہوئی ہے۔ اس کی یہ خصوصیت اسی وقت سے چلی آتی ہے۔ خود مولانا جامی بایں ہمہ علم و فضل اس کے بعض ادق مقامات اپنے مرشد خواجہ عبید اللہ احرار سے حل کیا کرتے تھے۔ علامہ موصوف نے فصوص الحکم کا انتخاب نقش الفصوص کے نام سے ایک رسالہ کی صورت میں ترتیب دیا تھا۔ سنہ ۸۶۳ھ میں مولانا جامی نے نقش الفصوص کی عربی اور فارسی میں شرح لکھی ہے۔ ابتدا میں تیس صفحات کا نہایت عالمانہ دیباچہ لکھا ہے۔ فصوص الحکم کی اپنے اپنے زمانہ میں مشاہیر علما نے شرحیں لکھی ہیں۔ لیکن جامی کی شرح نقد الفصوص

---

[۵۱] نقش الفصوص کو پڑھ کر علامہ محی الدین ابن العربی کی ادیبانہ قابلیت اور فصاحت و بلاغت کا اندازہ ہو سکتا ہے طویل الذیل مضامین کو مختصر سے مختصر عبارت میں ادا کر کے "بحر اندر سبو" کا مصداق بنا دیا ہے کتب منطق میں "تہذیب" کا ساحرانہ ایجاز و اختصار مشہور ہے لیکن نقش الفصوص میں اس سے بھی زیادہ قابل القبول اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ تاجور

تمام شروح میں اس لئے ممتاز ہے۔ کہ چونکہ جامی فلسفہ ومنطق کے اعلیٰ پایہ کے عالم ہونے علاوہ قادر الکلام بھی تھے۔ اس لئے ادق سے ادق مقامات کو نہایت سلیس عبارت میں حل کر سکے ہیں۔

شیخ اکبر کی وکالت غالباً ان سے زیادہ معقولیت کے پیرایہ میں اور کسی نے نہیں کی۔

نفحات الانس یہ کتاب صوفیائے کرام کی ایک تاریخ کہی جاسکتی ہے۔ اس کا ماخذ شیخ عبدالرحمٰن محمد ابن حسین متوفی ۴۱۲ھ نیشاپوری کی کتاب طبقات الصوفیہ ہے۔ یہ کتاب پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں تالیف ہوئی۔ اس صدی کے آخرین اسپر شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل عبداللہ ابن محمد الانصاری الہروی متوفی ۴۸۱ھ نے اور اضافہ کیا۔ میر علی شیر نوائی نے مولانا جامی سے ۸۸۱ھ میں درخواست کی کہ شیخ الاسلام کے زمانہ سے لیکر اب تک کے صوفیا کا تذکرہ اس پر اضافہ کیا جائے۔ چونکہ شیخ الاسلام نے ہرات کی قدیمی زبان میں لکھا تھا اس لئے مولانا نے رائج الوقت زبان میں اس کو ۸۸۱ھ سے شروع کر کے ۸۸۳ھ میں تکمیل کو پہنچادیا۔ اس میں معاصرین کا ذکر نہیں کیا۔ صوفیا کی شمار میں باعتبار عہد و نوع تقسیم کی ہے۔ اور اس میں نیرہ ۱۳ وہ صوفی ہیں جو مشاہیر شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ۶۱۴ شیوخ کی ابتدا ابو ہاشم صوفی متوفی ۱۶۱ھ ہجری معاصر امام سفیان ثوری سے ہوئی ہے۔ اور اختتام میر سید قاسم تبریزی متوفی ۸۳۷ھ پر ہوا ہے۔

صوفیا کے ذیل میں جن مشاہیر شعراء کا ذکر ہے۔ ان میں پہلے حکیم سنائی اور آخری حافظ شیرازی ہیں۔

چونتیس ۳۴ صوفیات یعنی اُن مستورات کا تذکرہ ہے جنہوں نے تصوف کے خارزار میں رہ نوردی کی ہے۔

نفحات الانس پر جامی کے فاضل روزگار شاگرد مولانا عبدالغفور لاری نے مولانا ضیاء الدین ابن جامی کی فرمائش پر کشف نفحات الانس کے نام سے حاشیہ بھی لکھا ہے۔ اُس کے اخیر میں مولانا جامی کے حالات مفصل طور پر بیان کر کے جامی کے حالات وفات بہت بسط کے ساتھ لکھے ہیں۔ نفحات الانس کو مولانا جامی نے لفظاً لفظاً اپنے اس مایۂ ناز شاگرد کو سُنایا ہے۔ نفحات الانس پر باون ۵۲ صفحات کا ایک بسیط اور نہایت مفید دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں نبوت ولایت کشف وکرامت اور اصول تصوف پر روشنی ڈالی ہے۔

تحفۃ الاحرار ۔ یہ ایک مثنوی ہے۔ جس میں قریباً دو ہزار اشعار ہیں۔ مثنوی کی زبان اور اداتے بیان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس اسی قدر کافی ہے کہ جامی کی تصنیف ہے۔ تمہیدی بیان کے بعد

چار مناجاتیں، پانچ نعتیں پھر حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند قدس سرہ کی منقبت پھر خواجہ ناصر الدین عبیداللہ کی مدح پھر فضیلت سخن پھر سخنوران وغیرہ نہایت دلربا انداز میں بیان فرما کر پیر روشن ضمیر کے ساتھ تین صحبتیں مذکور ہیں۔ اس کے بعد بیس مقالے بیان فرمائے۔ ہر مقالہ ایک ایک حکایت توضیح مضمون کے لئے لکھی ہے۔ ہر مقالہ میں ایک ایک مضمون جو علم تصوف کا ایک ایک ضروری باب ہے۔ نہایت خوبی کیساتھ بیان کیا گیا ہے۔ حکایات بیحد دلچسپ ہیں۔ تحفۃ الاحرار معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں گلستاں بوستاں کی طرح رائج رہ چکی ہے۔ کیونکہ تحفۃ الاحرار بہت سی حکایات لوگوں کی زبان پر اس طرح جاری ہیں جیسے ضرب الامثال مگر آج بہت ہی کم ایسے اشخاص اس ملک میں مل سکتے ہیں، جو یہ جانتے ہوں کہ ان حکایات کا اصل ماخذ تحفۃ الاحرار ہے۔ مثلاً کچھوے اور بطوں کی حکایت کہ دو بطیں کچھوے کو لیکر اڑیں اور کچھوا اپنی حماقت سے گر پڑا۔ یا ایک عورت نے راستہ چلتے ہوئے اپنے اُوپر عاشق ہونے والے ایک مرد کا امتحان اس طرح لیا کہ اُس سے کہا میری بہن مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ جو پیچھے آ رہی ہے۔ مرد اُس طرف متوجہ ہُوا۔ جب پیچھے کسی کو نہ دیکھا اور پھر اُسی عورت کے پیچھے لگا تو اُس نے کہا تو ہرجائی ہے اِس لئے میری محبّت کا مقام تو نہیں بن سکتا۔ یا مثلاً اُردو میں ضرب المثل مشہور ہے کہ "کوّا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا"۔ اس ضرب المثل کا ماخذ بھی تحفۃ الاحرار ہی کی ایک حکایت ہے۔ جو مقالہ شانزدہم میں مذکور ہے۔ صوفیوں کے لئے مثنوی مولانا روم۔ پندنامہ عطار وغیرہ کی طرح نہایت قیمتی تحفہ ہے۔

نقد النصوص شرح بر فصوص الحکم:۔ فصوص الحکم شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی صاحب فتوحات مکیہ کی علم تصوف میں وہ انتہائی کتاب ہے۔ جس کے سمجھنے اور سمجھانے والے دُنیا میں بہت ہی تھوڑے لوگ پائے گئے ہیں۔ آج بھی ہندوستان و ایران و عرب و مصر وغیرہ ممالک میں اگر تلاش کیا جائے۔ تو شاید ہی کوئی عالم ایسا مل سکے جو فصوص الحکم کو سمجھا کر پڑھا دینے کا اقرار کرے۔ اور یہ تو بعد ہی میں دیکھا جائیگا کہ وہ پڑھا بھی سکتا ہے یا نہیں فصوص الحکم پر اپنے اپنے زمانہ میں بڑے بڑے عالموں نے شرحیں لکھی ہیں۔ لیکن جامی کی شرح نقد النصوص تمام شروح میں اس لئے مخصوص و ممتاز ہے کہ جامی بوجہ اس کے کہ اعلےٰ درجہ کے فلسفی اور ساتھ ہی قادر الکلام تھے مشکل ترمقامات کو نہایت ہی سلیس و آسان فہم عبارت میں حل کر سکے ہیں۔ غیر ضروری تفصیلات میں پڑ کر

طول دینے اور اپنی علمیت کے ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اصل مقصود یعنی نفع رسانیِ طلبا کو مدنظر رکھ کر قابلِ تعریف ایجاز کو ملحوظ رکھا۔ اور مختصر عبارات میں سنگلاخ مضامین کو پانی بنا دیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ شیخ الاکبر کی تصانیف پڑھنے سے لوگ وحدت وجود کا جو مفہوم عوام میں مشہور ہے۔ وہ بھی عجیب و غریب ہے۔ جامی کی یہ شرح وحدت وجود کی گتھی سلجھانے کے لئے ایک قیمتی آلہ ہے۔ اور شیخ الاکبر کی تصانیف پر ہونے والے اعتراضات کی بے اعتباری ثابت کرتی ہے۔ جامی نے وحدت وجود کی ایسی تقسیم کی ہے۔ اور اس خوبی سے مضمون کو ادا کیا ہے۔ کہ جامی کی تحریر پر امام غزالی کی تحریر کا شبہ گزرتا ہے نقد النصوص کی تصنیف کا زمانہ جامی نے خود ۸۶۳ھ بیان فرمایا ہے۔

اشعۃ اللمعات۔ شیخ فخرالدین عراقی نے شیخ اکبر کی کتاب فصوص الحکم سے چند مضامین کا انتخاب کر کے لمعات کے نام سے لکھا تھا۔ میر نظام الدین شیر علی نوائی کی درخواست پر ۸۸۶ھ میں مولانا نے اس کی ایک بسیط شرح لکھی ہے۔

تفسیر فاتحۃ الکتاب۔ اس تفسیر کے نام سے یہ دھوکہ پڑتا ہے کہ مولانا جامی نے سورہ فاتحہ کی تفسیر ایک مفسر کی حیثیت سے کی ہوگی۔ اور اسی لئے اس تفسیر کو تصانیف مذہبی میں درج کرنا چاہیئے لیکن نہیں۔ مولانا جامی تصوف کے رنگ میں کچھ ایسے رنگے ہوئے ہیں کہ ہر چیز کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ شیخ الاکبر محی الدین ابن العربی اور شیخ صدرالدین قونوی نے جس رنگ میں سورۂ فاتحہ کی تفسیریں لکھی ہیں۔ مولانا جامی نے بھی ان کے اتباع میں اس تفسیر میں تصوف اور وحدت الوجود کی وہ رنگ آمیزیاں کی ہیں کہ یہ تفسیر تفسیر نہیں رہی۔ بلکہ تصوف کی ایک کتاب بن گئی ہے۔ یہ تفسیر قریب قریب اسی رائے کی مصداق ہوگئی ہے جو رائے اہل علم نے علامہ فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر کے متعلق دی ہے کہ کل علم فیہ الا التفسیر

مناقب مولوی و خواجہ:۔

خواجہ انصاری کے حالات و کشف کرامات بیان فرمائے ہیں۔

نشر اللآلی:۔

تصوف میں ایک رسالہ ہے۔

سخنان خواجہ پارسا - خواجہ محمد پارسا[51] کے اقوال ونصائح بیان فرماتے ہیں۔
رسالہ فی تحقیق مذہب صوفیہ - مسائل تصوف ووحدۃ الوجود کی تحقیق فرمائی ہے۔
فتوح الحرمین - مولانا نے اپنے سفر حج کے واقعات فریضۂ حج کی فضیلت کے متعلق جو روایات آئی ہیں۔ اُنہیں نظم میں لکھا ہے۔ یہ کتاب دو مرتبہ منشی نولکشور کے مطبع میں طبع ہوئی۔ مگر مطبع والوں نے یہ غلطی کی ہے۔ کہ اُس کو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ اور غضب یہ کیا۔ کہ کتاب میں جہاں جہاں جامی کا نام آیا تھا اُس کو بدل کر محی[52] بنایا ہے

علاوہ بریں وہ نظم بھی جو مدینہ منورہ میں روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچکر مولانا نے پڑھی تھی (اور جس کے چند شعر حالات سفر حج کے ذیل میں درج کئے جائینگے) اس کتاب میں موجود ہے۔ دہلی کے مطبع مجتبائی نے صحت کے ساتھ اس کتاب کو شائع کیا ہے۔

لوائح جامی - تصوف کا ایک بے نظیر رسالہ ہے۔ وجدانیات سے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں، لوائح اسی کی ایک مرتبہ صورت ہے جس طرح فلسفۂ تاریخ میں مقدمہ ابن خلدون ہیئات میں ہندسہ میں تحریر اقلیدس طب میں قانون شیخ سے بہتر کتابیں نہیں لکھی گئیں، اسی طرح فلسفۂ تصوّف میں فصوص الحکم اور لوائح جامی سے بہتر

---

[51] خواجہ پارسا حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ متوفی ۷۹۱ھ کے خلیفہ دوم ہیں اسم سامی محمد ہے۔ اور لقب پارسا ہے ایک روز خواجہ بہاؤالدین کے دولتکدہ پر تشریف لے گئے تھے۔ دروازہ پر خواجہ نقشبند کے انتظار میں کھڑے رہے۔ باہر سے ایک کنیز گھر میں گئی۔ تو خواجہ نقشبندؒ نے دریافت فرمایا کہ باہر کون ہے؟ کنیز نے جواب دیا۔ "جوانے است پارسا کہ بردر منتظر ایستادہ" خواجہ صاحب باہر تشریف لائے، تو خواجہ محمد کو دیکھ کر فرمایا کہ "شما پارسا بودہ اید" یہ لفظ خواجہ نقشبند کی زبان سے نکلا تو تمام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا۔ اسی روز سے خواجہ محمد خواجہ پارسا کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ خواجہ پارسا تہتر سال کی عمر میں روز پنجشنبہ ماہ جمادی الآخری ۸۲۲ھ میں رحلت فرمائی۔ اور مدینہ منورہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے قبہ مبارک کے متصل دفن کئے گئے۔ اُن کے مرید شیخ زین الدین الخوافی نے مصر سے سنگ مرمر منگوا کر لوح مزار بنائی۔

[52] زیادہ تحقیق کی گئی، تو معلوم ہوا کہ فتوح الحرمین نہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف ہے اور نہ مولانا جامی کی بلکہ مولانا محی لاری کی تصنیف ہے۔ تاجور

کتابیں دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا رومی کی مثنوی معنوی امام غزالی کی احیاء العلوم بھی بڑی پایہ کی کتابیں ہیں۔ لیکن ان دو کتابوں کے مقابلہ میں وہ علم تصوف کی ایک فرع ہیں۔ ان دو کتابوں میں فلسفہ تصوف کے اصول کو اس طرح مدون و محفوظ کیا ہے کہ تصوف کی کسی دوسری کتاب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لوائح جامیؒ کی نسبت اس سے بڑھ کر اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ فصوص الحکم اور فتوح الغیب کی مانند مگر اُن سے چھوٹی کتاب ہے اس میں تصوّف کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو جس خوبی اور ساتھ ہی شیریں زبانی میں ادا کیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

اس پر تاریخ تصنیف نہیں ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ر   )
کیا ہے۔ اور ترجمہ کے ساتھ سب سے پُرانے نسخے سے اصل کتاب کا عکس بھی بہترین بادامی کاغذ کے اس قدیمی نمونہ پر ایرانی خط میں شائع کیا ہے۔ شروع میں اپنے خیالات کا اظہار بارہ صفحے پر دیباچہ کی صورت میں کیا ہے۔ مترجم اُس میں کہتا ہے کہ لوائح جامی غالباً مصنف کی وفات کے بعد ایک صدی کے درمیان مرتب صورت میں آئی۔ کسی زمانہ میں یہ دہلی کے شاہی کتبخانہ میں یہ کتاب شہنشاہ اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے چوبیسویں سال داخل ہوئی مسٹر مارلے کے ہاتھ یہ کتاب لگی۔ انہوں نے اس کی وصلی پر لکھا ہے کہ یہ جامی کی تصنیف نہیں بلکہ کسی سید عبدالکافی کی ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ جامی کی تصنیف کو اگر ہزار دوسری تصانیف میں بھی ملا دیا جائے۔ تو اس کی طرزِ تحریر پیرایۂ بیان ترتیب مضامین کی خصوصیت یہ تمام امور شہادت بول پڑینگے کہ یہ جامی کی تصنیف ہے۔ علاوہ بریں بعض رُباعیوں میں جامی کا تخلص موجود ہے۔ مرزا محمد قزوینی نے فرنچ میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

نظم دار۔ شعراء عرب میں شیخ ابن الفارض متوفی سنہ ۶۳۲ھ بڑے پایہ کے صوفی گزرے ہیں ان کا تمام کلام صوفیانہ خیالات سے لبریز ہے۔ وہ اگرچہ مصر کے باشندے تھے لیکن اُن کے اشعار شعراء فارس کے خیالات کا آئینہ ہیں۔ اس سبب سے اہل تصوف شعراء عرب میں سے اُن کے کلام کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مولانا جامی نے اُن کے مشہور قصیدہ تائیہ کی جو خیالات تصوف سے پُر ہے۔ نثر میں شرح لکھ کر اپنی عادت کے مطابق ہر عربی شعر کے

سلے ماخوذ از حیات جامی

مفہوم کو ایک فارسی رباعی میں ادا کیا ہے

لوامع جامی[۵۱]۔ یہ شیخ ابن فارض مصری کے مشہور قصیدۂ خمریہ کی شرح ہے جس میں انھوں نے شراب (معرفت) کی مدح سرائی کی ہے۔ یہ شرح بھی پہلی شرح کے نمونے پر ہے۔ ہر شعر کی فارسی نثر میں تشریح کر کے اس کے ہم مفہوم ایک رباعی لکھ دی ہے۔

نے نامہ[۵۲] **شرح بیتین مثنوی**۔ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کے پہلے دو شعروں کی شرح لکھی ہے مسئلہ وحدت الوجود کو دلنشیں پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ فارسی نثر میں شرح کر کے تضمین کی صورت میں اُن دو شعروں کی منظوم شرح بھی کی ہے۔ مثنوی کا پہلا شعر ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند	وز جدائیہا شکایت می کند

اس پر مولانا جامی کی تضمین کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چند روزیکہ پیش از روز و شب	فارغ از اندوہ آزاد از طرب
متحد بودیم با شاہ وجود	حکم غیریت بکلی محو بود
نے زحق ممتاز و نے از یکدگر	غرقۂ دریائے وحدت سربسر
ناگہاں در جنبش آمد بحر جود	جملہ را در خود زخود با خود نمود
واجب و ممکن زہم ممتاز شد	رسم و آئین دوئی آغاز شد

نے کہ آغاز حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند

---

۵۱ حیات جامی

۵۲ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ محمد محسن ہروی کے ہاتھ کا لکھا ہوا جس پر برہان نظام شاہ بادشاہ دکن کی ۱۰۴۳ھ کی مہر لگی ہوئی ہے۔ لالہ ہرگووند پرشاد نگم دہلوی نے ۱۹۱۰ء کی الہ آباد کی نمائش میں رکھا تھا۔ اسکی قیمت بیس ہزار روپیہ بتائی گئی تھی۔ (حیات جامی)

شرح رباعیات۔ مولانا جامی نے اپنی بہت سی رباعیات کے دقیق صوفیانہ تخیلات کی دلپذیر فارسی نثر میں شرح لکھی ہے۔ اس شرح پر جامی کی شاعری پر تنقید کے ذیل میں اظہار رائے کیا جائیگا۔ فانتظر۔

شرح بیت امیر خسرو۔ امیر خسرو دہلوی کے اس شعر کی شرح ہے۔

ز دریائے شہادت چوں نہنگ لا بر آرد سر تیمّم فرض گردد نوح را در وقت طوفانش

جامی نے اس شرح میں بھی وحدت الوجود کے مسئلہ پر اظہار خیالات کیا ہے۔

شرح حدیث۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ قبل تخلیق عالم خدائے تعالےٰ کس حال میں تھا۔ نبی کریمؐ نے اس کا جو جواب ارشاد فرمایا ہے۔ مولانا جامی نے اپنی زبان میں اُس کی شرح لکھی ہے۔

رسالہ طریق توجہ۔ ایک دفعہ گیلان کا ایک رئیس زادہ ایسا بیمار ہُوا کہ اس کے بچنے کی آس بھی نہ رہی ایک روز اس پر ایسا سکوت طاری ہُوا کہ اُس کے عزیز و اقارب اسے مردہ سمجھ کر فریاد و فغاں کرنے لگے۔ تجہیز و تکفین کا سامان ہو رہا تھا۔ کہ اُس کے جسم میں حرکت محسوس ہُوئی۔ اور تھوڑی دیر میں ہوش آگیا۔ اسی روز اسے افاقہ ہوگیا۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ مجھ پر جس وقت غشی طاری ہُوئی۔ مَیں نے اس مدہوشی میں دیکھا۔ مولانا جامی تشریف لائے ہیں۔ اور میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ انہیں کی دعا کی برکت سے مَیں اچھا ہُوا ہوں۔ چنانچہ شفایابی کے بعد اُس نے بیس ہزار اشرفیاں مولانا جامی کی خدمت میں بطور نذر کے بھیجیں۔ اور ساتھ ہی خواجگان نقشبند کا طریق توجہ دریافت کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا نے یہ رسالہ تصنیف فرماکر بھیجدیا۔ اس میں نقشبندی سلسلہ کے توجہ و مراقبہ ذکر و شغل کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔

رسالہ وجودیہ۔ مولانا نے واجب الوجود کے اثبات پر عربی زبان میں یہ رسالہ لکھا ہے۔ اس کو دیکھ کر مولانا جامی کی متکلمانہ قابلیّت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس رسالہ میں بھی وحدت الوجود کے عقدے حل کئے ہیں۔

رسالہ تہلیلیہ۔ صوفیائے کرام کی طبائع رموز پسند واقع ہوئی ہیں۔ مولانا جامی بھی اس خصوصیت میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ اس رسالہ میں "لا الٰہ الا اللہ" کے عجیب و غریب معنی بیان کرکے لفظ اللہ کے حروف الف۔ لام۔ ھا۔ کے رموز بیان کئے ہیں۔ یہ رموز صوفیانہ معمے کہے جا سکتے ہیں۔

جامی کا طرزِ انشاء مشکل سے مشکل مسائل کو فصیح و پاکیزہ نثر میں بیان فرماتے ہیں۔ اور بلا تکلف اُسی مطلب کو نظم میں بیان کرتے ہیں۔ لوائح جامی۔ بہارستان۔ نقد النصوص۔ انشائے جامی کو دیکھو کیسے کیسے پیچیدہ و دقیق مطالب کو نثر میں بیان کرنے کے بعد نظم میں ادا کر کے آسان و دلفریب بنا دیا ہے۔ جامی کی اس خصوصیت پر غور کرنے سے انسان جامی کی قادر الکلامی سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اور کوئی دوسرا قادر الکلام جامی کا نظیر نظر نہیں آتا۔ یہ بات یعنی یہ قادر الکلامی نہ خسروؒ کے یہاں ہے نہ فیضی کے یہاں اس خصوصیت میں سعدی بھی جامی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور ناصر خسرو و قاآنی وغیرہ بھی نہایت پست نظر آتے ہیں۔

جامی کی اخلاقی و فلسفی تصانیف میں سے یعنی اُن کتابوں میں سے جو نثر کی کتابیں مشہور ہیں۔ جامی کے اشعار جو انہوں نے بیساختہ نثر لکھتے ہوئے لکھے ہیں جمع کئے جائیں۔ تو نظم کا اتنا بڑا گراں سنگ ذخیرہ جمع ہو جائیگا۔ کہ کسی بڑے سے بڑے پُر گو شاعر کا عمر بھر کا کلام بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیگا۔ اور اس ذخیرہ میں ہر قسم کے نمونے موجود ہوں گے۔ مثلاً نقد النصوص یعنی شرح فصوص الحکم ایک ایسی کتاب ہے جس کے اہم فلسفی مسائل کا تصوّر کرتے ہوئے خیال بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں شاعری کو بھی کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ مگر جامی نے اپنے اندازہ خاص کر اس کتاب میں بھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ عراقی کی غزل "کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگان مائی" جو شہرت رکھتی ہے۔ اور جس کثرت سے ارباب حال و قال کی مجلسوں کو گرم کرتی ہے حاجت بیان نہیں۔ جامی نقد النصوص میں ایک جگہ نہایت بے تکلفانہ چند شعر لکھ دیتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

بگسل ز بے اصولاں مشنو فریب غولاں　　کہ تو از شریف اصلی کہ تو از بلند جائی
تو براوج بے زوالی ز درونہ بے جمالی　　تو از آں ذوالجلالی تو ز پرتو خدائی
تو ہنوز نا پدیدی ز جمال خود چہ دیدی　　سحری چو آفتابی ز دروں خود بر آئی
تو چنیں نہاں دریغی کہ می بزیر میغی　　بدراں تو میغ تن را کہ می دخوش لقائی
تو چہ پائے بستہ تو کندہ برپا　　تو بچنگ خود بباید کہ گرہ دپا کشائی

اسی کتاب نقد النصوص میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اے عشق منم از تو سرگشتہ و سودائی　　واندر ہمہ عالم من مشہور بشیدائی

در نامہ مجنوناں از نام من آغاز زند | زیں پیش اگر بودم سر دفتر دانائی
اے بادہ فروش من سرمایۂ جوش من | از تست خروش من تایم تو اگر نائی
سرمایۂ نازاز تو ہم اصل نیاز از تو | ہم دامن شیدائی ہم دلبر عذرائی
گر زند گیم جوئی در من نفسے دارم | من مردۂ صد سالہ تو جان مسیحائی
اوّل تو و آخر تو باطن تو و ظاہر تو | مستور زہر چشمے در عین ہویدائی

مولانا جلال الدین رومی۔ خسرو۔ عراقی۔ حافظ وغیرہ کے یہاں اس سے بڑھ کر عشق حقیقی کا جوش وخروش کہاں نظر آسکتا ہے۔

تحفۃ الاحرار سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناصر الدین عبید اللہ نقشبندی سے مولانا جامی کو خصوصی عقیدت تھی اور اُن کے مرید تھے۔

انشائے جامی میں بھی سب سے پہلے وہی رقعات درج ہیں، جو خواجہ عبید اللہ کے نام جامی نے لکھے ہیں۔ ان تمام رقعات سے انتہائی عقیدت و نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک رقعہ میں لکھتے ہیں ؎

یاد آں روزے کہ در میخانہ منزل داشتم | جام مے بردست و جاناں در مقابل داشتم
قصۂ کوتہ کز شمول فیض پیر مے فروش | بود حاصل ہر تمنّائے کہ در دل داشتم

نیاز و انفقار عجز و انکسار بموقف عرض رسایندہ میشود ملتمس آنکہ دور ماندگاں درماندہ را بالکلیہ فراموش نکردانند گاہ گاہے در اوقات حضور در مجلس شریف بگوشہ خاطر منیف بگذرانند ؎

اے بہ بزم وصل حاضر غائباں را دستگیر
زانکہ دست حاضراں از غائباں کوتاہ نیست

زیادہ ابرام شرط ادب نیست سلام اللہ ورحمۃ وبرکاتہٗ علیکم اولاً وآخراً
اس رقعہ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ جامی کو خواجہ ممدوح کے ساتھ کیا تعلق تھا۔

تاجور

غزل

گل و نسرین و ریحاں ہو شقیق و سنبلستاں ہو
نگارِ گل بداماں ہو۔ بہار جلوہ ساماں ہو

نوید راحتِ جاں ہو مراد شوق پنہاں ہو
وہ دل تقدیر والا دل ہے تم جس دل کے خواہاں ہو

خوشا وہ دن کہ میں ہوں اور لب پر شکر احساں ہو
خوشا وہ دن کہ تو ہو اور پاس عہد و پیماں ہو

اُدھر دوری کا وہ عالم کہ حدِ وہم سے باہر
اِدھر قرب اور اس درجہ کہ نزدیک از رگ جاں ہو

جو الفت ہو تو ایسی ہو کہ مشکل سے یقیں آئے
جو وعدہ ہو تو ایسا ہو کہ زیب طاق نسیاں ہو

یہ کیا رنگ تماشا ہے ابھی پیدا ابھی پنہاں
جو پیدا ہو تو پیدا ہو جو پنہاں ہو تو پنہاں ہو

سمجھتا ہوں نگاہ لطف کا منشا سمجھتا ہوں
بظاہر دل کے خواہاں ہو بباطن دشمن جاں ہو

کہیں ایسا نہ ہو انجام بیرحمی بُرا نکلے
جو ممکن ہو تلافی کر۔ نہ ممکن ہو پشیماں ہو

جسے دیکھو وہ دیوانہ جسے پوچھو وہ پروانہ
بہارِ باغِ ہستی ہو۔ فروغِ بزم امکاں ہو

نہ وہ آنکھیں نہ وہ جلوہ نہ وہ عالم نہ وہ دُنیا
ابھی آنکھوں کے آگے تھے۔ ابھی آنکھوں سے پنہاں ہو

نہ اب راحت سے مس باقی۔ نہ راحت کی ہوس باقی
فقط اُس درد کے ارمان ہیں تم جس کے درماں ہو

کوئی دونوں جہاں سے ہاتھ اُٹھا بیٹھا تو کیا پروا
تم ان مولوں بھی سستے ہو تم ان داموں بھی ارزاں ہو

غلط نکلا تمہیں جانِ جہاں کہنا غلط نکلا
خدا شاہد۔ خُدائی بھر کی بربادی کے ساماں ہو

کبھی آزاد! ہم کو بھی دُعا سے یاد فرمانا
کہ مقبولِ خدا ہو۔ خاصۂ خاصانِ یزداں ہو

آزاد انصاری

محمد حسین آزاد

(بسلسلۂ ماہ فروری)

(عنایت ہے درتیخ عبدالقادر کا یہ مضمون جس کی دوسری قسط اس مرتبہ پیش کی جا رہی ہے
اُن کی ادبی زندگی کے اوائل کے مضامین میں سے ہے۔ اس موضوع پر اُنہوں نے ایک اور مضمون
تحریر فرمایا ہے جو پہلے مضمون کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور یہ مضمون اب تک کہیں
شائع نہیں ہُوا۔ انشاء اللہ کسی آیندہ اشاعت میں پیش کیا جائیگا) مدیر

ابھی نوجوانی کا سن تھا کہ ذوق کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے موقعے ملنے لگے۔ ذوق اُنہیں اپنا ایک ہونہار اور لائق شاگرد سمجھتے تھے۔ اور بہت عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی خاص توجہ سے آزاد نے تھوڑے عرصے میں قدیم اور جدید اُستادوں کے مشہور مشہور اشعار اور اُن کے متعلق روایتوں اور تذکروں کا ایک معقول ذخیرہ جمع کر لیا۔ یہ اُس وقت کی سب سے بڑی جائداد تھی۔ جو شاعر اپنے فرزندانِ معنوی کو ورثے میں دیتے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ آگے چل کر آزاد کے بہت کام آئی۔

تجسس کا شوق طبیعت میں بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ موقع بموقع اُستاد پر ہر بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کرتے رہتے تھے۔ اُستاد جیسی کیفیت میں ہوتے، اس کے مطابق جواب دیدیتے۔ طبیعت میں لہر آتی تو بڑی شفقت اور توجہ کے ساتھ بات کا ہر پہلو واضح کرتے۔ ورنہ مختصر سا جواب دیکر ٹال دیتے۔ لیکن آزاد اسی پر کب بس کرنے والے تھے۔ اس سے طبیعت کو سیری نہ ہوئی۔ تو اُستاد کے پرانے ملنے جلنے والوں اور بچپن کے دوستوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ اور اُن کے حالات اُن سے کرید کرید کر پوچھا کرتے۔ انتہا یہ تھی کہ اُستاد کے بوڑھے باورچی کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ وہ اس گھر میں مدتوں کا ملازم تھا۔ پھر دلی کا رہنے والا، اور شعر و سخن کا مشتاق۔ اس لئے ذوق کی ابتدائے شاعری کے متعلق تمام حالات سے واقف تھا۔ بلکہ اس زمانے کے بہت سے ایسے شعر اُسے یاد تھے، جو ذوق کے ذہن سے اُتر گئے تھے۔ یا جن کو وہ اس وجہ سے کہ اُن کے ترقی یافتہ مذاق کی کسوٹی پر پورے

نہ اُترتے تھے۔ بھول جانے کی کوشش کرتے تھے۔

آزاد کے نزدیک اپنے اُستاد کا ہر شعر جُداگانہ قدر وقیمت رکھتا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ابتدائی شعر خواہ بجائے خود کتنے ہی خام اور نقائص سے پُر کیوں نہ ہوں، اُن سے کم ازکم اتنا فایدہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اُستاد کے تازہ کلام سے اُن کا مقابلہ کرکے یہ معلوم کیا جائے۔ کہ اس عرصے میں اُن میں کیا تفاوت واقع ہوا ہے۔ آزاد باورچی کی زبانی پُرانے تذکرے سُننے کی غرض سے اوقاتِ فرصت میں گدائے مُبرم کی طرح اُس کے گرد ہوئے رہتے۔ اور ہمیشہ تقاضا جاری رکھتے۔ طرح طرح کی منت سماجت سے کام لیتے، جس جس طریقے سے ممکن ہوتا اُس کی خوشامد کرتے۔ تا آنکہ اُسے اُن کی درخواست پوری کرتے ہی بن پڑتی۔ آزاد اپنی ایک شاندار کامیابی کا تذکرہ دیوانِ ذوق کے جدید نسخے میں جو خود اُنھوں نے ترتیب دیا ہے۔ بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ موقع بھی فخر کا تھا۔ جو شعر اُن کی فتح کا نشان ہے اُس کے رنگ کا کوئی دوسرا شعر سارے دیوانِ ذوق میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتا۔ ملاحظہ ہو:۔

پیشانیٔ انور پہ ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

یہ شعر سُن کر آزاد نے باورچی کی سند پر اکتفا نہیں کی۔ سیدھے اُستاد کے پاس گئے۔ اور شعر پڑھ کر پوچھا کہ کس کا شعر ہے؟

ذوق مُسکرائے۔ اور نیم رضامندی کے ساتھ اپنی ملکیت کا اعتراف کیا۔

(باقی دارد)

شیخ عبدالقادر

غزل

ذوق نظارہ ہے لایا سر منزل مجھ کو
سیر کر لینے دے اے بیخودیٔ دل مجھ کو

اس طرح یار کی تصویر کھنچی آنکھوں میں
کہ ہر اک ذرہ ہوا لیلیٰ محمل مجھ کو

دیر و کعبہ سے پرے ہے مرا ذوق توحید
کفر و ایماں سے تعلق نہیں اے دل مجھ کو

دونوں دیوانوں میں اس درجہ محبت ہو جائے
دل کو بہلاؤں میں بہلائے مرا دل مجھ کو

طور اور نجد سے تسکین نظر کیا ہو گی
جب میں جانوں کہ ملے تو سر محفل مجھ کو

وائے ناکامی الفت کہ رہ منزل میں
میری وحشت نے کیا پابہ سلاسل مجھ کو

ظفر حسین رشک بی اے

MODERN URDU POETRY

از پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے ایل ایس اے (لندن) یہ اپنی قسم کی بینظیر کتاب ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ سے ۱۹۲۵ تک کے تمام اردو شاعروں کے کلام پر فاضلانہ تنقید اور محاسن و معائب پر بحث کی گئی ہے۔ نیز انگریزی شاعروں کے کلام کے ساتھ مقابلہ بھی نہایت دلچسپ طریقے پر کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے طالب علموں۔ پروفیسروں اور اردو ادب کے بہی خواہوں کے بڑے کام کی چیز ہے۔ قیمت مجلد دو روپے (عہ)

ڈاکٹر بن مالی کرشن اگروال ڈیرہ دون

ناٹک کتھا کے سلسلہ کی چوتھی کہانی

مٹی کی گاڑی

(مصنفہ راجہ شودرک)

محمد عمر و نور الہٰی صاحبان کو ادبی دنیا مختلف ذرائع سے جانتی ہے مختصر افسانہ، تنقیدی مضمون، ڈرامہ کی مختلف اقسام اور دیگر اصناف ادب میں آپکے متعدد کارنامے ہیں، جو مقبولیت عام حاصل کر چکے ہیں لیکن ڈرامہ سے آپکو ازلی نسبت ہے۔ اور اسوقت اس فن کے خاص الخاص ماہرین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ آپکی تالیف "ناٹک ساگر" جو اُردو میں ڈرامہ کی سب سے پہلی تاریخ ہے، موجودہ دَور کی منتخب کتابوں میں تسلیم کی جاتی ہے۔

آپ کی تازہ ترین تصنیف "ناٹک کتھا" جسکا سلسلہ ہزار داستان میں کچھ مدت سے جاری ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے، جو سنسکرت کے ناٹکوں سے ماخوذ ہیں، اور جنکا مقصد سنسکرت کی ادبیاتِ ڈرامہ کی رُوح کو ایک نئے پیکر میں متشکل کرنا ہے جسطرح انگریزی میں چارلس لیمب نے شیکسپیئر کے ڈرامے افسانوں کی صورت میں از سر نو مرتب کئے ہیں۔ آپ دیکھینگے کہ رُوح اور پیکر دونوں ایکدوسرے سے بڑھ چڑھ کر حسین و جمیل ہیں۔ "ناٹک کتھا" اگر ایک طرف سنسکرت کے ڈراموں میں پلاٹ کی نشو و نما کا جو اعلیٰ معیار تھا اُسے پیش کرتی ہے، تو دوسری طرف نور الہٰی محمد عمر صاحبان کی تحریر کی سادگی و پرکاری کا نمونہ ہے۔ مدیر

کسی زمانہ میں پالک نامی ایک راجہ اجین میں راج کرتا تھا۔ یہ راجہ بڑا ظالم۔ انیائی اور پرلے درجہ کا ادہری تھا۔ اس ہر بونگ کے راج نے پرجا کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ برہمن تراس تراس کر رہے تھے۔ اور ہر جگہ دھرم شاستر کے حکموں کی کھلی اُڑائی جاتی تھی۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اندھیر نگری اور چوپٹ راجہ کا نقشہ اس شہر میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ پالک کے کھانڈے نے لوگوں کے مُنہ پر تالے ڈال دئے تھے۔ اور وُہ دم نہیں مار سکتے تھے۔ مگر دل کا حال ایشور ہی کو معلوم ہوتا ہے۔ اس میں سمجھ کی ایک نہیں چلتی۔ لوگ دِل ہی دل میں اسے کوستے تھے اور کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتا تھا۔ جب پانی سر سے گزر گیا اور لوگوں کی جان لاج اور دھرم کے لالے پڑ گئے، تو ایک رشی سے نہ رہا گیا۔ اور اس نے جان پر کھیل کر وُہ

بات کہہ ڈالی جسے وہ مدتوں سے اپنے دل میں چھپائے
بیٹھا تھا۔ یہ سنکر لوگوں کی جان میں جان آئی کہ ایک
گوالا پالک کو نرک میں پہنچا کر اجین واسیوں کے لئے
یہیں سورگ پیدا کر دیگا۔ رشی نے بات کی اور چلتا
ہوا۔ پالک نے لاکھ گھوڑے دوڑائے۔ مگر رمتے جوگی
بہتے دریا اور چلتی ہوا کو کون پکڑ سکتا ہے۔ طویلہ کی
بلا بندر کے سر آئی۔ ایک جوگی کے بدلے سینکڑوں
گوالے دھرے گئے۔ ان بیگناہ قیدیوں میں اریک
گوالا بھی تھا۔ جسے ایک دن پالک کو ٹھکانے لگانا تھا
انہی دنوں کی بات ہے کہ اجین میں ایک
بانکا البیلا گبرو جوان برہمن رہتا تھا جس کی سخاوت
کی شہر بھر میں دھوم تھی۔ اس کا نام چارودت تھا۔
اور وہ وسنت سینا نامی شہر کی ایک حسین اور خوش گلو
گامن کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ وہ بھی چارودت کو دل
سے چاہتی تھی۔ اس لئے ان کی "چٹ منگنی اور پٹ بیاہ"
میں سوال کرنے کی دیر تھی، مگر یہ مشکل تھی کہ برہمن اپنا
دھن دولت سادھو سنتوں کی سیوا میں لگا کر کھکھ ہوگیا
تھا۔ اور اسے یہ گوارا نہ تھا کہ بیوی کے پیسے پر چھیلا
بنا پھرے۔ مگر وسنت سینا اپنا سارا مال اسکے سامنے
ڈھیر کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ اسنے چارودت
کی اس وضعداری پر غالب آنے کے لئے لاکھ جتن کئے

مگر ایک نہ چلی۔ اس کھیل میں ایک داؤ باقی رہ گیا تھا۔
اس نے وہی چلا، اور ایک دن شام کے وقت اپنے
زیوروں کی صندوقچی بغل میں دبا کر چارودت کے گھر
کی طرف روانہ ہوئی۔ ہلکی ہلکی پھوار نے اس کے راستہ
میں چھڑکاؤ کیا۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے اس
کے کستوری جیسے کالے بالوں کی بلائیں لیں۔ مگر کسے معلوم
تھا کہ انسان کے لباس میں ایک بس بھرا کالا راست میں
ملے گا۔ وہ تھوڑی دور ہی جانے پائی تھی، کہ اس کی
راجہ پالک کے سالے سن تھانک سے مڈھ بھیڑ ہوگئی
ایک تو راجہ کا سالا پھر اختیار وہ کہ شاید راجہ کو بھی نصیب
نہ ہوں۔ اس کی وہ رتی چڑھی تھی۔ کہ یہ نیم چڑھا کریلا
کھلے بندوں لوگوں کی بہو بیٹیوں کو گھورتا تھا مگر کیا
مجال کہ کوئی دم بھی مار سکے۔ وسنت سینا کے جوبن
پر اس کی مدت سے آنکھ تھی۔ مگر وہ اس کے ہتھے
نہ چڑھتی تھی۔ اب راستے میں اکیلی ملی۔ تو بلی کے بھاگوں
چھینکا ٹوٹا۔ چاہتا تھا کہ لپک کر اٹھا لے اور دھینگا دھینگی
گھر لے جائے۔ مگر اسے اتنا ہی معلوم ہوا کہ بادل کے
گھٹا ٹوپ میں بجلی چمکی اور نظر سے اوجھل ہوگئی۔ اس نے
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر وسنت سینا وہاں ہوتی
تو نظر آتی وہ موذی کے چنگل سے نکل کر اندھا دھند بھاگی
اور چپکے سے چارودت کے گھر میں گھس گئی سنس تھانک

کو جب معلوم ہوا کہ اس کا شکار ایک نربل برہمن کے
گھر میں چھپا بیٹھا ہے، تو اس نے چارودت کو حکم بھیجا کہ
وسنت سینا کو باندھ کر اس کے حوالے کرے۔ یہ حکم پڑھا
تو برہمن نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ وہ چاند اس کے اپنے
گھر کے اندر چمک رہا ہے۔ جس کے لئے وہ اندھیری
گلیوں کی خاک چھانا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سنس تھانک
سے بگڑی الجھانا کھیل نہیں۔ مگر اسے یہ بھی علم تھا کہ وسنت سینا
سے آنکھیں پھیر لینا اس کے بس کی بات نہیں محبت
اور عقل میں اک جھوڑ سی ہو گئی۔ عقل تو اپنا سا منہ لیکر
بیٹھ گئی اور سنس تھانک کا پروانہ محبت کی شمع پر قربان
ہو گیا۔ یہ دو ٹوک فیصلہ کر کے چارودت نے وسنت سینا
سے کہا کہ دھن بھاگ اس گھر کے جس میں قدم رکھ کر
آپ نے اسے آسمان سے بھی اونچا کر دیا۔ آج میں
نے کس کا منہ دیکھا تھا جو منہ مانگی مراد آپ سے آپ
میرے پاس آ گئی۔ وسنت سینا مسکرائی ذرا لجائی،
اور ساڑی کے آنچل کو مسلتی ہوئی بولی۔ اگر میرا
بن بلائے آنا ناگوار نہیں۔ اور آپ کو میرے لئے جان
جوکھوں میں پڑنے سے دریغ نہیں، تو اتنی اور کرپا
کیجئے کہ اس صندوقچی کو اپنے پاس رکھئے۔ آجکل چور چکار
کا ڈر ہے۔ میں سڑی عورت ذات کیا چوکسی کروں گی۔
ابھی ابھی راستے میں ملے تھے۔ مگر خیر گزری۔ یہ بلا اوپر ہی
اوپر ٹل گئی۔ چارودت مان گیا۔ صندوقچی رکھ لی۔ اور
ہتھیار بند نوکروں کے جھرمٹ میں وسنت سینا کو گھر
تک پہنچانے چلا۔ سنس تھانک نے انہیں جاتے دیکھا۔
مگر ان کا جماؤ زیادہ تھا۔ اس لئے پی گیا۔ اور گھر کی راہ لی
چارودت واپس آیا۔ تو اس نے صندوقچی کے رکھ رکھاؤ
کا خاص اہتمام کیا۔ ایک آدمی دن کو اور ایک رات کو
پہرا دینے کے لئے مقرر ہوا۔

اب لگے ہاتھوں ایک اور قصہ سن لیجئے۔ وسنت سینا
کی بال باندھی باندی مدنکا نے سروِلک نامی ایک
برہمن سے شادی کی بات چیت کی تھی۔ دونوں
ایک دوسرے کا نام لے کر جیتے تھے۔ اور ان کی محبت
کا جا بجا چرچا تھا۔ مگر سنجوگ کی صورت تب ہی بن سکتی
تھی۔ کہ وسنت سینا نے جو مول دیکر مدنکا کو خریدا تھا
وہ رقم ادا کی جاتی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سروِلک
نے یہ روپیہ پیدا کرنے کی کوشش کا حق ادا کر دیا۔
لیکن لچھمن کے دینے کے ڈھنگ بتا رہے ہیں۔
اس کا لطف محنت اور لیاقت پر موقوف ہوتا، تو
کوئی جاہل کاہل کا ہے کو مرتبہ پر پہنچتا اور زمیندار کا
مکان ساہوکار کے مکان سے بہتر ہوتا۔ اس لئے اس
کے ہاتھ پاؤں مارنے بیکار ہو گئے۔ اور رقم بہم نہ پہنچی،
جب چاروں طرف سے نراس ہو گیا۔ تو سروِلک سامنے

جی میں ٹھان لی۔ کہ بلا سے خواہ کچھ ہو، وہ کسی مالدار کے گھر سے چوری کر کے یہ رقم پوری کریگا۔ اس کے لئے اس نے چارودت کا گھر چُنا۔ کیا ہُوا چارودت کے پاس روپیہ نہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی ساکھ اور امیرانہ دکھاوے میں فرق نہ آیا تھا۔

مگر وہ چیز جس کی سرویلک کو تلاش تھی۔ اس گھر سے مدتوں کی سدھار چکی تھی۔ اور اس کے لئے اس اونچی دُکان کا پکوان سراسر پھیکا تھا۔ سرویلک نقب لگا کر چارودت کے مکان میں داخل ہُوا، تو کیا دیکھتا ہے کہ چارودت کا نوکر صندوقچی پر ہاتھ رکھے نیند کے مزے لے رہا ہے۔ سرویلک نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ ہٹایا۔ اور صندوقچی لے کر اُلٹے پاؤں چلا گیا۔

دن چڑھا تو چارودت کو معلوم ہُوا کہ رات کے سیاہ پردے میں کیا اندھیر ہُوا ہے۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اب وسنت سینا کو مُنہ دکھانے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ اسی ادھیڑ بُن میں پڑا تھا کہ اچانک اُسے یاد آیا کہ اس گئی گزری حالت میں بھی اس کے پاس موتیوں کی ایک ایسی مالا ہے، جس کی قیمت وسنت سینا کے ان زیوروں کے لگ بھگ ہوگی۔ اور اب اُس نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے اقبال کی اس آخری یادگار سے وسنت سینا کے نقصان کی تلافی کرے۔ فوراً نوکر کو آواز دی، اور اُسے کہا کہ یہ مالا وسنت سینا کو دیکر کہنا۔ کہ کل شب کو جوئے کی سبھا میں جانا ہُوا۔ جو کچھ پاس تھا، ماجر نل کے نام پر نثار کر ڈالا تو آپ کی صندوقچی ایک بھلے مانس کے پاس گرو رکھ کر روپیہ لیا۔ اور ابھی ابھی معلوم ہُوا ہے۔ کہ یہ حضرت صندوقچی لیکر چنپت ہو گئے ہیں۔ آپ جانتی ہیں، جوئے کی لت بُری ہوتی ہے۔ اور پانسے دیکھ کر مَیں آپے میں نہیں رہتا۔ یہ مالا بڑے بوڑھوں کی نشانی ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں یہ بھی یاروں کی نذر نہ ہو جائے۔ اگر آپ اپنے پاس رکھنے کی تکلیف گوارا کریں، تو بچ جائیگی، ورنہ خیر! وسنت سینا نے مالا رکھ لی، اور اُسے چارودت کے گلے کا ہار ہونے کے لئے ایک اور بہانہ ہاتھ آیا۔ سرویلک دن بھر شام کا انتظار کرتا رہا جب سُورج ڈُوبا، تو اس کا دل انتظار کے بھنور سے نِکلا۔ اور وہ سیدھا وسنت سینا کے مکان کے اس حصّہ میں جا پہنچا۔ جہاں وہ مدنکا سے ملا کرتا تھا۔ اس نے بڑے گھمنڈ سے صندوقچی مدنکا کو دکھائی، وہ تو اپنے دل میں یہ سمجھے تھا۔ کہ اس نے بڑا قلعہ فتح کر کے مدنکا کی بیڑیاں کھولنے کی چابی حاصل کی ہے۔ اور وُہ صندوقچی دیکھتے ہی باغ باغ ہو جائیگی۔ مگر فوراً پہچان گئی کہ وسنت سینا کا مال ہے۔ اور پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ وسنت سینا اوٹ میں کھڑی یہ سب

باتیں سُن رہی تھی، اور ہنسی کے مارے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ آخر جب اُس نے دیکھا کہ دونوں بکتے جھکتے ہلکان ہو گئے ہیں۔ تو وہ سامنے آئی۔ اور مدنکا کو آزاد کر کے کہا۔ کہ وہ خوشی سے شادی کرے۔ اور سریلک کے ہاں جا رہے۔

اب وسنت سینا پر سب حال روشن ہو گیا کہ کس طرح چارودت کے ہاتھ سے صندوقچی نکلی اور کیوں اس نے مالا اس کے پاس بھیجی۔ ہنسی دبی تو وسنت سینا کی گھٹی میں پڑی تھی۔ چارودت کو بنانے کا اس سے اچھا کون موقع ہو سکتا تھا۔ جھٹ صندوقچی لیکر چارودت کے مکان کا رُخ کیا۔ اور اس سے جا کہا میں نے جوئے کی سبھا میں آپ کی مالا ایک شخص کے پاس گرو رکھی تھی۔ وہ اسے لیکر کہیں چلتا ہُوا۔ اس سونے کی صندوقچی کو اپنے پاس رکھئے، ایسا نہ ہو یہ بھی کسی وقت ہاتھ سے کھو بیٹھوں۔" چارودت بات پا گیا۔ بہت ضبط کیا۔ مگر دانت نکال کر ہنسنا ہی پڑا۔ اس کا ہنسنا تھا کہ وسنت سینا اس سے لپٹ گئی۔

دوسرے دن چارودت تاروں کی چھاؤں میں کسی کام کو جانے لگا۔ تو اس نے نوکروں سے کہا۔ کہ جب وسنت سینا جاگے، تو اس سے کہنا کہ پالکی میں بیٹھ کر باغ میں آ جائے۔ جب وسنت سینا اُٹھی، تو جلدی جلدی سنگار کرنے لگی۔ تاکہ باغ جانے میں دیر نہ ہو جائے۔ اتنے میں چارودت کا بیٹا رہوسین روتا بلکتا آیا۔ یہ لڑکا چارودت کی پہلی بیوی کی یادگار تھا اس وقت اس کی عمر پانچ سال کی تھی۔ وسنت سینا نے جھٹ اُسے گود میں اُٹھایا۔ پیار کیا۔ چمکارا پچکارا۔ جب بچّے کو بہلا لیا۔ تو اس سے رونے کا کارن پوچھا۔ معلوم ہُوا کہ پڑوس میں ایک امیر کا گھر ہے۔ اس کے بچّے کو ایک ڈال سونے کی کھلونا گاڑی ملی ہے۔ رہوسین نے ویسی گاڑی مانگی، تو انّا نے بجائے سونے کے مٹّی کی گاڑی لے دی۔ وسنت سینا نے انّا کو چند زیور دئے کہ انہیں بیچکر بچّے کو سونے کی گاڑی بنوا دے۔ بچّہ کو بہلا کر وہ باہر نکلی۔ کہ چارودت کی پالکی میں بیٹھ کر جلد اس کے پاس پہنچ جائے۔

اس عرصہ میں سنس تھانک چارودت کے ایک امیر پڑوسی کے ہاں آیا ہُوا تھا۔ اس کی پالکی باہر کھڑی تھی، وسنت سینا اسے چارودت کی پالکی سمجھ کر اس میں بیٹھ گئی۔ اور پردے چھوڑ دئے، کہار ذرا فاصلہ پر بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے یہ خیال کیا کہ سنس تھانک سوار ہُوا ہے۔ اس لئے پالکی اُٹھا کر بھاگا بھاگ نکل گئے۔

اسی دن سروِیلک اریک کو قید خانہ سے نکال لایا
تھا اور چوکیدار اس کی تلاش میں چاروں طرف دوڑ
رہے تھے۔ قریب تھا کہ گرفتار ہو جائے، کہ چارودت
کے مکان کے پاس اسے چارودت کی پالکی دکھائی
دی۔ اور وہ چپکے سے اس میں گھس گیا۔ کہاروں نے
پالکی اٹھائی، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باغ
کو راہی ہوئے۔

جب چارودت کی پالکی باغ میں پہنچی، تو اس
نے بڑے شوق سے پردے اٹھائے، مگر جب اس
نے دیکھا کہ وسنت سینا کی جگہ ایک قیدی بیٹھا ہوا
ہے۔ تو وہ بھونچک رہ گیا۔ اب اریک نے اپنا حال
بیان کیا۔ تو چارودت کو رشی کی پیشینگوئی یاد آگئی۔
اس نے اریک کو سینہ سے لگا لیا۔ اور اسکی بیڑیاں
کاٹکر اس سے کہا کہ وہ اب آزاد ہے۔ چوکیداروں سے
آنکھ بچا کر نکل جائے، اریک نے اس کا شکریہ ادا کیا
اور یہ ارادہ کر کے چل کھڑا ہوا۔ کہ سپاہی جمع کر کے
پالک کے راج کو تہس نہس کر ڈالے۔

ادھر سنس تھانک پیدل چلکر اپنے باغ میں
پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی پالکی ڈیوڑھی پر لگی
ہے۔ پہلے تو کہاروں پر برس پڑا۔ لیکن پردہ اٹھایا، تو
وسنت سینا نظر آئی۔ بس پھر کیا تھا باچھیں کھل گئیں۔
اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا، کہ اس نے ایسا دھکا
دیا کہ سنس تھانک چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا۔
اب وہ غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ اور وسنت سینا کو پالکی
سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ کہاروں کو رخصت کر کے
بیرحم بزدل نے اسے اس سنگدلی سے پیٹا، کہ وہ
بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس نے سمجھا کہ وہ مر گئی
ہے۔ کانپ اٹھا۔ چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا کہ
کوئی دیکھتا تو نہیں، جب کوئی نظر نہ آیا۔ تو ذرا جان میں
جان آئی۔ اِدھر اُدھر سے پتے اکٹھے کر کے وسنت سینا
کو ڈھانپا، اور دھوتی سنبھالتا ہوا بھاگ گیا۔

اتنے میں بدھ مت کا ایک سادھو ادھر آنکلا۔
اسے پتوں سے وسنت سینا کی ایک انگلی نظر آئی۔
اس نے جھٹ پتے ہٹائے، تو ایک خوبصورت عورت
کو زخموں سے چور اور بیہوش پایا۔ سادھو لپک کر گیا
اور ڈول میں پانی لا کر وسنت سینا کے منہ پر چھینٹے دئے۔
جھولی سے ہوا دی۔ بارے تھوڑی دیر کے بعد وسنت سینا
کو ہوش آیا۔ انہیں تو اس حال میں چھوڑ دیتے۔ اور
سنس تھانک کی کارستانی سنئے۔

جرم کو چھپانے کی روک تھام کر کے وہ
سیدھا عدالت میں پہنچا۔ اور چارودت پر وسنت سینا
کے قتل کا الزام لگایا۔ چارودت طلب ہوا اور اس نے

جرم سے انکار کیا۔ اس کے خلاف شہادت تو کچھ نہ تھی مگر سنس تھانک راجہ کا سالا تھا۔ اس کی بات کا مان رکھنا بھی ضرور تھا۔ پھر بھی ممکن تھا کہ جج اسے کچھ نہ کہتے۔ اور ٹال دیتے۔ لیکن عین اُس وقت میترا جھومتے ہُوئے وہاں آنکلے۔ یہ بدو شک ہیں۔ اور بہر انوتی بات ان سے بے اختیار سرزد ہوجاتی ہے۔ آپ دسنت سینا کے مکان کے پاس رہتے تھے۔ چارودت سے ملے۔ تو اُس نے کہا۔ بھائی گھر جا رہے ہو، تو ذرا یہ زیور لیتے جاؤ۔ دسنت سینا کو دے دینا۔ وہ میرے بچے کو کھیلنے کے لئے دے گئی تھی۔ اور میں زیادہ دیر تک انہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ انہیں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ پوٹ بغل میں دبائی اور چل پڑے۔ خیر سے آپ کو سیر تماشہ کا بہت شوق تھا۔ جہاں چند آدمی کھڑے دیکھے، وہیں ڈٹ گئے۔ اس طرح عدالت میں جمگھٹا دیکھا تو نہ رہا گیا۔ اور بیرے یار نے عدالت کے اندر جا کر دم لیا۔ عدالت کا نقشہ دیکھا، تو اوسان جاتے رہے۔ چارودت اور قتل کا الزام' اِدھر اُدھر پُوچھ گچھ شروع کی۔ حال معلوم ہوا تو ضبط کی تاب نہ رہی۔ آپے سے باہر ہو کر سنس تھانک کو بے نقط سُنانی شروع کیں۔ جوش میں آکر ایسے ہاتھ ہلائے کہ زیوروں کی پوٹ بغل سے نکل کر سامنے آرہی۔ سب نے شناخت کیا کہ یہ دسنت سینا کے زیور ہیں۔ اور چارودت کو بھی ماننا پڑا کہ اس نے یہ زیور میترا کو دیتے تھے۔ چونکہ چارودت برہمن تھا عدالت اسے موت کی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے بن باس کی سزا دی گئی۔ مگر راجہ پالک نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیکر اس کی موت کے حکم پر مہر کردی۔

چنڈال اسے شمشان بھومی میں لے گئے۔ اور اس کا سر تن سے جُدا کرنے کو تھے، کہ سادھو کا سہارا لئے ہُوئے دسنت سینا وہاں پہنچ گئی۔ اور ساری صورت بدل گئی، لوگ یہ دیکھ کر بہت بگڑے۔ اور چاہتے تھے کہ سنس تھانک کو خوب سزا دیں۔ مگر چارودت نے سب کو روکا اور اپنے دُشمن کو معاف کردیا۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ آدمیوں کا ایک بہت بڑا ہجوم شہر کی طرف سے آرہا ہے۔ اور اریک کے نام کے جیکارے آسمان کی خبر لا رہے ہیں۔ معلوم ہُوا کہ سرویلک کی مدد سے ایک نے پالک کو مار کر اجین پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اب وہی اس مُلک کا راجہ ہے سرویلک نے جو اس فوج کا سینا پتی تھا۔ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ چارودت آزاد کیا جاتا ہے۔ اور جو سزا اس کے لئے تجویز ہُوئی تھی، وہ اب

سنس تہانک برداشت کریگا۔ سنس تہانک کی ساری شیخی کرکری ہوچکی تھی۔ چارودت کے پاؤں پر گر پڑا۔ اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ چارودت نے کہہ سُنکر اسے معافی دلائی۔ اور وہ مجمع سے اس طرح غائب ہُوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اریک نے چارودت کو بدھ مت کی تمام خانقاہوں کا افسر مقرر کیا۔ اس کی شادی وسنت سینا سے ہوئی۔ اور سروبلک کو سیناپتی کا عہدہ ملا

محمد عمر
نورالٰہی

خیال آرائیاں

جہاں سے بیخبر اپنے جہان دل میں رہتے ہیں
کبھی خلوت میں رہتے ہیں کبھی محفل میں رہتے ہیں

وہ لیلائے محبت ہیں اسی محمل میں رہتے ہیں
ہماری آرزو بنکر ہمارے دل میں رہتے ہیں

جُدا ہیں مجھ سے وہ لیکن نہیں پھر بھی جُدا مجھ سے
مرا دِل اُن میں رہتا ہے وہ میرے دلمیں رہتے ہیں

نظر آتے ہیں وہ پھر بھی نظر آتے نہیں مجھ کو
عیاں ہوکر نہاں وہ کونسی منزل میں رہتے ہیں

تصوّر کی خیال آرائیاں دِل سے نہیں جاتیں
نکلکر تیری محفل سے تری محفل میں رہتے ہیں

جلال الدین اکبر

"شعر الہند" اور دکن

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اسطور ذیل "شعر الہند" کا کوئی جامع تبصرہ نہیں ہیں۔ ان کا مقصد ایک خاص نقطۂ نگاہ سے کتاب مذکور پر تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔ اور وہ نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ دکن میں اُردو کے جو دور گزرے ہیں، اُن کا تذکرہ کس صحت و جامعیت سے کیا گیا ہے۔ اُردو کے تذکرے بالعموم اس بارے میں ناقص پائے گئے ہیں۔ اسے مقامی تعصب کہئے یا عدم معلومات بہرحال اُنہوں نے دکن کے حق خدمت کو فراموش کر دیا ہے لیکن کچھ مدت سے دکن اپنے قدیم و جدید کارناموں کو پیش کر کے اپنے حقوق اہل علم سے تسلیم کرا رہا ہے چنانچہ اس سلسلے میں متعدد رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ انہی میں سے ایک کتاب "دکن میں اُردو" ہے، جس پر ہزار داستان کی کسی گزشتہ اشاعت میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس کے مؤلف نصیر الدین ہاشمی صاحب دکن میں اُردو کی تاریخ کے اختصاصیین میں سے ہیں، اور مندرجہ ذیل تبصرہ انہی نے ہمیں عنایت فرمایا ہے

مدیر

زبان اُردو پر مولانا شبلی مرحوم کا جسقدر احسان عظیم ہے، اتنا اور چند ہی اصحاب نے کیا ہے۔ مولانا نے جسقدر علمی مواد زبان اُردو کے خزانہ میں جمع کیا ہے اس سے آئندہ نسلیں مدتوں فیضیاب ہونگی۔

مولانا کے لائق جانشین مبارکباد کے قابل ہیں کہ اُنہوں نے دار المصنفین قائم کر کے اپنے قابل اُستاد کے نام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید کر دیا ہے۔

قلیل عرصہ میں دار المصنفین نے جسقدر اعلیٰ درجہ کی کتابیں ملک اور قوم کے سامنے پیش کی ہیں کسی اور انجمن نے باوجود کافی سرمایہ کے نہیں کیں۔

دار المصنفین کی تالیفات اور تصنیفات میں ہمیں نہ صرف تاریخ و سیر کی کتابیں نظر آتی ہیں، بلکہ فلسفہ و ادب اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ چنانچہ حال میں ایک کتاب شعر الہند شائع ہوئی ہے

جو اُردو علم ادب کا ایک خزانہ ہے۔ یہ کتاب سلسلہ تالیفات کی پچیسویں کڑی ہے۔ اور اس کے مؤلف مولانا عبد السلام صاحب ندوی ہیں۔ ذیل میں اس کتاب کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے مضامین سے آگاہی ہو جائے۔

یہ کتاب چار ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔

پہلے باب میں اردو شاعری کے آغاز پر بحث کی گئی ہے اس کے بعد قدما کا پہلا دور آتا ہے۔ جس میں دلی میں اُردو شاعری کے آغاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر قدما کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں اُردو شاعری کی تجدید اور اصلاح کا بیان ہے۔ اسی سلسلہ میں میرو مرزا (میر تقی اور مرزا سودا) کے کلام کا موازنہ اور مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قدما کا تیسرا دور آتا ہے۔ جسمیں "لکھنؤ میں شاعری کا آغاز" پر بحث کی گئی ہے اور مصحفی اور انشاء کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس بحث کے بعد تلامذہ شعراء قدیم کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ جس میں خان آرزو، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ مبارک آبرو۔ مصطفےٰ خاں یکرنگ۔ شرف الدین مضمون۔ شاہ حاتم۔ میر۔ سودا۔ میر درد۔ میر سوز۔ انشاء۔ میر حسن۔ جرأت۔ مصحفی۔ بقا۔ دیوانہ۔ ضیاء حزین۔ الہام۔ ندیم۔ فغاں۔ بیدار۔ حسرت۔ فقیر۔ اور قدرت کے (۹۱) شاگردوں کا نہایت مختصر ذکر ہے۔ اور ایک ایک دو دو شعر بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تبعین شعرائے قدیم کا عنوان آتا ہے۔ اس عنوان میں بتایا گیا ہے کہ کن کن شعراء نے کن کن شعراء کا تتبع کیا۔ اس کے خاتمہ پر باب اوّل ختم ہو جاتا ہے جو (۱۸۸) صفحوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں "متوسطین کا پہلا دور" شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا شیخ ناسخ سے ہوتی ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ کہ شیخ ناسخ نے کیا کیا تبدیلیاں کیں۔ اور اسی سلسلہ میں ایک آخری تبدیلی الفاظ کی تبدیلی ہے۔ جس کی ایک طویل فہرست "جلوہ خضر" سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کو "اُردو شاعری کے دو مختلف اسکول" کا عنوان ملیگا۔ جسمیں دلی اور لکھنؤ کے خصوصیات کلام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اور شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے بعد "اساتذہ دہلی" کا عنوان آتا ہے۔ جس میں اس دور کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اور شاہ نصیر۔ ذوق۔ غالب اور مومن کے علیحدہ علیحدہ رنگوں کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے ختم پر "متوسطین کا دوسرا دور" شروع ہوتا ہے۔ جس میں تلامذہ آتش و ناسخ پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے

کہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے بعد اُردو زبان اور اُردو شاعری کی اصلاح میں جو کمی رہ گئی تھی، اس کو اُن کے تلامذہ نے نہایت جامعیت کے ساتھ پُورا کیا۔ اسی سلسلہ میں آپ کو تلامذہ غالب۔ مومن کا بیان بھی ملیگا۔ جو شیفتہ۔ ذکی۔ مجروح۔ حالی۔ انور۔ کے مختصر کلام پر مشتمل ہے۔ اب دوسرا باب جو (۹۹) صفحات میں ہے ختم ہو جاتا ہے۔ اور تیسرے باب کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس میں "متاخرین کا پہلا دور اور ریاست رام پور" کا عنوان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ غدر کے بعد نواب یوسف علیخاں اور کلب علیخاں کی قدردانیوں نے رام پور کو اساتذہ لکھنؤ اور دہلی، دونوں کی شاعری کا مرکز بنا دیا۔ اور ان کی فیاضانہ کشش نے مومن۔ غالب۔ داغ اسیر۔ امیر۔ منیر۔ بحر۔ خلق۔ تسلیم۔ ضیاء اور جلال وغیرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں داغ اور امیر کا موازنہ بھی درج ہے۔ اس کے بعد "متاخرین کا دوسرا دور" شروع ہوتا ہے۔ اس میں تلامذہ داغ اور امیر کا بیان ہوا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ رام پور میں دلّی اور لکھنؤ کی شاعری کے اختلاط نے جو نیا رنگ پیدا کر دیا تھا، اس کو ان لوگوں نے اور بھی چمکا دیا۔ اس بیان پر تیسرا دور خود (۷۰) صفحوں میں ہے۔ ختم ہوتا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان "دورِ جدید" ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے ہمارے شعرا کے سامنے کیا کیا اصلاحی مطالبات پیش کئے۔ اور "مقدمہ حالی" سے یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اُردو شاعری کے متعلق مولانا نے کیا کیا اصلاحی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اور پھر مولانا کی شاعری کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد حسرت موہانی۔ وفا رامپوری۔ شوکت علی فانی۔ محمد علی جوہر۔ اصغر حسین اصغر۔ علی محمد شاد۔ عزیز لکھنوی۔ شبیر حسین جوش کا کلام نمونۃً پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد وطنی شاعری۔ اخلاقی شاعری۔ سیاسی شاعری۔ نیچرل شاعری۔ مناظر قدرت۔ وصف نگاری۔ ظریفانہ شاعری۔ قومی شاعری۔ تاریخی شاعری کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں حالی شبلی۔ اقبال۔ اکبر۔ محمد اسمٰعیل وغیرہ کا کلام پیش کیا گیا ہے۔

اخیر میں "متفرق نظموں" کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ جس میں انگریزی نظموں کے ترجموں کا ذکر ہے اس طرح یہ باب (۸۶) صفحوں پر ختم ہوتا ہے۔

کتاب کے مضامین و مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب میں نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ آیا فاضل مؤلف نے "تذکرہ نویسوں کے عام قاعدے کے مطابق دکن کی ادبی خدمات کو نظر انداز کر دیا ہے یا جیسا کہ چاہیے تھا اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے دکن کے حقوق ادا کرنے سے دریغ کیا ہے۔ تاہم دکن کے متعلق اُنھوں نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں، اُن میں بعض فروگزاشتیں ہیں، اور بعض کمیاں رہ گئی ہیں۔ جن کو میں ذیل میں مختصراً بیان کرتا ہوں:-

(۱) دیباچہ میں مولانا نے اُردو کے تذکروں کی فہرست دی ہے۔ اور اُس میں گارسن ڈی ٹاسی اور چند دیگر تذکروں کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس میں تذکرہ لالہ لچھمی نارائن صاحب شفیق موسوم "چمنستانِ شعراء" اور "تذکرہ موسوی خاں کا نام نہیں ہے۔ حالانکہ یہ تذکرے جو ۱۱۷۵ھ اور ۱۱۹۴ھ میں مرتب ہوئے، نہایت قابلِ قدر ہیں۔ ان سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے، کہ دکنیوں نے شمالی ہند کے نامور شعراء کا تذکرہ کس خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

(۲) اُردو شاعری کے آغاز کو بالکل مختصر طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔ جو ناکافی اور تشنہ ہے۔ ابتدائی شاعری جو دکن سے وابستہ ہے اس کے متعلق قابل مؤلف نے اوّل تو کچھ نہیں لکھا ہے۔ اور جو لکھا ہے وہ تحقیق اور وسعتِ معلومات پر مبنی نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً:-

(الف) لکھتے ہیں کہ" سلطان قلی کے مجموعہ کلام کو دیوان سے موسوم کیا گیا ہے۔" اس جملے سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ دراصل یہ دیوان نہیں ہے۔ حالانکہ سلطان قلی کا مجموعۂ کلام بالکل اسی طرح مرتب ہوا ہے۔ جس طرح آجکل کے کلیات اور دیوان مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں اصنافِ سخن سے مثنویاں۔ غزل۔ قصیدے۔ رباعیات وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ باوجود اس کے اس کو دیوان نہ کہنا خالی از تعجب نہیں۔

(ب) "غواصی نے طوطی نامہ بخشی کو نظم کیا جس کا ایک مصرع ہندی اور ایک مصرع فارسی تھا۔" حالانکہ یہ کتاب ایسی نہیں بلکہ فارسی آمیز ہندی نظم ہے۔

(ج) اسی طرح "مثنوی من لگن" کا ذکر بالکل سرسری طور پر کیا گیا ہے اس مثنوی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عالمگیر کے مُنہ پر اس کی کلی حقیقت بیان کر دی گئی ہے۔ اور اس کے کیریکٹر کا صاف صاف

ذکر کیا گیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں

دیندار دلیر ہور دانا
یک علم نہ سب منتے سیانا

خود رائی اور بے اعتباری کے متعلق فرماتے ہیں۔

اب لگ تو کسی نہ رائے پوچھا
بن آپ نہ کسی پر ائے پوچھا
جے فکر میں معنی اپنی آنے
بے فکر اُسے ظہوری لیا سنے

(۵) " اُردو شاعری کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا۔ اور ولی کے زمانہ تک مذہبی خیالات شاعری کا جزوِ غالب رہے۔ اس لئے معاصرین ولی نے جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ مناجات اور مناقب وغیرہ پر مشتمل تھا۔"

یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ولی سے بہت پہلے ہمیں ایسا کلام نظر آتا ہے۔ جو مناظر قدرت۔ واقعات روزمرہ تاریخی نظم۔ اخلاقی نظم وغیرہ پر مشتمل ہے۔ نصرتی۔ نشاطی۔ غواصی۔ قطب شاہ۔ وجدی نوری۔ شیدا۔ مومن وغیرہ کی مثنویوں اور کلام سے اس کا بخوبی ثبوت مل سکتا ہے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے نمونے متروک کئے گئے۔

(۳) " اردو کا مکمل خاکہ عالمگیر کے زمانہ میں تیار ہوا لیکن اس کی داغ بیل عالمگیر کے زمانے سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔" صلا

یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ مکمل خاکہ بھی عالمگیر سے پہلے تیار ہو چکا تھا۔ دکن میں عالمگیر سے پہلے بیسیوں شاعر مثلاً سعدی۔ وجدی۔ نشاطی غواصی احمد جنیدی۔ شاہی مرزا۔ شغور۔ نوری۔ نصرتی۔ ہاشمی وغیرہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار کی زینت بنے ہوئے تھے۔ سخن فہم بادشاہ۔ قطب شاہ۔ عبداللہ وغیرہ خود بھی باکمال شاعر تھے۔ شعرا کی مثنویاں قصیدے غزل اور مرثیے ترجیع بند اور رباعیاں آجتک محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ بیجاپور کی سرکاری زبان ۹۶۵ھ میں دکنی ہو گئی تھی۔ اس لئے یہ کہنا کہ عالمگیر کے عہد میں اُردو کا مکمل خاکہ تیار ہوا درست نہیں ہو سکتا۔

(۴) جہانگیر کے زمانہ میں ملا نوری ایک شاعر تھے۔ جو اگرچہ عام طور پر فارسی زبان میں شعر کہتے تھے لیکن ان کے قلم سے ایک آدھ مصرع اُردو کے بھی نکل گئے ہیں:۔ مثلاً

ہر کس کہ جنابت کند البتہ بترسد
بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

جہانتک میرا خیال ہے یہ نوری بیجاپوری ہیں جن کا نام شجاع الدین نوری تھا۔ جنہوں نے مرثیہ گوئی

کی ابتدا کی تھی۔ اور اپنے وقت کے اُستادِ فن تسلیم کئے گئے تھے۔ اکبر کے عہد میں موجود تھے۔ ابوالفضل اور فیضی کا ساتھ رہا۔ نوری کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :-

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا
و لے سب تعصب دیا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا
وہم مرثیے سے بہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعا
وہم تک احوال پورا لکھا
میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا
عجب حال عاشور خانہ میں تھا
جن و انس کرتے تھے سب واہ وا
کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
اماماں سے اس کا ملے گا صلہ
کہ نوری ہی موجد تو اس طرز کا[5]

(۵) وَلی کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وَلی جب تک دکن میں رہے اُن کا کلام بھی مضمون اور زبان دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ قابلِ اصلاح تھا۔ اس لئے جب وہ دہلی آکر شاہ سعداللہ گلشن سے ملے اور اُن کو اپنے اشعار سُناتے، تو اُنہوں نے ان کو اس طرف توجہ دلائی ص۲۶

مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دہلی آنے سے پہلے ان کا کل کلام قابلِ اصلاح تھا کیونکہ وہ جب دہلی آئے تو اُن کے ساتھ ان کا دیوان[5] موجود تھا۔ اگر ان کا یہ دیوان ہمیں دستیاب ہوتا اور اس میں ان کا تمام کلام اسی طرح قابلِ اصلاح ہوتا تو یہ دعوے صحیح ہو سکتا ہے۔ صرف سعداللہ گلشن کے توجہ دلانے پر اس امر کا یقین کر لینا کہ ان کا پہلا تمام کلام قابلِ اصلاح تھا۔ غالباً صحیح نہ ہوگا۔ وَلی جس وقت دہلی گئے ہیں وہ کہنہ مشق شاعر ہو چکے تھے۔

(۶) دہلی۔ لکھنؤ اور رامپور یہاں تک کہ عظیم آباد میں شاعری نے جو کچھ ترقی کی اور وہاں کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (صفحہ ۲۸۰ و ۲۸۱) مگر حیدرآباد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حیدرآباد نے اُردو علم ادب کی جو جو خدمت انجام دی ہے۔ وہ اُردو کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھی جانی چاہیئے

ایک زمانہ وہ تھا جبکہ یہاں کی مسند وزارت پر چندو لال شاگرد شاہ نصیر جیسے سخن فہم سخن سنج متمکن تھے۔ جن کے دربار میں کئی ایک مشہور اور نامور شعراء

---

[5] داستانِ اردو از خواب خیال

[5] آبحیات

کا جمگٹا تھا۔ شاہ نصیر بار بار یہاں آتے تھے۔ آخر یہیں مرے۔ چندولال کے درباری شعرا میں ایک حفیظ تھے جن کے متعلق شہیدی مرحوم کا خیال تھا۔ کہ مبصران سخن کے نزدیک آجکل (اس زمانہ میں) فن شعر میں صرف تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں شیخ حفیظ دکن میں اور شیخ ذوق دہلی میں۔

حفیظ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

چاک سینہ ہوگیا دل سے صدا آنے لگی
کھلتے ہی اس در کے جنت کی ہوا آنے لگی

ہمارے دل میں درد والم کا جوش رہا
کہ سینہ داغوں سے دوکان گل فروش رہا

لب جاناں سے جی اداس رہا
ہم کو آب بقا نہ راس آیا

خود مہاراجہ کہنہ مشق قادر الکلام باکمال شاعر تھے۔ کلام کی رنگینی انداز کی جدت، بیان کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے اعلیٰ شاہد ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

جامۂ یار کو کیا جامہ گل سمجھا ہے
خار کی طرح سے تو دامن دلدار نہ کھینچ

سلف دیوان ذوق

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسے کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

پردۂ چشم اٹھا دیدہ تحقیق سے دیکھ
جب یگانہ وہ ہوا کوئی نہیں بیگانہ

ہمیں کیا کام ہے دونوں جہاں سے
ترا ملنا ہمارا مدعا ہے

ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے کئی ایک باکمال آسمان شہرت پر آفتاب ہوکر چمکے۔ مگر تعجب ہے کہ شعرالہند میں ہمیں سوائے ولی اور سراج کے سرسری ذکر کے کسی کا کلام نہیں ملتا۔ اور خود ولی اور سراج کے بھی جو اقلیم سخن کے بادشاہ تھے۔ بالکل مختصر بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

چند باکمالوں کے نام اور ایک ایک دو دو شعر مثال کے طور پر درج کئے جاتے ہیں:۔

فقراللہ آزاد جو ولی کے ہمعصر تھے:۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

داؤد متوفی ۱۱۶۸ھ

تاریخ زبان اردو مولفہ حکیم شمس اللہ صاحب قادری

اس صنم کے خیال ابرو نے
ناتواں مجھ کو جوں ہلال کیا

چاندنی کی سیر کو کس طرح نکلے وہ صنم
دیکھنے کا تماشا آفتاب آتا نہیں[۱]

موزوں برہان پور کے قلعہ دار تھے

موزوں نے راہِ عشق میں پھر اب قدم رکھا
ہے مصلحت سے دور نہ جانے کرے گا کیا[۲]

محو

تم ہر کسی سے وعدہ دیدار مت کرو
اپنی زباں سے جھوٹ تم اقرار مت کرو[۳]

شاہ تجلی علی تجلی متوفی ۱۲۱۵ھ ۔ آپ کی شاعری میں واقعہ نگاری کے بہتر سے بہتر نمونے نظر آتے ہیں آپ کا کلام بلحاظ بندش و طرز ادا اور بلحاظ فارسیت[۴] اور گوئی اپنا آپ نظیر ہے:۔

یہ جو عمر سب سے عزیز تھی ترے امتحان میں صرف کی
نہ تو تیغ تیری کبھو چلی نہ یہ سر ہی تن سے جدا ہوا

عاشق نے ہجر یار کی مہمانی کی تھی رات
نان و نمک سے داغ کے سینہ سماط تھا

جنوں میں میری صحبت کو ہر اک دلگیر تر سے ہے
دل باشندگانِ خانۂ زنجیر تر سے ہے

گر یونہی جنوں دست بداماں رہے گا
دامن ہی رہے گا نہ گریباں رہے گا[۵]

شیر محمد خاں ایمان متوفی ۱۲۲۱ھ

سرمہ گر ابرو سے اپنی وہ خوش ابرو پونچھے
گرد خجلت کو سدا دیدۂ آہو پونچھے
آستیں کا ئیں کسو کی نہ ہوا دست نگر
میرے ہی ہاتھوں نے آخر میرے آنسو پونچھے[۶]

فیض متوفی ۱۲۸۲ھ جن کے دامن فیض سے صدہا اشخاص فیضیاب ہوئے۔

کفر جو تھا دین میرا ہو گیا
بت ہی نصیبوں سے خدا ہو گیا

تقاضا دبت کا مگر فیض ان سے
خدا سے کوئی خوں بہا چاہتا ہے

اُڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں ہیں نے
مگر نہ قبضہ میں دامانِ آرزو آیا!

---

[۱] تاریخ زبان اردو مؤلفہ حکیم شمس اللہ قادری [۲] و [۳] داستان اردو [۴] دیوان تجلی قلمی [۵] گلزار آصفی

نہ کر اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار
ابھی اے فیض مر مر کے جیا ہوں[1]

میر احمد علی عصر، شاگرد فیض

کام کب تدبیر سے ہو جب نہ ہو تقدیر میں
طالع بیدار میرا رات بھر سویا کیا

غریق بحر محبت ہوں عصر بعد فنا
گرا نہ لاش بھی اپنا کچھار کے باہر

مدفن میرا میرے لئے گلزار بن گیا
زیر زمیں بھی چین سے ہوں میں مزار میں

گل کر دیا چراغ منا بجھا دیا
میری طرف سے اس کو کسی نے لگا دیا[2]

غرض اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دکن میں بھی ایسے باکمال موجود تھے جن کا تذکرہ شعرالہند میں ضروری تھا۔ اگر ان کی مزید صراحت کی ضرورت ہو تو ناچیز کی تالیف "دکن میں اردو" ملاحظہ فرمائیے۔

(۷) تلامذہ داغ اور امیر کا خاص عنوان بھی مقرر کیا گیا ہے صفحہ ۴۲۳ امیر اپنی زندگی کے آخری حصہ میں اور داغ ایک عرصہ تک حیدرآباد میں مقیم رہے جس کے باعث یہاں کئی ایک نامور شاگرد ہوتے مگر افسوس ہے کہ شعرالہند کے صفحات میں کسی کا نام نظر نہیں آتا داغ کے شاگردوں میں حضرت آصف کیفی، مزاج وغیرہ ایسے افراد ہیں جن کا کلام مشہور زمانہ ہے۔ اسی طرح امیر کے شاگرد مولوی عبدالواسع صفا اور اختر وغیرہ ہیں۔

یہ موقع نہیں کہ ان اصحاب کے کلام پیش کئے جاویں مگر بطور نمونہ ایک ایک دو دو شعر لکھے جاتے ہیں

حضرت آصف

واہ اے شان کریمی ترے صدقے قربان
جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا

یہ شب وصل ان کو حسرت ہے
شام ہوتے ہی کیوں سحر نہ ہوئی

مقابل یوں ملے جب حسن کی داد
ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہات

---

[1] دیوان فیض [2] دیوان عصر قلمی

واہ واہ دزد حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصفؔ
وہ شاہ حسن سہی شہر یار ہم بھی ہیں

کیفیؔ مرحوم :-

نہ یہ سر محتسب کا ہے نہ یہ رندوں کا ساغر ہے
یہ میرے دل کا چھالا ہے نہ پھوٹا ہے نہ پھوٹے گا

نزاکت کا بُرا ہو وہ سنورنے بھی نہیں پاتے
بڑی مشکل سے زلفِ عنبریں تک شانہ آتا ہے

مار ڈالا مار ڈالا لٹ گئے ہم لٹ گئے
تان لے پھر تان لے مُنہ پر دوپٹہ تان لے

وہی کیفیؔ وہی رستہ ہے آندھی ہو کہ بارش ہو
چلے آتے ہیں حضرت میکدے سے ایک ہی کن پر

محبت کے ہزاروں لطف کھوئے ناتوانی نے
تڑپنے کے ہیں سب ساماں مگر تڑپا نہیں جاتا

مزاج :-

وہاں عرض تمنّا پر بھی رُکتی ہے زباں میری
زبانِ خامشی تو ہی سُنا دے داستاں میری

تمنّا مجھ پہ ہنستی ہے وہ ناکام تمنّا ہوں
حقیقت ہے عزیزو عبرت آموز جہاں میری

جب اپنوں کی یہ حالت ہو تو غیروں کی شکایت کیا
یہ دل ہے مدعی میرا یہ دشمن ہے زباں میری

ہیں مرنے کے لئے جیتا ہوں جینے پر نہیں مرتا
سُنا اہل ہوس یہ ہے حیاتِ جاوداں میری

---

(۸) چوتھے باب میں دورِ جدید کو بیان کیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی اسی طرح حیدرآباد کے حقوق فراموش کردیئے گئے ہیں۔ شادؔ کی صوفیانہ غزلیں۔ کیفیؔ کی اخلاقی اور قومی نظمیں۔ امجدؔ کی رباعیات اور نظمیں ذہنؔ کی اخلاقی نظمیں یہ سب خاص طور پر ذکر کے قابل تھیں مضمون کی طوالت کے خوف سے ان کی مثالوں کو نظرانداز کرتا ہوں۔ دورِ جدید میں ان لوگوں نے جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے اس کا کامل ثبوت "دکن میں اُردو" سے مل سکتا ہے۔

(۹) انگریزی نظموں کے ترجموں میں مولانا نظم طباطبائی کا خاص درجہ ہے۔ مثلاً "گورِ غریباں" وغیرہ۔ اس کا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔

غرض اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں۔

بہرحال اگر ان فروگزاشتوں سے قطع نظر کریں جو کتاب کی کامل کامیابی میں حائل ہیں، تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب تک اُردو کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں اُن میں یہ تذکرہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور اُن سے کہیں زیادہ معلومات و تحقیقات پر حاوی ہے۔ خاص طور پر یہ امر غنیمت ہے کہ اس کے مؤلف نے دکن کو قابلِ لحاظ سمجھا۔ اور اگرچہ اُسے اُردو کی تاریخ میں وہ مستقل درجہ نہیں دیا۔ جس کا وہ اپنی کارگزاریوں کے لحاظ سے مستحق ہے۔ اور اس کا ذکر اس شرح و بسط سے نہیں کیا۔ جس کی اُردو کی ایک مجموعی تاریخ سے توقع ہونی چاہیئے تھی تاہم اسکے ذکر کو اس قابل سمجھا۔ کہ اس کتاب میں شامل کیا۔

ابھی دیکھئے وہ دن کب آتا ہے۔ جب دکن کے حقوق پورے طور پر تسلیم کئے جائیں گے۔ بہرحال آثار موافق حال ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

کیفیات

نغمۂ عشق سے رنگیں ہے یہ اے مطرب
سحر کاری جو ترے ساز کی آواز میں ہے

آپ کے ناز سے ہے رونقِ شادابیِ عشق
دلنوازی کی ادا آپ کے ہر ناز میں ہے

بجلیاں ٹوٹ پڑیں خرمنِ ہستی پہ مرے
عشقِ بیتاب کا انجام بھی آغاز میں ہے

حسن کا پردۂ رنگیں نہ اُٹھا ہے نہ اُٹھے
دلِ حیرت زدہ کیوں جستجوئے راز میں ہے

سعادت منہاس

دِل

(ذیل کی معنی خیز نظم جس کا تعارف میں بر سبیلِ اختصار ان الفاظ میں کرا سکتا ہوں، کہ یہ حدیث دل کی ایک تفسیر ہے جو ایک فلسفیانہ دماغ نے کی ہے ہمارے دوست پنڈت رشی رام صاحب بی اے کی طبعِ رسا کا نتیجہ ہے، جو محفلِ ہزار داستان میں آج پہلی مرتبہ شریک ہوئے ہیں)

مُدیر

رہینِ منتِ افسونِ اضطراب ہے تُو
کہ دل نہیں ہے مُقدر کا پیچ و تاب ہے تُو

ہے تجھ میں جلوۂ خورشیدِ معرفت روشن
کہ آسمانِ حقیقت کا ماہتاب ہے تُو

جہاں میں تُو کوئی منظر ہے یا ہے محوِ نظر
حجاب پوش ہے کوئی نہ خود حجاب ہے تُو

سوا ترے کوئی کیا ہوگا ترجماں تیرا
جو اپنی آپ ہی تعبیر ہے وہ خواب ہے تُو

نہیں ہے قیدیٔ کون و مکاں وجود ترا
کہ طفل و پیر میں گہوارۂ شباب ہے تُو

فراقِ بحر میں ہر دم ہے یہ تڑپ تیری
اسیرِ سینۂ صحرا کوئی حباب ہے تُو

نصیبِ گوشِ معانی ہیں سب سرود ترے
خموش جس کے ترنم ہیں وہ رباب ہے تُو

کھلی ہے نیند میں تو چشمِ خوابناک کوئی
چھپا ہے ذرہ میں یا مہرِ تابناک کوئی

جگر کو تشنۂ اُلفت بنا دیا تُو نے
جہاں میں حُسن کا رُتبہ بڑھا دیا تُو نے

کوئی ایاز سے پُوچھے تری فسوں سازی
کہ غزنوی کو بھی نیچا دکھا دیا تُو نے

کسی کی دم سے ترے مشکلیں تمام ہوئیں
کسی کو دامِ بلا میں پھنسا دیا تُو نے

چمن میں پھول پہ ہے عندلیب گرمِ فغاں
یہ رازِ عشق اسے کیا بتا دیا تُو نے

نہ تاج و تخت، نہ دُنیا، نہ عزت و ناموس
مٹا جو تیرے لئے اُس کو کیا دیا تُو نے

بنا جو دہر میں منصور ترجماں تیرا		تو خوب عشق کا اس کو صلا دیا تو نے
طوافِ شمع میں پروانے کی وہ بیتابی		تپش کا شیوہ اسے کیا سکھا دیا تو نے

ہیں حسن و عشق کے افسانے سرگزشت تری
مجھے خوب کہانی ہیں کوہ و دشت تری

تباہیِ غمِ اُلفت کا ترجماں تو ہے		ہلاکِ عشق کی پُر درد داستاں تو ہے
جفا کا شیوہ حسینوں میں ذات سے تیری		حریم سینۂ محبوب میں نہاں تو ہے
گرے نہ برقِ نظر بار بار کیوں تجھ پر		کہ عندلیب محبت کا آشیاں تو ہے
تجھے ہماری، تری کس کو آزمائش ہے؟		خود امتحان ہے یا وقفِ امتحاں تو ہے
ہے تیرے قبضے میں مُلکِ عدم جہانِ وجود		کہ سرزمین تصوّر کا آسماں تو ہے
ہے ایک قطرۂ خون تنگنا ئے پہلو میں		نظر میں دیکھنے والوں کی بیکراں تو ہے

لگی ہے ایک ہی دھن آہ! صبح و شام مجھے
نہیں سوائے تڑپنے کے کوئی کام مجھے

ریاضِ دہر میں اے دل! ہے گل بھی خار بھی تو		چمن بھی بادِ خزاں بھی تو نو بہار بھی تو
تری کمین میں تیرے سوا نہیں کوئی		کماں بھی، تیر بھی، صیاد بھی شکار بھی تو
نہیں ہے غیر کا محتاج دیکھ! جام ترا		شراب تو ہے، سبو تو ہے، میگسار بھی تو
عیاں ہے عقل پہ، مستور چشمِ ظاہر سے		وہ راز ہے کہ ہے پنہاں بھی، آشکار بھی تو
ہے اپنے ہاتھوں ہی نالاں تو آپ دنیا میں		ستم زدہ بھی، ستم بھی، ستم شعار بھی تو
ترے طفیل ہے سب کاروبارِ دنیا کا		کہ نقدِ دل بھی ہے تو، جانِ مستعار بھی تو

ہے بدرِ اوجِ حقیقت کا تو ہلال نہیں
ترے کمال کو اندیشۂ زوال نہیں

رشی رام

گناہ کا بانکپن

(۱)

بجلی کے نہایت احتیاط سے چھپائے ہوئے قمقمے نشست گاہ میں ہلکی سی روشنی کا تموج پیدا کر رہے تھے۔ لیکن ہال دفورِ نور سے خود چکا چوند بن کر رہ گیا تھا۔ فرش کا سنگ مرمر اور سنگ سیاہ تناسب کے ایک عجیب انداز میں چمک رہا تھا۔ اور اس لبریز نور فضا میں نسوانیت تناسب کے ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ کیونکہ صفتِ جمیل کے بہت سے افراد مختلف النوع رنگین پیراہنوں میں ملبوس موسم بہار کی تیتریوں کی طرح بیباک اور شاداں مصروف خرام تھے۔ یا بیٹھے ہوئے اس کارِ لطیف میں مصروف تھے جسے بدتمیز اور بدتہذیب مرد گفتگوئے لایعنی سے تعبیر کرکے دنیا میں سے شیریں آواز کو کم کر دینا چاہتے ہیں معدوم کر دینا چاہتے ہیں۔

تسلیم کہ صنفِ جمیل کی گفتگو کا اکثر حصّہ مفید نہیں ہوتا۔ لیکن کسقدر لغو خیال ہے کہ ہر غیر مفید چیز کا معدوم ہو جانا انسب ہے۔ آخر دُنیا میں کتنی مفید اشیا ہیں جن کی ضدوں سے ہم پرہیز کرتے ہیں اگر افادے کا معیار ہمیشہ وہی ہے جس کے پیمانے سے صنفِ جمیل کی گفتگو کو ناپا جاتا ہے، تو یقیناً مردوں کے اکثر و بیشتر افعال غیر مفید قرار پائینگے۔ لیکن میں اسکے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ مجھے خوف ہے کہ رسالوں کے مدیر خاصکر مکرمی یوسف مجھے حقوق نسواں

کا بیجا حامی سمجھ کر اپنی صنف سے دغا کرنے والا کے خطاب سے سرفراز فرمائینگے۔ اور ظاہر ہے کہ تمام خطاب سوائے ان خطابوں کے جو رسالوں کے مدیر اپنے لئے وضع کریں، واہیات ہوتے ہیں۔

بیگم حمید نے آج "انجمن نرگسیں" کے تمام ارکان کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ تاکہ بیگم اس مسرتِ متحیر کا اظہار کر سکے۔ جو اُسے اسقدر جلیل القدر انجمن کا رکن بننے سے حاصل ہُوئی تھی۔ "انجمن نرگسین کے قوانینِ اساسی میں سے ایک قانون یہ بھی تھا کہ ہر وہ رُکن جو "صنفِ کرخت" سے تعلق رکھتا ہو۔ اپنے نصف بہتر کو انجمن میں ہمراہ لایا کرے۔ یہ قانون اسقدر جاذبِ نظر نہیں تھا جسقدر یہ قانون کہ "صنفِ لطیف" کے ہر اس فرد کے لئے جو انجمن کا رکن بنایا جائے، ضروری ہوگا کہ وہ پردے کی قیودِ بے معنی سے آزاد ہو۔ اسی لئے آج ہال میں جسقدر افراد "صنفِ لطیف" کے موجود تھے۔ تمام کے انداز میں تہذیب کی وہ عریاں شادابی جھلک رہی تھی۔ جو اس پردے کو شکست دینے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس کے قیام کے تفکّر میں ہمارے ادب کے دورِ تغیّر کا سب سے بڑا شاعر اس بے پناہ طنز کو شعر کا جامہ پہنا گیا ہے کہ ؎

حمایت پردے کی ہیں نے تو کی تھی خوش مزاجی سے
مجھے دلوا رہے ہیں گالیاں وہ اپنی باجی سے

اور بھلا کون ایسا تھا جو بیگم حمید کے مدعو کرنے پر نہ آجاتا۔ وہ بیگم جس کے لب ہر وقت مُسکراتے ہُوئے اس کی آنکھوں کی سنجیدگی کا بطلان کرتے تھے اور جس کے ابرو کسی ماہر نقاشی کی پنسل کے خفیف تاثرات معلوم ہوتے تھے۔ جس کی پیشانی پُر سکون سطحِ آب کی طرح شفاف اور بے داغ تھی۔ جس کے رخساروں کا گلابی رنگ چغتائی کی رنگ آمیزی کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اور جس کی طبیعت سجّاد حیدر کی تراکیب الفاظ کی طرح شگفتہ اور شاداب تھی۔

بیگم حمید مہمانوں کی آؤ بھگت میں ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک مسلسل حرکت میں مصروف تھی، اور اس کا دماغ اس وقت مختلف تفکّرات کے بیّن بیّن کام کر رہا تھا۔ ایک تو اس فرضِ منصبی کو ادا کرنے کے لئے جس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ دوسرے ایسے شخص کی بھانپ میں جس کو مدعو نہ کیا گیا ہو۔ کیونکہ ظاہر تھا کہ ایسے موقعہ پر جہاں بیگم حمید سی میزبان کے علاوہ معاشری اور ادبی مشاہیر جمع ہُوں، وہاں اُس طلائی بدصورتی ایک نہایت قیمتی مجموعہ موجود ہوگا۔ جسے عرفِ عام

میں سونا کہتے ہیں۔ علاوہ سونے کے زیورات کے، جواہرات اس کثرت سے مرتعش نظر آرہے تھے۔ گویا کانچ کے ٹکڑے اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک طرف تو بیگم حمید کا دماغ مہمانوں کے لئے خوش آیند تراکیب وضع کرنے میں مصروف تھا۔ اور دوسری طرف کوئی ایسی تدابیر منضبط کرنے کے لیے بیتاب تھا۔ جسے ہر نووارد کو پہچان کر اس کی طرف سے تسلّی کیجا سکے۔ ہرچند کہ دربان کو ہدایاتِ قطعی کر دی گئی تھیں۔ کہ کوئی شخص دعوتی رقعے کے بغیر اندر نہیں آسکتا۔ لیکن اتفاقات سے بے نیاز رہنا صرف بیوقوفوں یا شاعروں کا شیوہ ہے۔ اور بفضلِ خدا بیگم حمید کو دونوں لطیف گروہوں میں سے کسی ایک سے بھی تعلق رکھنے کا فخر حاصل نہ تھا۔

اسی دوران میں منور لال وزیر تعلیم تشریف لائے۔ اور بیگم کو ان کے لئے بالکل جدید الفاظ استقبال کا استعمال کرنا پڑا۔ ان الفاظ کے متعلق تدبر کرتے ہوئے اپنے دروازے میں سے اس شخص کو آتے ہوئے نہیں دیکھا، جسے "گلیوں کا بانکا" کہا جاتا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اور اس کی ناک نہایت مکروہ طور پر ایک طرف کو مڑی ہوئی تھی۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اور غالباً اس منظر" رنگین نقش" میں وہ کسی خاص نقش کا متلاشی تھا۔ کیونکہ ایک کونے کی طرف غور سے دیکھ کر وہ اس طرف اس طرح بڑھا جس طرح جلّاد مجرم کی طرف بڑھتا ہے۔ اور اسکے قدم اس انداز سے پڑ رہے تھے۔ گویا استقلال کی ایک دنیا اس کے پاؤں کی چاپ میں گونج رہی ہے۔ ہال کے گوشۂ مقصود کے پاس جاکر وہ رُک گیا۔ اور پھر اُس نے اپنا ہاتھ اس طریق سے چھاتی پر رکھا جس طرح بغاوت سے پہلے امرا کا طبقہ کسی حسین چھبیلی نازنین کو دیکھ کر رکھا کرتا تھا۔ اور وہ جھکا۔ اس طرح جھکا جس طرح ایک نوجوان درخت باد تند کے سامنے جھک جاتا ہے۔ گویا اپنی شکست کا اعتراف کر رہا ہے۔

اور یہ تمام حرکتیں وہ ایک عورت کے سامنے کر رہا تھا۔

وہ بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی۔ مور کے پروں کا بنا ہوا پنکھا، جس کی ہر لطیف جنبش کیساتھ گہرے رنگوں کی ایک جھلک پیدا ہوتی تھی۔ اور اس کی ساری میں گلے کے قریب ایک ہیرا چمک رہا تھا۔ اس کے بالوں میں دو پھول گندھے ہوئے تھے۔ اور ان پر عطر چھڑکا گیا تھا۔ کیونکہ خوشبو ایک آوارہ سی کیفیت سے نکلکر قرب وجوار کی فضا کو معنبر کر رہی تھی

وہ رسمی تہذیب کے ہر اصول کی پابندی میں مُسکرا رہی تھی اور پنکھا جھل رہی تھی۔ پنکھا جھل رہی تھی، اور مُسکرا رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں مخمل کی ایک گرگابی تھی۔ بالکل سیاہ رنگ کی۔ اور اس انداز سے پہنی گئی تھی، جس طرح الف لیلہ کی شہزادیاں پہنتی ہونگیں۔

گلیوں کا بانکا اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے کہا۔ "کشور میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔"

اس کا لہجہ طنز سے لبریز تھا۔ اس کی آنکھیں مذاقیہ انداز میں ہنس رہی تھیں۔ لیکن اُس کے بیٹھنے کا انداز اور بات کہکر چپ ہو جانے کا طریقہ اس طرح کا تھا۔ کہ کسی کو شبہ نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ دونوں کسی لفظی جنگ میں مصروف ہیں۔

اور کشور نے بظاہر مُسکرا کر جوابدیا۔ "شکریہ"

لیکن اس کی آنکھوں میں پریشانی اور بے بسی ایک مذبوح سی حالت میں مرتعش تھیں۔ اور اس کی پیشانی پر پسینے کا ایک قطرہ نمودار تھا۔ اُس نے پنکھا جھلتے جھلتے پنکھے ہی کی آڑ کر لی۔ اور اس قطرے کو ریشمی رومال کی سلوٹوں نے اپنے آغوش میں لے لیا۔

"میرا خیال تھا کہ صرف مجھے یہ تفاخر حاصل ہے کہ میں بغیر دعوتی رقعے کے اندر پہنچ سکا ہوں لیکن "پیر شو بیاموز" میں اپنی شکستِ غرور کا اعتراف کرتا ہوں۔"

اور یہ فقرہ بھی مُسکرا کے کہا گیا۔

کشور بھی جواب میں مُسکرائی۔ لیکن اس نے جواب دیا۔ تو اس کے الفاظ سے جذبات کی آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ اور ظاہری حالت نہایت پرسکون تھی

"تم کیوں اس طرح میرا پیچھا کرتے ہو۔ سچ مچ میں اس دفعہ کچھ چُرانے نہیں آئی۔ میں یونہی جلسہ دیکھنے کے لئے چلی آئی۔ اور میرے پاس تو دعوتی رقعہ بھی پہنچا تھا۔"

بیشک بیشک۔ میں دعوتی رقعہ دکھانے کے لئے کہوں تو آپ کو کچھ عذر کرنا پڑیگا۔ اس لئے میں یہ سوال ہی نہیں کرتا۔ ایک مشہور جج کہتا ہے کہ بعض میں کتنی ایک سوال تباہ کن ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ سوال کبھی تباہ کن نہیں ہو سکتا۔ ہاں جواب تباہ کن ہو سکتا ہے۔"

کشور خاموش رہی۔

گلیوں کا بانکا بھی چپ رہا۔

پھر اُس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ اور جانچ کر کہنے لگا۔ "آج وزیر تعلیم کی سب سے قیمتی جواہر پہنے ہُوئے ہے۔ شاید تمہاری نگاہ پہنچا

انہیں جواہرات پر پڑی ہے۔ بیں تمہیں دوبارہ مبارکباد دیتا ہوں۔"

اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

(۲)

گلیوں کا بانکا کشور کے قریب سے اٹھ کر ہال کے وسط میں جا پہنچا۔ اور وہاں سے فواکہات کی میز پر سے چند ایک نارنگیاں اٹھا کر کھانے لگا۔ وہ ابھی ایک نارنگی کو چھیلنے میں معروف تھا کہ اس کے کان میں بلند آواز خشمگینی کی کڑکتی ہوئی گونج پیدا ہوئی۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ آنریبل وزیر تعلیم بہت پریشان معلوم ہوتے تھے۔ ان کے اخلاق حقیقی پر سے تہذیب کا رنگین لبادہ گر گیا تھا۔ اور وہ بیگم حمید کے قریب کھڑے ہوئے انتہائی قہر سے کہہ رہے تھے

"بیگم آپ کا فرض تھا کہ آپ اپنے مہمانوں کے متعلق تشفی کر لیں۔ خیال تو فرمایئے کہ ایک لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ میری بیوی کی جواہرات کی مالا اس سے زیادہ قیمت کی تھی۔"

اور وفورِ جذبات سے اس کی آواز گلے میں رُک گئی۔

گلیوں کے بانکے نے ستم آشنا نگاہوں سے اس کونے کی طرف دیکھا۔ جہاں کشور بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کونہ اب خالی تھا۔ بانکا وزیر تعلیم کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ سے بولا۔ "نقصانِ عظیم ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ صنفِ جمیل کے کسی فرد سے گستاخی سے پیش آئیں۔"

وہ مسکرایا اور اس نے اپنے سر کو اس ناقابلِ انتزاع انداز میں خم کیا۔ جو صرف اسی سے مخصوص تھا۔ وہ گویا اس نصیحتِ زرنگار کو پیش کرتے وقت متعارف نہ ہونے کے سوئے اتفاق کے متعلق عذر خواہ بھی تھا۔ ابھی وزیر تعلیم نے کسی مناسب پر سکون اور سفیرانہ جواب کے متعلق تدبر نہ فرمایا تھا کہ ایک جوان شخص جس کی عینک میں سونے کی کمان تھی۔ اور جس کی نگاہیں خوابیدہ معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے قریب آ پہنچا۔ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتا تھا۔ گویا خلا میں سے دیکھ رہا ہے۔ اور کبھی آپ سے آنکھیں چار نہیں کرتا تھا۔ اس کا چہرہ ہر وقت ایک سکونِ منجمد میں سویا ہوا نظر آتا تھا۔ گویا شورشِ حیات اس کے لئے ایک بے معنی سی شے ہے۔

اس نے گلیوں کے بانکے کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا۔ گویا سیروں برف اس کے شانے پر رکھ دی گئی ہے۔ اس نوجوان نے کہا۔ "کیا میں دریافت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کے پاس

دعوتی رقعہ موجود ہے یا نہیں۔"

وہ خوابیدہ نگاہوں والا شخص اس طرح باتیں نہیں کرتا تھا۔ گویا باتیں کرنا ایک عذاب الیم ہے۔ اور وہ جلد از جلد اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ گلیوں کا بانکا جواب دے وہ نوجوان برق مثال تیزی سے مڑا۔ اور بلند لہجے میں کہا " بیگم حمید کسی مہمان کو جانے کی اجازت نہ دیجئے گا۔ دربان کو مطلع کر دیجئے۔"

چند ایک افراد جو گزر جانا چاہتے تھے، ان الفاظ کے معانی بین السطور کی توہین تصور کا احساس کر کے شرم سے تمتما اٹھے اور اپنی اپنی جگہ پر رک گئے

جوان پھر مڑا، اس کا لہجہ پھر اسی طرح کا نرم رو تھا۔" ہاں صاحب وہ دعوتی رقعہ"

" میرے پاس وہ دعوتی رقعہ موجود نہیں۔"

" آہا موجود نہیں۔"

" جی ہاں"

اس نرم رو نوجوان کے چہرے پر ایک فرسودہ تبسم نمودار ہوا۔" میں پہلے ہی جانتا تھا۔ اور جب آپ کمرے میں داخل ہوتے ہیں، تو آپ کی حرکات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ لائیے صاحب وہ مالا۔"

اس وقت حقیقت میں گلیوں کا بانکا متعجب ہوا

اس نے کہا۔" مالا"

"جی"

"کیسی مالا"

" جو چوری گئی ہے۔"

گلیوں کا بانکا ایک بانکپن کے رنگین انداز میں مسکرایا۔" صاحب اگر مالا میرے پاس ہوتی، تو بھی آپ اسے نہ لے سکتے۔ اور اس وقت تو مالا میرے پاس ہے ہی نہیں۔"

اور اس کونے کی طرف دیکھ کر جہاں کشور بیٹھی ہوئی تھی، وہ مسکرایا۔

سراغرساں نے اپنے ہاتھوں کی چند ایک مشاق جنبشوں سے گلیوں کے بانکے کی تلاشی لی پھر اسے اپنے کوٹ اور بوٹ اتارنے کا حکم دیا۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ مالا برآمد نہ ہوئی۔

(۳)

گلیوں کا بانکا سیدھا کشور کے مکان پر پہنچا۔ وہ ایک صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھی صوفے کے قریب ایک چھوٹا سا مخملی مونڈھا رکھا تھا اس نے اپنے دونوں پاؤں اٹھا کر مونڈھے پر رکھ لئے اور بے پروایانہ انداز سے مونڈھے کو حرکت دینے لگی بانکے نے کہا۔" لاؤ کشور وہ مالا۔ خدا کی قسم مجھے

روپوں کی بہت ضرورت ہے۔ قرض لیکر روپیہ واپس دے دینا چاہتے۔ تاکہ پہلے سے زیادہ قرض حاصل کیا جا سکے۔"

کشور نے اپنے سر کو ایک لااُبالی سی جنبش دی۔ گویا وہ اس جنبش سے وہ اُس مالاتے خاص اور باقی تمام مالاؤں سے عام طور پر لاعلمی کا اظہار کر رہی تھی۔

"دیکھئے بیگم ہمار اگر وہ اس قسم کا ہے۔ کہ اُس کے اخلاق دوسروں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکیں۔ آپ میرے آڑے وقت کام نہ آئیں۔ تو اور کون آئیگا۔ مجھے احساس ہے کہ اس قسم کا استدلال کچھ نیک آدمیوں کا سا ہے لیکن دُنیا میں اتنے بُرے بُرے آدمی بستے ہیں کہ کبھی کبھی نیک ہونا پڑتا ہے۔"

کشور نے قریب سے اپنا دستی پنکھا اُٹھا لیا۔ اور آہستہ آہستہ جھلنے لگی۔ پھر یکایک پنکھے سے اپنا تمام چہرہ چھپا کے اس طرح کہ صرف اُس کی آنکھیں اور ماتھا نظر آتا تھا۔ کہنے لگی:-

"اچھا چلو مان لیا کہ مالا میرے پاس ہے۔ مَیں تمہیں کیوں دے دُوں۔"

"اس لئے کہ آپ اگر نہ دینگی، تو مَیں خود لے جاؤنگا۔"

کشور نے بظاہر خود اعتماد انداز میں جوابدیا۔

"اچھا لے جاؤ۔"

گلیوں کے بانکے نے ہنستے ہُوئے کہا۔ "دیکھئے بیگم، آپ کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ پنکھے کی شفاف لطافت اُن سُرخ سُرخ گلاب کی پتّیوں کی لرزش کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ لیکن بہر صورت اگر آپ مجھے اجازت دیتی ہیں تو یہ لیجئے۔"

اُس نے کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر ٹھیٹر کی سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔

"ایک نہایت ذہین عورت ہے اُسے ایک قیمتی مالا ہاتھ آتی ہے۔ وہ اُسے کہاں چھپائے گی۔ کیا کسی گڑھے میں یا لحاف کی تہ میں یا دیوار کے کسی چور خانے میں۔ کیا وہ اُس مالا کو ایسی جگہ چھپائیگی، جہاں پولیس کے سپاہی آکر تلاش کر سکتے ہیں نہیں کیا وہ ایڈگر ایلن پو کے افرادِ قصّہ کی طرح مالا کو کسی ایسی جگہ رکھ دیگی۔ جہاں ہر وقت لوگوں کی نظر پڑنے کا احتمال ہو۔ نہیں، بلکہ جس طرح حسن تمام دُنیا کے جذبات کو کمالِ رعونت سے اپنے پاتے حنائی کی ایک جنبش سے ٹھکرا دیتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی جواہرات کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھیگی۔" یہ کہہ کر اُس نے اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر اُس مخملی مونڈھے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور مخمل کا غلاف اُتار کر مالا باہر

نکال لی ۔
مالا روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی اور اس جگمگاہٹ
کی طرح کا ایک رنگین نقش تحیر کشور کی آنکھوں میں
منعکس تھا ۔
وہ تقریباً پیار کے لہجے میں کہہ رہی تھی
بانکے صاحب کسطرح ۔ کسطرح "
وہ مسکرایا کہنے لگا " بہت آسانی سے ۔ کمرے کا تمام
سامان انگریزی تھا ۔ مخملی مونڈھا ۔ اس فضا میں
ایک ہندوستانی اور اسی لئے ۔ غیر ضروری اجنبی
اور زاید عنصر تھا ۔ معلوم ہو رہا تھا ۔ کہ یہہ مونڈھا
کسی شئے کو چھپانے کے لئے یہاں رکھا گیا ہے ۔
لیکن مجھے صرف شبہ ہی تھا ۔ ہاں جو وقت آپ نے
اپنے پاؤں اس پر رکھ لئے تو میرا شبہ یقین کے
درجے تک پہنچ گیا " یہہ کہکر اسنے مالا کو پھر بلند کیا
اور بولا " سبحان اللہ " کیا جگمگاہٹ ہے " اور
ابھی یہ لفظ اسکے منہ میں تھے ۔ کہ دروازے میں ہی
سراغ رساں وہی پولیس کا افسر جسکی نگاہیں خوابیدہ
معلوم ہوتی تھیں اور جو کبھی آپسے آنکھیں چار نہیں
کرتا تھا دو تین سپاہیوں کو لیکر اندر داخل ہوا ۔
اسنے کہا " کیوں جناب مزاج اچھے ہیں ۔ آخر
پکڑے گئے ۔ میںنے یہی سوچا تھا کہ مالا آپ جاکر
کسی آشنا کو دکھائینگے ۔ مرد کی سب سے بڑی
کمزوری یہ ہے ۔ کہ وہ اپنے کیسے پر اسوقت تک
خوش نہیں ہوتا جب تک کوئی عورت اُسے داد
نہ دے ۔ اس کمزوری کے لئے آپ کو تین سال
قید بامشقت کے کاٹنے ہونگے ؟ "
اُسنے گلیوں کے بانکے کو ہتکڑی نکالی ۔ کشور اپنی
جگہہ سے اُٹھ کر کچھ کہنا چاہتی تھی ۔ لیکن اسوقت
گلیوں کے بانکے نے اسے اپنے ہاتھ کے اشارے
سے روک دیا اور گناہ کے بانکپن سے مخمور
ہو کر کہا " پیاری لو اب تین سال کے بعد ملاقات
ہوگی " خدا حافظ "
کسی شخص کو یہ گمان نہ گزر سکتا کہ
گلیوں کا بانکا ایکٹ کر رہا ہے ۔ کہ
وہ قصداً کشور کو پیاری کہہ کر سراغ
رساں کو یقین دلا رہا ہے ۔ کہ مالا اُسی
نے چرائی تھی ۔
وہ تمام کمرے سے باہر چلے گئے اور
اب کمرے میں صرف کشور سکپال لیکر
اور ہی تھی اور کہہ رہی تھی سراغ رساں صاحب
آپ کو معلوم نہیں ۔ کہ مرد کی انتہائی کمزوری یہ ہے
کہ وہ عورت کا الزام اپنے ذمے لے لیتا ہے "

میگسار شاعر کا ترانہ

فلک پہ مہر و ماہ میری محفلوں کے جام ہیں		ستارے سب غلام ہیں جو رقص میں دوام ہیں
مناظرِ شب و سحر جو زندگی میں عام ہیں		کئی ضیا پذیر ہیں کئی سیاہ فام ہیں

تمام پر جھلک رہا ہے اک حجاب نور کا
کوئی سمجھے کہ عکس ہے یہ جلوہ گاہ طور کا

شرابِ دل گداز سے ہے گرمجوش زندگی		بہار کیش کائنات لالہ پوش زندگی
ہجوم کیف سے ہے محو ناؤ نوش زندگی		سمن فروش زندگی۔ شراب نوش زندگی

سرور کی بہار سے نگاہ زرنگار ہے
میرے لئے جہان پر نکھار ہی نکھار ہے

ہوا کی جنبشوں میں لرزشیں شراب کیطرح		نوازش خدا کی بارشیں شراب کیطرح
فروغ دل کشی میں تابشیں شراب کیطرح		خمار عاشقی میں کاہشیں شراب کیطرح

غرض ہر ایک چیز جو حسین ہے جمیل ہے
سرور کی کفیل ہے شراب کی مثیل ہے

حدیثِ حسن دوست

جلوۂ جنّت بہارِ حسن دوست
آتشِ دوزخ شرارِ حسن دوست

نظمِ ہستی بالبداہت دال ہے
نظمِ ہستی نحتِ کارِ حسن دوست
حسن عالم خود گواہِ حال ہے
حسنِ عالم مستعارِ حسن دوست

عالمِ نقش و نگار کائنات
پرتوِ نقش و نگارِ حسن دوست
حسنِ دُنیاے بہار شش جہات
عکسِ دُنیاے بہارِ حسن دوست

ہرطرف شکل نجوم انوار بار
طلعتِ انوار بارِ حسن دوست
ہرطرف مثلِ بہار اندر بہار
جلوہ ہاے بیشمارِ حسن دوست

اہتمامِ جلوہ آرائی نہ پوچھ
مہر و مہ آئینہ دارِ حسن دوست
انتظام حسن پیرائی نہ پوچھ
نسر و پروین پیشکارِ حسن دوست

واہ حسنِ دوست کے فیضانِ عام
جس طرف دیکھو بہارِ حسن دوست
واہ حسن دوست کے الطاف تام
جس طرف جاؤ۔ دوچارِ حسن دوست

کون حسنِ دوست پر مائل نہیں | جنّ و انسان سب نثارِ حسنِ دوست
کون اس شمشیر سے گھائل نہیں | مرغ و ماہی سب شکارِ حسن دوست

آدم و جنّ و پری حور و ملک | چاکر خدمتگزار حسن دوست
مختصر یہ ہے سما سے تا سمک | بندۂ طاعت شعار حسن دوست

سربلندانِ جہاں سے سربلند | اے زہے تقدیرِ یار حسن دوست
ارجمندان زماں سے ارجمند | واہ۔ بختِ دوستدار حسنِ دوست

شاملِ عشاق ہو کر دیکھ لو | عزّتِ عشاق کار حسن دوست
اہلِ دل بنکر دل و جاں نذر دو | قدرِ اہلِ دل شعار حسنِ دوست

آؤ۔ اب آزاد ! ہم تم بھی بنیں | عاشقانِ دلفگار حسنِ دوست
آؤ۔ اب آزاد ! ہم تم بھی کریں | جان و مال و دل نثارِ حسنِ دوست

شاید ایسا ہو۔ ہماری بھی سُنے | لطفِ بیحد و شمارِ حسنِ دوست
شاید ایسا ہو۔ ہمیں بھی کھینچ لے | جذبۂ بے اختیار حسن دوست

آزاد انصاری

محبّت اور موت

(ایک انگریزی نظم کا بتصرف ترجمہ)

جلوہ فگن تھا ماہ فلک پر بآب و تاب
لیلائے شب کا حُسن تھا آئینہ شباب

لعل و گہر سے دامن شب تھا بھرا ہُوا
ہر اِک ستارہ مثل نگینہ جڑا ہُوا

طاری تھا اِک سکوت جہان خراب پر
ہنگامہ زار دہر تھا خاموش سربسر

خلوت کدے خموش تھے اجلوتکدے خموش
جوش و خروش تھا نہ کہیں شور نائے و نوش

زندانِ بادہ خوار ہم آغوش خواب تھے
زُہاد نامدار ہم آغوش خواب تھے

صحن چمن تھا وادیٔ ایمن بنا ہُوا
ہر نخل برق طور کا آئینہ دار تھا

گلہائے رنگ رنگ تھے زینت دہِ چمن
لالہ، گلاب، یاسمیں، نسیرین و نسترن

نرگس کی چشم مست بھی محوِ نظارہ تھی
سوسن زباں دراز بھی خاموش تھی کھڑی

سُنبل کا جعد مشک فشاں تھا بندھا ہُوا
لب بستہ ہر کلی تھی، ہر اِک گل خموش تھا

بادِ صبا بھی خواب گراں سے تھی ہمکنار
آئینہ تھا سکون کا اِک سطح جوئبار

مصروف سیر باغ تھا اُلفت کا دیوتا
تابندگیٔ حُسن سے بے خود بنا ہُوا

"کیوپڈ" تھا اُس کا نام، محبت کہیں جسے
دِل میں تھا دید حسن کا ارماں لئے ہُوئے

لبریز شوق دید تھی اُس کی ہر اک نظر
تھمتی نہ تھی نگاہ کسی ایک چیز پر

نگراں تھا چار سو وہ گلستاں میں اس طرح
حیراں ہو کوئی آئینہ خانے میں جس طرح

گُل پر کبھی نگاہ، کبھی یاسمن پہ تھی ۔ آگے بڑھی تو نرگسِ شہلا سے لڑ گئی
سر کی خبر تھی اُس کو نہ کچھ ہوش پاؤں کا ۔ وارفتگیٔ دید میں محوِ نظارہ تھا

ناگاہ ایک شاخ پہ اُس کی نظر پڑی ۔ غنچوں سے جو عروس تھی یکسر بنی ہوئی
دیکھا کہ ایک مرد سیہ پوش ہے کھڑا ۔ کلیوں کو توڑ توڑ کے ستھراؤ کر رہا
"کیوپڈ" نے یہ سوال کیا "مرد نیک خو! ۔ کچھ ہوش بھی ہے تجھ کو یہ کیا کر رہا ہے تو
خونِ بشر نہیں تجھے خوفِ خدا نہیں ۔ شاید کہ تیرے دل میں محبت ذرا نہیں
یہ ظلم بے گناہوں پہ اے بانیٔ ستم! ۔ للہ اب تو رحم! خدا کے لئے کرم!!

بولا وہ اپنی راہ لے، جا اپنا کام کر ۔ واقف نہیں تو نام سے کیا میرے بے خبر!
سُن مجھ سے میرا نام، فرشتہ ہوں موت کا ۔ کلیوں کو توڑتا ہوں تو ہے مرضیٔ خدا
دو روزہ یہ بہار ہے اس پر نہ پھول تو ۔ یہ رنگ باغ دیکھ کے غافل! نہ بھول تو
فانی ہر ایک شے ہے جہانِ خراب میں ۔ بیچاری چند کلیاں ہیں پھر کس حساب میں

رکھ یاد اس جہان کا انجام ہے فنا
باقی رہے گا نام خدائے جلیل کا

رازؔ چاند پوری

جدید ہندوستانی شاعری

علامہ عبداللہ یوسف علی جدید ہندوستان کی اُن مشاہیر میں سے ہیں جنکی شان میں رسمی تعارف کے کوئی کلمات کہنا گویا اپنے اہل ملک کی نسبت اس سوء ظن کا اظہار کرنا ہے کہ وہ اپنے اکابر سے بھی ناواقف ہیں۔ اس لئے میں صرف اس مضمون کی نسبت چند ضروری باتیں عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں یہ مضمون دراصل انگریزی میں لکھا گیا تھا، اور انگلستان کی مشہور ادبی انجمن رائل سوسائٹی آف لٹریچر" کے ایک جلسے میں جو ۲۳ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو منعقد ہوا پڑھا گیا تھا۔ اس کا مقصد جیسا کہ صاحب مضمون نے تمہیداً بیان کیا ہے صرف یہ تھا کہ جدید ہندوستان کی موجودہ ادبی حالت کا ایک مجمل تبصرہ ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے ضمن میں بالغ نظر مصنف نے بعض ایسے اہم اور معرکتہ الآرا مسائل سلجھائے ہیں۔ جو ہندوستانی ادب کو اس زمانے میں درپیش ہیں اور جن کی خاطر حل پر اُس کی آیندہ ترقی کا دارومدار ہے۔

میں نے ان مسائل کی بحث سے ہندوستانی اہل ادب کو جو اسکی صحیح مخاطب ہیں محروم نہ رکھنا چاہا اگرچہ جن خیالات کا اظہار ترجمے کی نسبت علامہ یوسف علی نے کیا ہے وہ میرے لئے کافی ہمت شکن تھے ! میں علامہ مذکور کا بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے صرف میری یہ قبول فرماکر مجھے سند امتیاز بخشی، بلکہ اپنے چند اور ادبی مضامین کے ترجمے کی بھی اجازت عطا فرمائی جنہیں میں انشاءاللہ وقتاً فوقتاً پیش کرتا رہونگا۔ (مدیر)

یہ ایک عام مقولہ ہے کہ ہمارا زمانہ تہذیب و تمدّن کے احیاء کا زمانہ ہے۔ روئے زمین کے ہر حصّے پر زندگی کی خفی سے قوتیں بیدار ہو رہی ہیں، اور نئے نئے محرکات بر روئے کار آرہے ہیں اور اگر ہماری تہذیب اس ہمہ گیر انقلاب سے اثر پذیر نہ ہو تو بہت جلد فنا ہو کر رہ جائے۔

جب ہم اس ادبی بیداری کا خیال کرتے ہیں جس کے آثار آجکل ہندوستان میں نمودار ہو رہے ہیں، تو ہمارا ذہن فوراً اس تحریک احیاء العلوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جس کا ظہور یورپ میں پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس عظیم الشان تحریک میں مشرق کا جو اہم حصّہ تھا اسکے پورے پورے اعتراف سے یورپ کی مستند تاریخیں بالعموم پہلوتہی کرتی ہیں۔ تاہم اگر تحقیق سے کام لیا جاتے، تو معلوم ہوگا کہ وینس اور بینا میں فنونِ لطیفہ نے جو شاندار ترقی کی وہ بڑی حد تک مشرق اور بالخصوص مشرق بعیدہ کے اثرات کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر علوم مفیدہ مثلاً فن تعمیر، پارچہ بافی، شیشہ گری اور دھاتوں کے کام میں بھی یورپ نے مشرق کی شاگردی کی۔ اور یہ امر قرونِ متوسط کی صنعت کے اُن نمونوں سے جو یورپ

کے عجائب خانوں میں آج تک محفوظ ہیں پایۂ ثبوت
کو پہنچتا ہے فلسفہ کو لیجئے۔ تو انتہا یہ ہے، کہ خود
معلم اوّل ارسطو کو جو اپنی زبان میں از سرِ نو زندگی
حاصل ہوئی تو وہ فقط عربی شارحین اور مترجمین
کی مسیحائی کی بدولت، جنھوں نے اہل یورپ کو اپنے
اس بدنام حکیم کے نام سے آشنا کیا۔ عیسائی مذہب
کی الٰہیات کو دیکھئے، تو پتہ چلتا ہے کہ ازمنۂ متوسط
کی مابعد الطبیعات نے اس میں وہ روح پھونک دی
جو اسلام کی شرعی اور مذہبی ادبیات کا جوہر اصلی
ہے۔

ریاضی، طب، سائنس، ہیئت، وغیرہ علوم
عربی محققین کی مخصوص جولانگاہ تھے۔ اور مغرب کی
درسگاہوں میں ان علوم کی جو روشنی پھیلی، وہ مشرقی حکما
کے مغربی شاگردوں کا طفیل تھا جو اپنے اُستادوں
کی شمع ہدایت سے چراغ روشن کر کے لائے۔ اور تو
اور، ادبیات اور شاعری میں بھی یہ اثر نمایاں ہے۔
اٹلی کا مشہور شاعر ڈانٹے، جس کی تصانیف یورپ
کے عہدِ متوسط کی ادبیات کی جان ہیں۔ اپنی تحریروں
میں جا بجا مشرقی تلمیحات و کنایات سے کام لیتا ہے
اور یورپی قصوں اور داستانوں نے زیادہ سے زیادہ کیا ہے
تو یہ کہ مشرق کے قصوں مثلاً ..... کی قدیم روایات
کو زندہ کیا ہے۔

لیکن فی زمانہ مشرق و مغرب کا باہمی تعلق
پہلے سے اسقدر مختلف ہو گیا ہے کہ اس امر کی توقع
کہ مشرق اب بھی مغرب پر ویسے ہی گہرے نقوش
مرتسم کر سکتا ہے ایک توقع باطل ہے۔ اس کے برعکس
یہ تصور کر لینا کہ اب اُلٹی گنگا بہنے لگی ہے اور ایشیا کا
کام سوائے اس کے کچھ نہیں رہا کہ وہ یورپ کے ذہنی
اور تمدنی موثرات سے انفعال پذیر ہو ایک بڑی
غلطی ہے۔ گزشتہ چار سال کی عالمگیر جنگ نے
مذہب و ملت اور ملک و قوم کی قدیم تفریق مٹا کر
تمام ابنائے جنس کی ایک عام برادری کا مفہوم ہمارے
ذہن نشین کر دیا ہے۔ جس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے
کہ اربابِ غور و فکر کے دلوں میں اس امر کے تجسس
کا شوق پیدا ہوا ہے کہ مختلف قوموں نے تمدن انسانی
کے ارتقا میں کیا کیا حصہ لیا۔ یہ کلیہ کہ قومی خصوصیات
اور ارتقائے تمدن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے
سیاسی مباحثوں میں عموماً ایک مسلمہ اصول کے طور پر
استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اگر ادبی، ذہنی اور روحانی
مسائل پر بھی اس کا اطلاق کر کے دیکھا جائے، تو بہتر
نتائج کی توقع ہے۔ یہ عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے
کہ کسی قوم کے تمدن کی نشو و نما اس کے طبعی خصائص

کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے۔ کہ اس نشو ونما سے اُسی حالت میں بہترین نتائج مترتب ہونگے جب اسے بجائے خود ایک ارتقائی عمل نہ تصوّر کرلیا جائے، بلکہ ایک وسیع تر عمل کے ماتحت لایا جائے جس کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی متحدہ فلاح وبہبود ہو۔

"رائل سوسائٹی آف لٹریچر" اس کام کے دونوں پہلوؤں کی طرف متوجہ ہے، اور سرگرمی سے اس کے سرانجام میں کوشش کر رہی ہے۔ ایک طرف تو وہ دُنیا کی مختلف قومی ادبیات میں جتنی تحریکیں جاری ہیں۔ اُن کے سررشتوں کا شیرازہ ترتیب دے رہی ہے، اور دوسری طرف تمام قوموں کی ادبیات کو قرب واتصال اور اتحاد وموافقت کے رشتے میں مربوط کرنے کی کوشش کر رہی ہے، تاکہ تمام انسانوں کے اجتماع کا نصب العین جو زمانۂ حال کی برکتوں میں غالباً سب سے بڑی برکت ہے، اُن کے پیش نظر ہو جائے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ ادب میں جو عام رجحانات ہیں ہم اُن پر ایک نظر ڈالیں، اور یہ دریافت کریں کہ یہ ادب کہاں تک جدید نقطۂ نظر کی آئینہ داری کرتا ہے اور اُس سے کس حد تک دُنیا کے خیالات کی عام رو کو متاثر کرنے اور اس کا اثر قبول کرنے کی توقع ہو سکتی ہے۔

اہلِ یورپ نے آجتک جب کبھی ہندوستان کی ادبیات کا مطالعہ کرنا چاہا ہے، تو اپنی توجہ صرف قدیم زبانوں کی شاعری اور ادب تک محدود رکھی ہے اور یورپ میں ان کی نسبت جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن کو دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ گویا ہندوستان میں آجکل ادبیات کا سرے سے وجود ہی نہیں، اور ہندوستانی قوم اہلِ بابل یا اہلِ میڈیا کی طرح عہدِ سلف کی ایک قوم ہے کہ جو کام اُسے دُنیا کی تاریخ میں کرنا تھا وہ کر چکی ہے، اور نئی دُنیا کے پردے پر اُس کا نام ونشان ہی باقی نہیں رہا لیکن ایسا خیال حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ ہندوستان کا جو عظیم الشان عہد گزر چکا ہے۔ اُس سے تو دُنیا بخوبی واقف ہے۔ لیکن اُس کا موجودہ دور بھی ایک زندہ دَور ہے، اور اُس کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے ان تینوں کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی تاریخ ایک مسلسل اور غیر منقطع تاریخ ہے۔

ہندوستان کی موجودہ ادبی تحریکات کا ایک

مجمل سا تبصرہ آپ پر واضح کر دیگا کہ اس کی ادبیات
اس قابل ہیں کہ اُن کو غور سے پڑھا جائے، کیا بلحاظ
اس کے کہ وہ ہندوستانیوں کی باطنی زندگی کا آئینہ
ہیں، اور کیا بلحاظ اس کے کہ اُن سے ان مسائلِ مہمّہ
کی توضیح ہوتی ہے جو اس وقت ہندوستانیوں کو درپیش
ہیں اور جن کا اس سلطنتِ عظمیٰ کے آئندہ واقعات پر
جس کا ہندوستان ایک حصّہ ہے، نہایت گہرا اثر
ہوگا۔

کچھ یورپ ہی پر منحصر نہیں، خود ہندوستان میں
ایسے لوگ بیشمار ہیں جو جدید ادب کی طرف سے بالکل
غافل ہیں، اور یہ خیال کرنے کے عادی ہیں کہ اگر کوئی
شاعری کسی کام کی ہے تو وہ قدما کی شاعری ہے۔
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں پرانے ناٹکوں کے بیشمار
ترجمے اور تلخیصیں موجود ہیں، اور قدیم مذہبی شاعری
اور فلسفے کی کتابوں کے نئے نئے نسخے اور نئی نئی تفسیریں
اور شرحیں آئے دن دیکھنے میں آتی ہیں، وہاں جدید
ادب کی طرف سے یہ بے التفاتی ہے کہ ہندوستان
کی زبانیں ایک دوسری کی نئی تصنیفات کے ترجمے
بھی شاذونادر کرتی ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ
دیسی زبانوں کو ابھی ہندوستان کے تعلیمی مرکزوں میں
مناسب مرکز نہیں نصیب ہوئے۔ دیسی کتب خانے
اتنے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور جو ہیں
وہ بھی ان معنوں میں کہ علوم و فنون کے تمام شعبوں کے
متعلق کتابوں کا ایک مرتب و منظم مجموعہ ہوں، جن سے
دور و نزدیک کے لوگ فایدہ اُٹھا سکتے ہوں، کتب خانے
کے نام کے مستحق نہیں۔

جتنا انگریزوں کے خیالات اور طرزِ معاشرت کو عہدِ جدید
کے ہندوستانیوں کے خیالات سے قرب ہے اتنا شاید یورپ کے اور
کسی ملک کے خیالات کو نہیں۔ انگریزی زبان میں ویدوں
اُپنشدوں، پُرانوں، سنسکرت کے ڈراموں، رزمیہ نظموں
اور دوسری مشہور و مسلّم کتابوں کے متعدد ترجمے پائے
جاتے ہیں۔ اور کسی قدر ترجمے اُن عربی اور فارسی کتابوں
کے بھی ہیں جو مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں تصنیف
کی گئی تھیں۔ تاہم ہندوستان کی مختلف زبانوں میں
آجکل جو لکھا جا رہا ہے اُسے باستثنا رابندرا ناتھ ٹیگور
اور چند بنگالی افسانہ نویسوں کی تحریروں کے، انگریزی
میں منتقل نہیں کیا گیا۔ رابندرا ناتھ ٹیگور . . . .
. . . . . . کو صرف انگلستان نے
خراجِ تحسین نہیں ادا کیا بلکہ یورپ کے دوسرے ممالک
اور ایشیا اور امریکہ نے بھی اُس کی مصنّفات کے ترجمے
تقریباً دنیا کی ہر مہذب زبان میں ہوتے ہیں، خصوصاً
سوئیڈن اور پرتگال میں اُسے شہرتِ عامہ حاصل ہے۔

اگرچہ ہندوستان جدید کی شاعری کا بہت کم حصہ یورپ کے سامنے ترجمے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے تاہم اُس کی ایک خفیف سی صدائے بازگشت یورپ کی زبانوں میں خصوصاً انگریزی میں سُنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ٹینی سن کی مشہور نظم "خوابِ اکبر" میں ایک موقع پر ایک ایسی چیز کی طرف کنایہ ہے جو ہندوستان کے ادبِ حاضرہ کی مُدح و رواں ہے۔ اور وہ چیز کیا ہے؟ ایک متحدہ ہندوستان اور ایک منظم ہندی قومیت کا وہ خواب جو اس وقت ہندوستانی دیکھ رہے ہیں۔ برسبیلِ تذکرہ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اس نظم کا خیال ایک ہندوستانی ادیب کا سُجھایا ہُوا ہے جو ٹینی سن سے واقف تھا۔ یہ اُسی نے ٹینی سن کو بتایا تھا کہ اکبر کو ہندوستانیوں کے قصص و حکایات اور جمہور کی روایات میں کیا جگہ دی جاتی ہے۔ وہ خواب جو اکبر نے دیکھا؛ وہ اتحاد و ترقی کا نصب العین جو اس کے پیشِ نظر تھا، ہندوستان کی جدید قومی ادبیات کا عنصر غالب ہے۔ اگرچہ ہندوستانیوں کو اس نصب العین کے حاصل کرنے اور اُس خواب کی تعبیر حسب مراد دیکھنے میں بڑی بڑی مشکلیں پیش آئیں گی، تاہم اُن کے دل میں امید ہے کیونکہ ماریلے اور مانٹیگو جیسے سیاست دانوں کی ہمدردانہ کوششیں ان کے شامل حال ہیں۔

شعر و شاعری جس طرح دُنیا کی مجموعی ترقی کے لئے ایک خاص معنی رکھتی ہے۔ اسی طرح وہ ہندوستان کی نشو و نما میں بھی ممد و معاون ہے۔ ہندوستانی قوم عبارت ہے۔ ۳۲ کروڑ اشخاص سے، جو مختلف زبانیں بولتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی طویل تاریخ اور اپنا اپنا ذخیرۂ ادبیات رکھتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ نسلِ انسانی کا اتنا بڑا حصّہ اپنے خیالات کا تحریر کے وسیلے سے اظہار کرے، اور اس کا دُنیا پر کچھ اثر نہ ہو۔

سب سے پہلے اسکینڈینیویا کی یونیورسٹی کے کسی پروفیسر نے بنگالی زبان سیکھی، بنگالی ادبیات کا مطالعہ کیا اور بعض نظموں کو جو اُسے پسند آئیں یورپ کے سامنے پیش کیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اُس نے یورپ پر اس امر کا انکشاف کیا کہ دُنیا میں بنگال بھی کوئی مُلک ہے اور وہاں بھی ایسے انسان رہتے ہیں، جو اپنی زبان میں کچھ گفتنی اور شنیدنی کہتے ہیں۔ آج تیس برس بلکہ اس سے زیادہ ہونے کو آئے کہ ٹیگور اپنی زبان میں شاعری کر رہا ہے۔ اُس کے اشعار زبان زد خلایق ہیں۔ ہُگلی کے کشتی بان اور بنگال کے راہرو اُنہیں گاتے پھرتے ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنیوالے

محنتی مزدور اُس کے نغموں کو لطف لے لے کر سُنتے ہیں
تھکے ہارے دہقان اپنی کلفت کو اُس کے گیت
گا گا کر دُور کرتے ہیں۔ بنگال کے طول و عرض میں
کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کے باشندوں کا ہر طبقہ اُس
کی شاعری سے آشنا نہ ہو۔ تاہم جب تک سویڈن
کے اس پروفیسر نے اُس کی شاعری کا انکشاف
نہیں کیا، جب تک اُس نے ٹیگور کے نام کو لوگوں
سے روشناس نہیں کرایا، اور اُسے نوبل پرائز دلوا کر
اُس کی نظموں کے اُن انگریزی تراجم کا جو خود اُس
نے کئے ہیں، حقِ تعارف ادا نہیں کیا اُس وقت
تک یورپ کے عوام کے خواب و خیال میں بھی یہ بات
نہ آئی، کہ ایک ایسی زبردست ادبی شخصیت کا وجود
دُنیا کے پردے پر ہے۔ اس ادبی انکشاف کا فوری
نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیگور کا شمار دُنیا کے مسلم الثبوت اُستادوں
میں ہونے لگا۔ اور اس کے نتائج بعیدہ میں سے ایک
یہ بھی ہے، کہ آج تاریخ میں پہلی مرتبہ ادبی دُنیا یہ محسوس
کرنے لگی ہے کہ ہندوستان جدید دُنیا کے شعر و ادب
کے ارتقا اور نفس انسانی کے نشوونما میں ایک
قابلِ لحاظ عنصر ہے۔

جہاں تک لسانیات کے نقطۂ نگاہ کا تعلق
ہے، ہندوستان کی مروجہ دیسی زبانوں کے متعلق سرکار
کے زیر نگرانی اور سرکار کی مالی اعانت سے قابلقدر
تحقیقات کی گئی ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ
سر جارج گریرسن نے جن کے نام نامی سے تمام دُنیا
کے ماہرانِ علم اللسان بخوبی واقف ہیں، ہندوستانی
زبانوں کے متعلق اپنا تبصرہ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ اس
میں اُنہوں نے متعدد غیر معروف زبانوں کی ساخت و
ترکیب اور ان کے باہمی تعلقات کو واضح کیا ہے۔
اس کے ساتھ ہی دوسری زبانوں کی طرف بھی جو زیادہ
ترقی یافتہ ہیں توجہ مبذول کی ہے۔ مثلاً ہندوستانی
بنگالی، مرہٹی، گجراتی وغیرہ۔ یہ ہندوستان کی ترقی یافتہ
زبانوں کی کوئی جامع فہرست نہیں ہے۔ ان زبانوں
کے علاوہ اور بہت سی زبانیں ہیں جو اعلےٰ پایہ کو
پہنچ چکی ہیں۔ مگر میرا مقصد ان کے ذکر سے صرف یہ ہے
کہ آپ پر یہ واضح کر دوں کہ ہندوستانِ جدید میں کیا کیا
بے بہا گنجینے ہیں، جو یورپ کی نظروں سے مخفی
پڑے ہیں

ان دیسی زبانوں کی تقسیم دو گروہوں میں ہو سکتی
ہے۔ اوّل آریائی زبانیں جو شمالی ہند میں مروّج ہیں
دوم دراوڑی زبانیں جو جنوبی ہند میں مروّج ہیں۔
ہماری بحث کا تعلق بالتخصیص اوّل الذکر گروہ سے
ہے۔ گو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تامل اور

دوسری دراوڑی زبانوں کا دامن جذباتی ادب کے جواہرات سے مالامال ہے۔ آریائی زبانیں یورپ کی تقریباً تمام زبانوں سے نسبی تعلق میں مربوط ہیں۔ مثلاً اینگلو سیکسن، کلٹک، ٹیوٹانک، اور بالخصوص یونانی اور لاطینی جو یورپ کے تمام تہذیب و تمدن کا سنگِ بنیاد ہیں۔ مذکورہ آریائی زبانوں کا شجرۂ نسب براہ راست ہندویورپی خاندانِ السنہ کی سب سے بڑی بیٹی سنسکرت سے جاملتا ہے۔ ان کی مخفی صلاحیتوں اور قوتوں کا اعتراف نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ اور امریکہ میں عام طور پر کیا جانے لگا ہے۔ اُن کا انگریزی افکار و خیالات سے اختلاط و ارتباط اور اُن کی وساطت سے یورپ اور امریکہ کی ادبی زندگی سے مس رکھنا۔ اُن کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے، اور روز بروز اُن کے اُس طبعی جوہر کو جو انہیں اپنے قدیم اجداد سے ورثہ میں ملا ہے، چمکا رہا ہے۔ چنانچہ اُن میں وہ لاانتہائی آزادی اور غیر محدود ترقی کا جوش جو اینگلو سیکسن دنیا کی زبانوں اور ادبیات کی تہ میں پایا جاتا ہے اُبل اُبل کر سطح پر نمودار ہونے لگا ہے۔

مندرجہ بالا فایدے کے علاوہ جس سے قدیم زبانیں محروم تھیں۔ اور جو جدید زبانوں کے حصّے میں آیا ہے ایک اور تفوّق جو جدید زبانوں کو حاصل ہے۔ یہ ہے کہ اُن کے پاس نئی ضروریات کا اختراع کیا ہوا ایک معتدبہ ذخیرۂ الفاظ موجود ہے۔ جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو قدیم عوائد و رسمیات کی زنجیروں سے جو اکثر اگلے وقتوں کی زبانوں کے لئے مہلک ثابت ہوئی ہیں، رہائی دلاسکتی ہیں۔ اگلوں کے مقرر کئے ہوئے اصول، اُن کے رسوم و آئین، بیشک ایک قابلقدر ورثہ ہیں۔ لیکن یہ ورثہ مضر بھی ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ وہ بعض اوقات آیندہ ترقی کے لئے سدِّراہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ادب کو رسمیات کی ایک محدود چاردیواری میں مقیّد کردیا جائے، تو بتائیے اُس کے تادیر زندہ رہنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ ایسی حالت میں کسی مصنّف کے لئے اپنی انفرادی خصوصیات کے اظہار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ نہ خیالات میں اور نہ اسلوب بیان میں کوئی جدّت کی روش نکال سکتا ہے۔ کیونکہ اُس کا تخیّل ایک حلقۂ طلسم میں محصور ہوتا ہے۔ قصّہ مختصر، ہندوستان کی نوخاستہ زبانیں ابھی نوجوانی کی اُمنگوں اور ولولوں، مستقبل کی جوش انگیز امیدوں اور اپنی استقامتِ راہ کے متعلق اعتماد سے لبریز ہیں، وہ نئی نئی راہوں کی داغ بیل ڈال رہی ہیں اور میدانِ تخیل کی وسعتوں میں جولانیاں کررہی ہیں۔

ان زبانوں کی پُرانے عوائد کی قید و بند سے

آزادی اُن بڑے شاعروں کے لئے جو اس وقت ہندوستان میں منظرِ عام پر آرہے ہیں ایک مبارک فال ہے۔ اگر وہ اس سے کما حقہٗ فایدہ اُٹھائیں تو یہ آزادی اُن کے لئے اظہارِ خیال کا گویا ایک نیا وسیلہ مہیا کر دیگی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جب کوئی مصوّر اپنے فن میں کوئی جدید روش اختیار کرتا ہے، اور پیش پا افتادہ طریقوں سے اجتناب کرتا ہے، تو اُس وقت فن کی تاریخ میں کیسا عظیم الشان انقلاب رونما ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ یہ جدّت کر سکتا ہے کہ اگر روغن سے اس کا موقلم اپنا کمال نہیں دکھا سکتا، تو وہ اُس کو ترک کر دے اور اُس کی بجاے پانی کے رنگوں کا استعمال شروع کر دے۔ انگلستان کے شہرہ آفاق مصوّر ٹرنر کی مثال ہمارے سامنے ہے اُس نے پانی کے رنگوں کو روغن پر ترجیح دی۔ اور دنیا جانتی ہے کہ اس کی تصویر میں کس حیرت انگیز کمال فن کی حامل ہوتی ہیں، اور اُن میں غروبِ آفتاب، وسعتِ بحر، اور شفق آلود فضاؤں کے مناظر کس قدر عجیب و غریب ہوتے ہیں۔

اسی طرح جب ہندوستان کے ایک جدید شاعر حالؔی نے مسلمانوں کی عظمتِ دیرینہ اور اُن کے موجودہ زوال و انحطاط کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، تو اس کے اشعار کے سُننے والوں نے محسوس کیا کہ اُردو کے خوابیدہ ساز سے ایک نیا نغمہ پیدا ہوا ہے۔ اور اگرچہ یہ نغمہ ایک نہایت دھیمے سُر میں ہے، لیکن کان لگا کر سُنا جائے تو مستقبل کی امیدوں کا ایک جاں بخش پیغام ہے۔ پھر یہ پیغام کسی سیاسی شورش یا بغاوت کا پیغام نہیں، جس کا انجام اپنی تخریب، خودکشی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک مشعل ہدایت ہے، جو مسلمانوں کے ہاتھ میں دی گئی ہے کہ وہ اُسے لے کر قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق .... اپنے گوشۂ تاریک سے باہر نکلیں، اور دیکھیں کہ خدا کی خدائی میں کیا ہو رہا ہے اور ہمّت و استقلال، عزم و خود اعتمادی کی بدولت اس دُنیا میں اپنے لئے کوئی راہ ڈھونڈ نکالیں۔

اگلے وقتوں کے شاعر اپنے مُلک کی زبانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور انہیں مبتذل و عامیانہ تصوّر کر کے اُن سے احتراز کرتے تھے۔ وہ انہیں عین اس طرح استعمال کرتے تھے جس طرح کوئی شخص بوجھ لادنے کے لئے گھریلو ٹٹو کو استعمال کرتا ہے۔ اُنہیں اپنی زبان بولتے اور لکھتے ہُوئے عار آتی تھی۔ اور وہ یہ کوشش کرتے تھے کہ اسکی اصلیت کو غیر زبانوں، مثلاً فارسی، عربی، سنسکرت کے مانگے تانگے زیور سے چھپا دیں۔ اور یہ کوئی نرالی بات

نہیں ہر ترقی یافتہ زبان کو یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ انگریزی زبان پر ایک وہ زمانہ گزرا ہے جب ملٹن جیسا وطن پرست شاعر شیکسپیئر کی تعریف کرتے ہوئے اُس کے انگریزی زبان کو اپنا وسیلۂ اظہار بنانے کے متعلق عذر پیش کرتا ہے، اور جب فرانس کے کلاسک مصنفین شیکسپیئر کو ایک وحشی قوم کا ایسا فرد سمجھتے تھے جسے قدرت نے شاعری کا ملکہ ودیعت کر دیا تھا۔ وجہ یہ کہ شیکسپیئر قدما کے ضوابطِ ادب کی پابندی سے گریز کرتا تھا۔ ملٹن اپنے تمام کارناموں میں سے اپنی اُن نظموں پر فخر کرتا تھا، جو اُس نے لاطینی زبان میں لکھی تھیں، اور اُنہیں اپنی مادری زبان انگریزی کی نظموں پر ترجیح دیتا تھا، حالانکہ دُنیا نے آج اُس کی لاطینی نظموں کو فراموش کر دیا ہے، اور اُس کی تمام عظمت و شہرت اس کے انگریزی زبان کے کارناموں سے وابستہ ہے۔

یہی حال ہندوستان کی زبانوں کا تھا مگر اب وہ اس دور سے گزر چکی ہیں۔ اور اپنے حقوق اہل ملک سے تسلیم کرا رہی ہیں۔ ان زبانوں میں قدیم ادبی شاہکاروں کے بیش بہا گنجینے موجود ہیں، مگر وہ وقت آ چکا ہے، جب انہی کو اپنا تمام سرمایۂ کمال نہیں سمجھا جاتا، اور اُن کے مقابلے میں نئی چیزوں کے قابلِ قدر ہونے کو ایک امر محال نہیں خیال کیا جاتا۔ جب ٹیگور کی طرح کا ایک شاعر اُٹھتا ہے اور اپنی مادری زبان بنگالی میں اپنے روحانی گیت گا گا کر دُنیا پر ثابت کرتا ہے کہ ہندوستانیوں کی رُوح کی گہرائیوں میں اب بھی ہزارہا نغمے خوابیدہ ہیں، تو ہم گرمجوشی سے اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ نغمے جن کی گونج سے ہندوستان اگلے زمانے میں معمور تھا۔ آج نئے سازوں، اور نئے مطربوں کی اُنگلیوں سے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ٹیگور نے جو ترجمے اپنے اشعار کے انگریزی زبان میں کئے ہیں، وہ نرے ترجمے ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ ایسی مشعلیں ہیں جو اُس کی آتش نوائیوں کے شعلوں سے روشن کی گئی ہیں۔ ان ترجموں کے پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی ہندوستان میں ایسی جوہر قابل رکھنے والی ہستیاں موجود ہیں، جو اُس کی شاعری کی قدیم شان کو برقرار رکھ سکتی ہیں اور اس کے سامنے شعر و شاعری کا ایک ایسا نصب العین پیش کر سکتی ہیں جو کسی دوسرے ملک کا کوئی شخص کسی دوسرے ادب کا بڑے سے بڑا شاعر پیش نہ کر سکتا تھا۔ ہندوستان کی یہ زندہ زبانیں انگریزی سے رشتۂ اتحاد میں مربوط ہو کر ہندوستان کا تعلق دُنیا کے باقی حصوں سے قائم کر رہی ہیں۔ اور

اور اُسے جدید خیالات کی شاہراہ پر لئے جا رہی ہیں، یہ کام قدیم زبانوں کے بس کا نہ تھا جن کے بولنے والا اب کوئی نہیں رہا۔

ہندوستان کی جدید شاعری میں، بلکہ یوں کہئے کہ ہندوستان کے جدید ادب میں (کیونکہ شاعری حقیقت میں ادب سے نہایت قریب کا تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ اُس کی رُوح و رواں ہے) اس وقت مصنّفین کے تین مختلف الخیال گروہ ہیں۔ ہم ذیل میں علی الترتیب ان گروہوں کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں۔

پہلا گروہ اُن لوگوں کا ہے جن کی نگاہیں گزرے ہُوئے زمانہ پر جمی ہوئی ہیں، اور جو اپنے ایامِ زندگی عہدِ ماضی میں بسر کرتے ہیں، یعنی قدامت پسند لوگ۔ یہ لوگ ایک قدیم مُردہ زبان کو جدید زبان پر ترجیح دیتے ہیں اور موخرالذکر کو روزانہ زندگی کی گھریلو زبان سمجھ کر علم و ادب کے شایانِ شان نہیں خیال کرتے۔ اور اگر وہ کبھی بھولے سے اس کو اپنا اظہارِ خیال کا وسیلہ بناتے بھی ہیں، تو اپنی تحریروں کو قدیم اسالیب بیان کے قالب میں ڈھالنا، بہ نسبت اس کے کہ حالی اور ٹیگور کی طرح نئے انداز پیدا کریں، زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ بعد از وقت دُنیا میں آنے والے لوگ اُن رشیوں اور سادھوؤں کی طرح ہیں جو ہمالیہ پہاڑ کی چوٹیوں پر . . . .

دھیان گیان میں محو بیٹھے اُن کی دائمی برف باریوں کا نظارہ کیا کرتے ہیں، اور کبھی ان فلک فرسا بلندیوں سے اُتر کر میدانوں میں نہیں آتے، کہ دُنیا کی گرم بازاری کا تماشا شہروں میں زندگی کی ہلچل، بازاروں کی گہما گہمی، کاروبار کی مصروفیتیں اور نئی نئی ایجادوں کے کرشمے دیکھیں اور یہ معلوم کریں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں کو جدید زمانے کی ہر چیز غیر ضروری اور دلچسپی سے خالی نظر آتی ہے۔

وہ شیکسپیئر کے مشہور کیریکٹر ہیملیٹ کی طرح یہ خیال کرتے ہیں کہ اس دُنیا کی تعمیر میں کوئی فساد کا مادہ مضمر ہے، جو زمانۂ حال میں ظاہر ہو رہا ہے اور دُنیا کو معرض تباہی کے نزدیک لئے جا رہا ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی کی واقعیتوں اور اصلیتوں کے دریافت کرنے کی کوشش بے سود ہے۔ بلکہ وہ اُسے ادبی کفر کا مرادف قرار دیتے ہیں۔ وہ قدیم الایام کے فلسفیانہ مسائل میں اُلجھے ہُوتے ہیں۔ یا راماین کی دھیان گیان کی زندگی کے لطف میں محو ہیں، یا تصوف اور عشق مجازی کے جذبات کی رکیک عاشقانہ غزلوں کے مزے لے رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے دل تصوف یا عشق و محبت کے جذبات و حسیات سے حقیقت میں آشنا ہوں، تو اُن کے صحیح معنوں میں شاعر ہونے کی کچھ نہ کچھ امید ہو سکتی ہے۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ان جذبات و حسیات سے عاری ہونے کے باوجود وہ ان کے اظہار پر تُلے ہُوتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی حیثیت زیادہ سے زیادہ لفظی نقالوں کی، یا یہ کہیے کہ ایسے بازیگروں کی ہوتی ہے، جو لفظوں اور جملوں کی رسّیوں پر خوب قلابازیاں کھاتے ہیں۔ یہ لوگ جہاں مقررہ اوزان و بحور کو اپنے ایمانِ شاعری کے ارکان سمجھتے ہیں۔ وہاں پامال و فرسودہ خیالات کو نظم کرنا بھی سنّت خیال کرتے ہیں۔ اور جدید اسالیب سخن یا جدید خیالات کو داخل کفر سمجھ کر ان سے گریز کرتے ہیں۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ مروّج طریقوں کے لیے اُن کے دل میں جو احترام ہے وُہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہے اور وہ عملی طور پر قدما کا احترام کرنے کی بجائے اُن کی تحقیر کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کسی شخص کا بھائی مر جاتا ہے اور وہ بجائے اس کے کہ آدابِ شرعی اور حفظانِ صحت کے قوانین کے مطابق اُس کی تجہیز و تکفین کرے اُس کی لاش گھر میں لے آتا ہے، اور اُسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرتا، تا آنکہ وہ گل سڑ کر تعفن پھیلا دیتی ہے۔ پھر جب اُس کے نتائج قبیحہ نمودار ہوتے ہیں، تو وہ اپنے آپ کو قصوروار نہیں ٹھہراتا، بلکہ نظامِ عالم اور قوانینِ فطرت کو الزام دیتا ہے۔

اب ہم دوسرے گروہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو پہلے گروہ کے برعکس جدید ادب کے نمونوں کی نقالی میں حدِّ افراط تک پہنچ جاتا ہے۔ اس گروہ کے حامیوں کو اپنے ادب کا عہدِ گزشتہ اپنے لیے باعثِ ننگ و عار معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی شخص کے نسب میں کوئی قصور ہو اور وہ اُسے چھپانے کی کوشش کرے۔ اُن کے نزدیک جدّت ادب کی قدر و قیمت کا صحیح معیار ہے۔ وہ انگریزی زبان کی ادنےٰ درجے کی کتابوں کو جنہیں وہ پُوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے، بڑے شوق سے پڑھیں گے لیکن اپنی زبان کے کسی معنی شناس شاعر کے کلام کا مطالعہ کرنا تضیعِ اوقات سمجھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں ہندوستان کی زبانوں میں یُورپ کی ایسی عامیانہ کتابوں کے، جن کی حیثیت ابھی متعین و مسلّم بھی نہیں ہُوئی، بیشمار ترجمے پائے جاتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ترجموں کا مخالف نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ترجمہ بنفسہٖ ادب کی اصناف میں ایک مفید صنف ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ دوسری قوموں کے خیالات و افکار کو عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مگر میں یہ ضرور کہونگا کہ ترجمہ چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو، وہ طبعزاد ادبی کارناموں کا درجہ نہیں پا سکتا۔ اور میرا یہ قول اربابِ ذوق کے

نزدیک کسی تصریح یا بحث کا محتاج نہیں۔

کسی زبان کے بہترین کارنامے صرف ایسے خیالات پر مشتمل نہیں ہوتے جن کا اظہار دوسری زبانوں میں بھی ہوسکتا ہے، بلکہ وہ ایسے جذبات و احساسات، ایسے وارداتِ قلب، ایسے مخصوص تلمیحات و کنایات سے مملو ہوتے ہیں، جن کے اظہار پر کوئی دوسری زبان قادر نہیں ہوسکتی۔ اور علاوہ بریں اُن میں ایک ایسی خوش اسلوبی بیان ہوتی ہے جسے ترجمے میں برقرار رکھنا بیحد مشکل ہے۔ وہ ادب جو حقیقی معنوں میں ادب کہلائے جانے کا مستحق ہے وہ ادب ہوتا ہے، جو رُوح کی گہرائیوں سے نکلتا ہے، اور جس قوم کی وہ ملکیت ہو اُس کے حالات روایات اُسکی باطنی کیفیات، اس کی اندرونی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور اس لئے اُسی سے مخصوص ہوتا ہے۔

غیر زبانوں کے ادب کی نقالی کا یہ رجحان کوئی مبارک فال نہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اس کا سدِّباب کریں۔ ہمیں ہرگز یہ غلط خیال دل میں نہ لانا چاہیئے، کہ جب ہم غیر اقوام کے ادبی شاہکاروں کو اپنی زبان میں منتقل کردیتے ہیں، تو اس سے ہماری زبان کے قالب میں غیر زبانوں کی ادبیت کی رُوح آجاتی ہے۔ اور نہ کبھی ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا چاہیئے کہ اس سے ہماری رُوح کی تشنہ کامی تسلّی پذیر ہوجاتی ہے غیر ممالک کی بہترین پیداوار کا نچوڑ ہماری پیاس کو نہیں بجھا سکتا صرف اپنے وطن ہی کے سرچشموں سے ہماری طبیعت کی تسکین ہوسکتی ہے۔ اور تو اور شیکسپیر جیسا ہمہ گیر مصنّف، جو مُلک اور زمانے کی خصوصیتوں سے مبرّا ہے، ہندوستانی زبانوں میں اُس کا بھی ترجمہ مشکل ہے۔ مترجم، جب متواتر کوششوں کے بعد ناکام رہتا ہے، تو مایوس ہوکر تلخیص و نقل پر اُتر آتا ہے۔ اور اس قسم کی چیزوں کی جو حیثیت ہوسکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ کوئی ترجمہ چاہے کتنا ہی اصل کے مطابق کیوں نہ ہو، اور کتنی ہی دیانتداری سے کیوں نہ کیا گیا ہو۔ لیکن اگر مترجم مصنّف کے مقابلے میں ادنٰے ذہنیت کا آدمی ہے تو یہ ترجمہ کسی کام کا نہیں یا اگر اصل زبان کے مفردات و مرکبات کے مخصوص مفاہیم اور وہ مطالب و معانی جنکا اُن کے ساتھ ایک ذہنی تعلق قائم ہوچکا ہے، ترجمے میں مرادفات سے ادا نہیں ہوسکے تو اُس صورت میں ترجمے کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ اور یہ دو ایسی دقتیں ہیں جن سے مترجمین کو عموماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر ترجمے ناکام رہتے ہیں اس لئے میں ہندوستانی ادیبوں کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرونگا کہ وہ ترجمہ و تلخیص میں کاوش کرنے کی بجائے ایسے حالات و واقعات اور ایسے

جذبات و خیالات کا اظہار کیا کریں جو خود ان کے اور انکے
پڑھنے والوں کے تجربے میں آچکے ہوں

سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ غیر زبانوں
کی منتخب ترین تصانیف کے ترجمے عموماً مقبول نہیں
ہوتے۔ اور ادنےٰ درجے کی کتابوں کے ترجمے، جن
کی قدر و قیمت خود اپنی زبان میں مسلم نہیں ہوتی، ہاتھوں ہاتھ
خریدے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی زبان
کی بہترین تصانیف چونکہ نہ صرف خیالات بلکہ طرزِ ادا
کی مخصوص خوبیوں سے لبریز ہوتی ہیں، اس لئے اُن
کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ڈکنس کے ناولوں کا ترجمہ،
جیسا کہ ترجمے کا حق ہے، کس کے بس کی بات ہے؟
اس لئے ہندوستانی جمہور کو آجتک اُن کا پتہ نہیں۔
لیکن ان کے مقابلے میں رینالڈس کے ناولوں کو دیکھئے
تو اُن کی مقبولیتِ عامہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ اور جب
اُن کے ترجموں کے پڑھنے والوں کو یہ بتایا جائے کہ
انہیں انگریزی ادب میں کوئی جگہ نہیں دی گئی، بلکہ
بارگاہِ اعتبار سے مسترد قرار دیا گیا ہے، تو وہ یہ سُنکر
نہایت متعجب ہوتے ہیں۔ رینالڈس کی قبولیت کا تو
یہ عالم ہے اور مولیئر، گوئٹے، اور ابسن کا نام تک کوئی
نہیں جانتا۔ اور اگر ان کے ترجمے کبھی کئے بھی جاتے
ہیں تو وہ بھی براہ راست اصل زبان سے نہیں، بلکہ ایک دو
غیر زبانوں کے ترجموں کی وساطت سے وجہ یہ کہ جرمن
فرانسیسی، اور اسکنڈے نیوین زبانوں کے جاننے والے گنتی
کے چند آدمی ہیں۔

غیر مستند ادبیات کے تراجم کی اس اندھا دھند
تقلید کے پہلو بہ پہلو طرزِ تحریر میں بھی ایک نمایاں عیب
پیدا ہوتا جاتا ہے عموماً ایک ایسا طرزِ تحریر اختیار کیا
جانے لگا ہے، جو جرائد نگاروں اور اخبار نویسوں ہی
کو پھبتا ہے۔ ٹوٹے پھوٹے جملے، بھونڈی تراکیب،
بے ربط عبارت جس میں کوئی معنی آفرینی، کوئی اندازِ بلیغ
کوئی لطافتِ بیان نہیں ہوتی —— یہ سرسری طور پر
اُس کی خصوصیات ہیں۔ ایک بڑا شاعر صرف یہی نہیں
چاہتا کہ واقعات کو عین مین بیان کر دے۔ اُس کا
مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سُننے والوں کے دلوں میں
جذبات برانگیختہ کرے۔ انہیں مختلف طریقوں سے
متاثر کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے زبان کسی
قادر الکلام اُستاد کے ہاتھ میں ایک نہایت کارگر آلہ ہے
اور اس کا نفوذ و اثر زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں
طور پر ہوتا ہے۔ موسیقی، مصوّری اور فنونِ مرصع کاری
کے مقاصد اپنی اپنی جگہ قابلِ تعریف ہیں۔ مگر یہ کوئی
نہیں کہہ سکتا کہ انکا جو اثر لوگوں کی روزانہ زندگی پر ہوتا ہے
اور نہیں جذبات و خیالات کے اظہار کی جو قدرت ہے وہ اُس دائمی

اور عالمگیر جادو طرازی کا مقابلہ کر سکتی ہے جو صرف حقیقی
شاعری کا حصہ ہے۔ شاعر کے الفاظ میں ایک ایسا سحر
ہوتا ہے کہ ہم غالب کے ہم آواز ہو کر کہہ اُٹھتے ہیں [۵]

دیکھنا گفتار کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ ہمارے اُن دلی جذبات کا، جن کے اظہار کے لئے
خود ہمیں الفاظ نہیں ملتے" ایک مُنہ سے بولتا مرقع
پیش کرتا ہے۔ وہ ہماری رُوح کو الفاظ کے پیکر
میں جلوہ گر کرتا ہے۔ اس لئے اُس کے الفاظ عام گفتگو
اور تحریر کے الفاظ سے جُدا ہوتے ہیں۔ انہیں گویا ایک
معنیٰ بین السطور، ایک مخفی مطلب ہوتا ہے۔ آجکل کے
بعض انشا پرداز اور شاعر جو واقعیت اور اصلیت کے
دلدادہ ہیں، اور الفاظ کی صنعت کاری سے اجتناب
کرتے ہیں، اس اہم نکتے کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔
وہ ایک ناقص، بے ربط، درجۂ بلاغت سے گرے
ہُوئے، اور بے سلیقہ طرزِ بیان کے حامی ہیں، اور اُن
کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ طرزِ تحریر اصلیت کے عین مطابق
ہے، اور قدرتی ہے، ہم اپنی روزانہ زندگی میں اسی طرح
کی گفتگو کرتے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ بیشک بجا ہے۔
لیکن غور سے دیکھا جائے، تو کہنا پڑتا ہے کہ وہ روزانہ
زندگی کے نقائص کی تو تقلید کرتے ہیں لیکن اُس کے
کمالات و محسنات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر قدما کے
ادب کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا ہے تو شوق سے
کیجئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تحریر کے پھوہڑپن،
الفاظ و تراکیب کی بدنمائی اور بدزیبی، اور عبارت کے
عیوب کی حمایت کی جائے۔ ادب کو کبھی یہ زیبا نہیں
کہ وہ ابتذال، عدمِ لطافت اور فقدانِ ادبیت کو حسنِ عبارت
پر ترجیح دے، یا فطرت کی نقالی پر تناسبِ الفاظ
کو قربان کرے، یا ترنم اور لطفِ موسیقیت کو ایک بے ہنگم
شور و غل میں غرق کر دے۔

ہندوستانی مصنفین کا تیسرا گروہ وہ ہے جو
میری نظروں میں جادۂ اعتدال پر جا رہا ہے۔ یہ وُہ
گروہ ہے جس سے ہندوستانی ادب کا مستقبل وابستہ
ہے۔ فی الحال اس کی ترقی بہت آہستہ رفتار سے ہو رہی
ہے۔ لیکن ہوتے ہوتے اہمیّت حاصل کر لیگا۔ اس کی
سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں عصرِ جدید
کے اثرات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے، وہاں
اپنے گرانبہا ادبی ورثے کی بھی قدر کرتا ہے۔ یعنی قدامت
کے احترام کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماحول سے بھی
اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ
وہ اجتہاد اور جدت سے کام لیتا ہے۔ اس کا مقصد
یونانی علم الاوثان کے منچلے سیاح جیسن کی طرح اقلیم خیال

کے نامعلوم طبقوں میں زریں بربط کا ڈہونڈ ہنا ہے رابندرا ناتھ ٹیگور، حالی، اور اقبال جیسے شاعروں کی ایک معمولی مطمح نظر، یا اونی خیالات اور طریق اظہار سے تسلی نہیں ہو سکتی وہ ادب کی ولایت میں سوداگر نہیں ہیں کہ یہاں سے تجارتی مال خریدیں اور وہاں جاکر بیچ دیں۔ اور اس ولایت کے شہنشاہ ہیں وہ صحیح معنوں میں شعر کے خلاق اور صناع ہیں، اور انکی صنعت کا موادِ خام اُن کے ملک کی پیداوار ہے وہ اس امر میں دوسرے ملکوں کے محتاج نہیں ہوتے وہ اپنے اسلاف کے قدردان اور عقیدت مند ہیں لیکن اسکے وہ زمانہ حال کی باتوں کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اور مستقبل کے بھی رموز آشنا ہیں

(باقی دارد)

(علامہ عبداللہ یوسف علی) (مترجمہ محمد ہادی حسین)

ادب اور سائنس کا باہمی تعلق

جب کسی عملی آدمی کے سامنے افلاطون کا نام لیا جائے یا اُس کے خیالات بیان کئے جائیں تو وہ حقارت سے مسکرا دے گا، اور اس کا اُسے بیشک حق ہے، کیونکہ افلاطون کے خیالات سچ پوچھئے تو بالکل دور از کار اور عملی فائدے سے خالی ہیں خصوصاً اُن لوگوں کے نقطۂ نگاہ سے جن کی زندگی کے شب و روز کاروبار کی مصروفیتوں میں گزرتے ہیں موجودہ زمانے کی کاروباری دنیا میں جو منہمک زندگی بسر کیجاتی ہے اُس کے اصل اصول سے افلاطون کو ازلی نفرت ہے۔ صنعت و حرفت، تجارت، پیشہ وری ان تمام چیزوں کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن ذرا سوچئے تو کہ اگر صنعت و حرفت، تجارت اور اسی قسم کے دوسرے پیشے آجکل کی کسی تجارتی جماعت کی زندگی سے خارج کردئے جائیں۔ تو اُس جماعت کا کیا حشر ہو؟۔ افلاطون کی دلیل ہے کہ فنونِ حرفت اور دستکاری میں انہماک سے انسان کے اکتسابِ فضیلت کے میلان میں ایک طبعی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رذیل جذبات ذلیل خیالات، اور دناءت پر قابو نہیں پا سکتا، اور اسکی فطرت کی لطافت پر کثافت غالب آنے لگتی ہے۔ جو لوگ ان فنون میں مشغول رہتے ہیں، ان کی روح بھی اُن کے متبدل کاروبار کے اثر سے اسی طرح مجروح اور مضمحل ہوجاتی ہے جس طرح اُن کا جسم مسخ ہو کر بدنما اور بدزیب ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص اپنے دماغ کی تربیت، اور فضائل علمی کے اکتساب کا ارادہ کرے تو اُسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے کوئی نوکر۔ جس نے محنت مشقت کر کے کچھ پیسہ جمع کر لیا ہے، اور اپنے آقا سے رخصت لے کر اپنے پھٹے پرانے چیتھڑوں کی بجائے نئے کپڑے زیب تن کر کے اس ٹھاٹھ سے جا رہا ہے کہ گویا اپنے آقا کے گھر نوکر بن کر نہیں بلکہ دولہا بن کر آیا ہے۔

یہ تو صنعت و حرفت اور دستکاری کی افلاطون نے گت بنائی ہے۔ رہے دوسرے پیشے جو ذرا زیادہ عزت کے پیشے سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کو بھی خالی نہیں جانے دیا۔ مثلاً ایک وکیل کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، ایسا نقشہ کہ اس سے مکمل تصور میں لانا محال ہے اس نقشے میں دکھایا ہے کہ بیچارے وکیل کی ذہنی اور

اخلاقی غلامی کی زندگی نے کس طرح جوانی کے آغاز ہی میں اس کو کسی کام کا نہیں رکھا، اس کے دل میں دغا فریب کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ جھوٹ اور چال بازی اس کی سرشت میں داخل کر دی ہے، اس حد تک کہ اُس نے ان چیزوں کو اپنا ذریعۂ معاش، اپنا شبانہ روز کا کاروبار اور اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے، اور دوسرے اپنی جو مشکلیں اُس کے پاس لے کر آتے ہیں اُن کے حل کے لئے وہ مردانہ وار انصاف اور صداقت پر اعتماد نہیں کرتا، بلکہ دروغگوئی اور جعلسازی اور افترا پردازی سے نجات کا ذریعہ ڈھونڈھتا ہے اس کا افسوسناک انجام یہی ہوتا ہے کہ یہ بیچارا پیشتر اس کے کہ اپنی روحانی اور دماغی قوتوں کی نشو و نما کر سکے، انسانیت کا ایک بگڑا ہوا نقشہ ہو کر رہ جاتا ہے اور ہوش سنبھالنے کے وقت سے لیکر آخر دم تک ایک لایعقل حیوان کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، گو وہ بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا ہوشیار اور بیدار مغز اور بڑی عملی استعداد کا آدمی ہوں۔ اِس تصویر کے کھینچنے والے کی کون تعریف نہ کریگا، لیکن پھر یہ دبی زبان سے کہنا پڑتا ہے کہ افلاطون کے خیالات ایک گزرے ہوئے اور قبلِ تہذیب دور کے باقیات میں جب کہ صرف سپاہی اور پروہت کے پیشے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے چھوٹے کام غلاموں کے سپرد ہوتے تھے اب وہ زمانہ گیا، ہم اُس دنیا سے بہت آگے نکل آئے ہیں اب تو وہ وقت ہے کہ انسانوں کی زیادہ تعداد محنت مشقت کرنے والوں کی ہے۔ اور جماعتِ انسانی کے سب سے زیادہ مفید افراد وہ خیال کئے جاتے ہیں جو زراعت، دستکاری، تجارت، کارخانوں کے کاروبار اور دوسرے پیشوں میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ مزدور پیشہ لوگ۔

مگر بعض لوگ اس زمانے میں بھی ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے جو تعلیم کے اصول اور قاعدے ہیں اُن کے لئے ہم افلاطون اور اُس کے ہمخیال متقدمین کے مرہون منت ہیں، جو ایسے زمانہ میں رہتے تھے جب کہ ایک سپاہیوں کا فرقہ اور دوسرے علما کا فرقہ، یہ دو فرقے وقعت کے قابل سمجھے جاتے تھے؛ اور دوسرے کام کاج کرنے والوں کی حیثیت غلاموں کی تھی۔ اس زمانے میں صرف وہ لوگ تعلیم حاصل کر سکتے تھے جن کے پاس دولت و استطاعت ہو اور فراغت ہو، یہ حال صرف یونان کا نہ تھا بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں کا بھی وہاں بھی یا سپاہی پیشہ یا مذہبی مقتدا اعلےٰ حیثیت رکھتے تھے۔ باقی سب لوگ جو حقیقت میں سب سے زیادہ

مفید اور ضروری کام انجام دیتے تھے، صرف برائے نام آزاد تھے۔ ورنہ عملاً اُن کی اوقات غلاموں سے بہتر نہ بسر ہوتی تھی۔ ان باتوں سے نتیجہ اخذ کر کے آجکل کے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ زمانہ جدید کے دستکاروں مزدور پیشہ لوگوں، اور کاروباری آدمیوں کو تعلیم دینا کیا بےمعنی بات ہے۔ ان بیچاروں میں گنتی کے لوگ ایسے ہیں جنہیں کبھی قدرے فرصت نصیب ہوتی ہو ورنہ باقی سب اپنے فائدے کے لئے، اور دنیا کے فائدے کے لئے محنت مزدوری میں ہمہ تن مشغول ہیں، اور ان کو تعلیم دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے موجودہ مشاغل سے بیزار اور اُن کے ناقابل ہو جائیں گے جس سے دنیا کے کاموں کے بعض مفید شعبوں میں خلل واقع ہونا ناگزیر ہے۔

یہ ہے اُن لوگوں کی دلیل جو جمہور کی تعلیم کے مخالف ہیں۔ لیکن جہاں تک افلاطون کی ذات کا تعلق ہے اسکی رائے تعلیم کی نسبت بحیثیت مجموعی نہایت صائب اور صحیح ہے، اور اُسکے خیال میں تعلیم تمام طبقوں کے افراد کے لئے بلا امتیاز مشاغل موزوں و مناسب ہے۔ اُس کا قول ہے کہ سمجھدار آدمی اس قسم کے مطالعہ کو جس سے اُسمیں اعتدال۔ حق پسندی اور ہوشیاری کی صفات پیدا ہوں، یقیناً پسند کرے گا اور دوسری قسم کے مطالعے پر ترجیح دیگا۔ میرے نزدیک یہ الفاظ تعلیم کی اصلی غرض و غایت اور اُن مقاصد کو جنھیں ہمیں تعلیم حاصل کرنے میں پیش نظر رکھنا چاہیے نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔

اسکے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ افلاطون جس دنیا میں رہتا تھا ہماری دنیا وہ نہیں، اُس کو تجارت اور صنعت و حرفت سے جو نفرت ہے وہ ہمیں نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے اور وہ مطلق تصور کر سکتا تھا کہ امریکہ جیسی ایک عظیم الشان تجارتی اور صنعتی قوم کیا چیز ہے، اور یہ بات بھی اُس کے ذہن میں نہ آسکتی تھی کہ اس قسم کی قوم یا جماعت لازمی طور پر تعلیم کو اپنے مقاصد کے مطابق بنائے گی اگر وہ تعلیم جو ازمنہ قدیم سے چلی آ رہی ہے اُسکے مقاصد و مفاد کے لحاظ میں مفید نہیں، تو وہ یقیناً اُس کی تحصیل کو ترک کر دیگی اور اُسکی بجائے کسی اور قسم کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوگی بالعموم اگلے زمانے کی تعلیم ادبی تعلیم ہوتی تھی۔ ... سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو تعلیمی مشاغل آجتک سب کے لئے مفید ہیں۔ کیا اُن سے بہتر کوئی تعلیم ممکن نہیں؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم میں ادبیات کو جو اہمیت دی جاتی ہے یہ قدیم زمانے کا ایک ایسا دستور ہے جو ہمارے لیے بہت مضر ثابت ہو رہا ہے۔ وہ یہ

سوال کرتے ہیں کہ کیا موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ
سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ادبیات کی بجائے سائنس کی
تعلیم کو رواج دیں۔ بالخصوص امریکہ میں یہ سوال نہایت
شد و مد سے کیا جاتا ہے اور اس کے متعلق بڑی
سرگرم اور معرکہ آرا بحثیں ہوتی ہیں۔ یہ تجویز کہ ادبی
تعلیم کی اہمیت کو کم کر کے اس کی بجائے سائنس کی
عملی تعلیم کو وسیع پیمانے پر رائج کیا جائے، آجکل امریکہ
میں مقبولِ عام ہو رہی ہے، کیونکہ امریکہ جدید دنیا کے تمام
ممالک سے صنعت و حرفت کی ترقی میں آگے ہے، اور اسی
کو یہ مسئلہ سب سے پہلے درپیش ہونا چاہیئے تھا۔

میں اس موقع پر اس مسئلے سے بحث کرنا چاہتا ہوں
کہ ادبیات کو تعلیم کے دائرے سے خارج کرنے کی جو
تحریک ان دنوں عام ہو رہی ہے، کیا اس تحریک کو
پھیلنا چاہیئے یا نہیں، اور کیا یہ بالآخر کامیاب بھی
ہوگی یا نہیں؟ مجھ پر ایک اعتراض وارد ہو سکتا ہے
جس کا جواب میں قبل از وقت دیدینا مناسب سمجھتا
ہوں۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ خود میں نے جو تعلیم حاصل
کی ہے وہ کلی طور پر ادبی ہے، اور سائنس اور طبیعات
کا میں مردِ میدان نہیں۔ اگرچہ مجھے اُن سے دلچسپی بہت ہے
تاہم میری واقفیت بالکل سرسری اور سطحی ہے۔ کہا جا
سکتا ہے کہ ایک ایسا آدمی جو خالصتہً ادبی مذاق کا
آدمی ہے اسکی اہلیت نہیں رکھتا کہ ادبیات اور طبیعات
کی قدر و قیمت کا موازنہ کرے اور اُنکے متعلق کوئی فیصلہ
صادر کرے۔ اس اعتراض کا جواب میرے پاس یہ ہے
کہ شخص مذکور کی محدود واقفیت چونکہ کسی سے پوشیدہ
نہیں اس لئے وہ جہاں کوئی ایسی بات کہے گا جو خلاف
واقعہ ہوگی تو پایا جائے گا، اور کوئی شخص اس کی باتوں کے
فریب میں نہ آسکے گا۔ وہ اتنے باریک بین اور دقیقہ
شناس نقادوں کے حلقے میں گھرا ہوگا جو اس کی
غلط بیانیوں کا رنگ نہ جمنے دیں گے اور دنیا کو اس
کی مضرت سے محفوظ رکھیں گے۔ لیکن میں جو طریقہ
بحث اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ اس قدر سیدھا سادہ
ہے کہ مجھ سا سرسری واقفیت کا آدمی بھی اس سے
عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

آپ میں سے بعض اصحاب کو غالباً میرا ایک جملہ یاد ہوگا
جو بہت بحث و مباحثہ کا باعث ہوا ہے۔ اس جملے کا
مختصر طور پر مطلب یہ تھا کہ تحصیلِ علم اور تہذیبِ نفس
کا مقصد چونکہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اور دنیا کو
جان جائیں اس لئے ہمارے لئے اس میں کامیابی کا
مفید ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم دنیا کے بہترین خیالات
سے واقفیت بہم پہنچائیں۔ ایک مشہور سائنس داں پروفیسر
ہکسلے نے جو ایک زبردست انشا پرداز بھی ہیں۔ اپنی ایک

تقریر میں میرا جملہ نقل کیا، اور بعض اور جملے میری تحریر میں سے پیش کر کے اسکی تشریح کی۔ وہ یہ تھے کہ:۔ مہذب دنیا فی زمانتا ذہنی اور روحانی مقاصد کے اعتبار سے، ایک عظیم الشان متحدہ جماعت سمجھی جانی چاہیئے جو ایک مشترک کام میں مصروف ہے، اور واحد مقصد کے حصول کی کوشش کر رہی ہے۔ اس جماعت کے افراد یونانی، رومن، اور قدیم۔ ایشیائی زبانوں کے اور ایک دوسرے کی رائج الوقت زبانوں کے علم سے آراستہ ہیں۔ چونکہ مقامی اور ہنگامی وسائل ترقی جو پہلے خاص خاص اقوام کو حاصل تھے اب دنیا سے اٹھ گئے ہیں اس لئے جدید قوموں میں سے وہی قوم ذہنی اور روحانی ترقی میں سب پر سبقت لیجائیگی جو۔ اس بین الاقوامی تہذیب کے لائحہ عمل پر سب سے زیادہ کاربند ہو۔

پروفیسر ہکسلے میرے جملے کے متعلق جسکی انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس کی مدد سے تشریح کی ہے۔ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس میں یہ جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ بہترین خیالات سے واقفیت بہم پہنچانا اپنے آپ کو اور دنیا کو جاننے کا بہترین وسیلہ ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ادب کی تحصیل بہترین تعلیم ہے۔ لیکن اس پر وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ امر کسی صورت میں واضح نہیں ہوتا کہ جب ہم قدیم ادبیات سے جو معلومات حاصل کر سکتے ہیں کر چکتے ہیں، تو اس سے ہمارے پاس اپنے متعلق معلومات کا کافی وسیع ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے، جو حقیقت میں تہذیب نفس کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برخلاف یہ امر تسلیم کرنے کے قابل نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی قوم یا کوئی فرد جب تک سائنس کے وافر ذخیرے سے استفادہ نہ کرے اسکے لئے کیا امید ہو سکتی ہے کوئی شخص جو قواعد جنگ سے واقف ہے کسی دور دراز مہم پر روانہ ہو تو اسکے لئے اتنی ہی کامیابی کی زیادہ امید ہو سکتی ہے بہ نسبت اُس شخص کے کہ جو سائنس کے جدید شعبوں سے ناواقف ہی اور زندگی کے متعلق کُل معلومات بہم پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا تقریر سے ظاہر ہے کہ دو شخص جو آپس میں کسی معاملے کے متعلق گفتگو کرنا چاہیں اُن کے لئے کس قدر ضروری ہے کہ جن الفاظ اور اصطلاحات کا وہ استعمال کرتے ہیں اُنکے متعلق یکساں طور پر واقف ہوں۔ پروفیسر ہکسلے نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اُسی الزام کی تکرار ہے جو ادبیات لطیف پر عموماً عاید کیا جاتا ہے کہ ان کا مطالعہ ایک پُرلطف اور عمدہ مشغلہ ہے، لیکن بیکار اور بے سُود

یونانی۔ لاطینی، عبرانی، اور اسی قسم کی دوسری قدیم زبانوں کی تحصیل ایسے شخص کے لیے جو دنیا کی حقیقت سے آشنا ہونا چاہتا ہو اور عملی آدمی بننا چاہتا ہو بالکل بے فائدہ ہے اسی طرح موسیو رینن[1] اپنی ایک تحریر میں مدارس کی تعلیم پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تعلیم یہ تفرض کر لیتی ہے گویا سب طلبہ شاعر، انشا پرداز، خطیب، اور مقرر بننا چاہتے ہیں، بعد موسیو رینن اس تعلیم کا مقابلہ سائنس سے کرتے ہیں اسکے جو حقیقت کا تنقیدی تجسس و تفحص ہے۔

لیکن غور سے دیکھیے تو پروفیسر ہکسلے اور موسیو رینن دونوں نے ادب کے مفہوم کو محدود کر دیا ہے، وہ ادب سے صرف ادبِ لطیف مراد لیتے ہیں۔ اور پھر اس ادبِ لطیف کو ایک مشغلۂ تفریح اور فطرت انسانی کے متعلق سطحی معلومات کا ذخیرہ سمجھ کر۔ سائنس اور حقیقت کے تجسس کی ضد قرار دیتے ہیں اور یہ غلط رجحان ان لوگوں کی طرف سے جو ادب کی اہمیت اور قومیت کے خلاف طبلِ جنگ بجاتے رہتے ہیں عام طور پر ہوتا رہتا ہے۔

لیکن جاننا چاہیے کہ جب ہم ادبیات مثلاً یونان اور روما کی قدیم ادبیات کا ذکر کرتے ہیں جنہیں عرفِ عام میں "علوم انسانی" سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس سے ہمارا مطلب ایک ایسا علم ہوتا ہے جو روح انسانی کے متعلق سطحی معلومات سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ کم از کم میں ذاتی طور پر یہی سمجھتا ہوں۔ ہومر کے مشہور نقاد وولف[1] کا قول ہے کہ "کسی علم کی تعلیم ہو، اگر وہ ربط و ضبط کے ساتھ اور قاعدے کے مطابق دی جاتی ہے اور اپنے موضوع کے اصلی ماخذوں تک کی تدقیق کرتی ہے، تو اسے سائنٹفک طریقے کی تعلیم کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یونانی اور رومن اطیقات کی نسبت معلومات کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اصل زبانوں میں ان کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔ اس قول کی صحت میں مطلق شک نہیں ہو سکتا۔ ہم ہر قسم کی تعلیم جو کسی ضابطے کے ماتحت حاصل کی جائے اور اصلی ماخذوں تک اس کا سراغ لگایا جائے۔ سائنٹفک ہو سکتی ہے۔ اور اسی طرح انسانیات کا مطالعہ بھی سائنٹفک اصولوں کے مطابق ہو سکتا ہے۔

چنانچہ جب میں یونان اور روما کے ادب قدیمہ کے مطالعہ کو اپنے متعلق اور دنیا کے متعلق علم حاصل کرنے کا وسیلہ کہتا ہوں، تو میرا مطلب صرف ذخیرۂ الفاظ۔ قواعدِ زبان اور مشہور یونانی اور رومی مصنفین کی کتابوں سے نہیں ہوتا بلکہ میرا مطلب اس سے اہل یونان اور اہل روما کی باطنی زندگی اور ان کے

[1] فرانس کا مشہور ادیب

کارناموں کا مطالعہ ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ہم
اُن سے کیا حاصل کر سکتے ہیں ان معلومات کی کیا قدر و قیمت ہے
ادب کے مطالعہ کا نصب العین اور روما کے قدیم ادب سے
واقفیت پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایسے طریقے
سے اسکا مطالعہ کریں کہ اس اعلیٰ مقصد کی تکمیل
کر سکیں اسی طرح اپنے زمانے اور اپنے ملک کے ادب
کے مطالعہ سے ہمارا مدعا اپنے آپ سے اور دنیا سے
واقفیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر مکیلے
کے جدید اقوام کے بہترین خیالات اور ان خیالات کے
بہترین اظہار سے واقف ہو نا صرف جدید ادب سے
واقف ہونے کے مرادف ہے۔ لیکن اسکے ساتھ
ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ "ہمارے وقت کی امتیازی
خصوصیت علوم طبعی اور سائنس کی روز افزوں
وسعت اور اہمیت ہے۔" اس لئے جو شخص علوم
طبعی کے علم سے بے بہرہ ہو، اور جس شخص کو یہ معلوم
نہ ہو کہ سائنس نے گزشتہ صدی میں کیا کیا کرشمے
دکھلائے ہیں، وہ عہدِ جدید کی زندگی سے صحیح
معنوں میں آشنا ہونے کا کیونکر دعویٰ کر سکتا ہے؟
میں پھر کہتا ہوں کہ ہمارے درمیان الفاظ کے معانی
کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں ان کو سب سے پہلے دور
کر دینا چاہیے میں نے صرف دنیا کے بہترین خیالات
سے واقفیت بہم پہنچانے کا ذکر کیا تھا، پروفیسر مکیلے
نے میرا مطلب یہ سمجھ لیا کہ میں "ادب" کا ذکر کر رہا
ہوں۔ کجا میرے الفاظ کجا اُن کے الفاظ۔ "ادب"
ایک نہایت وسیع المفہوم لفظ ہے، وسیع ترین
معنوں میں اسکا اطلاق ہر تحریر اور ہر مطبوعہ ورق پر
ہو سکتا ہے۔ اس طور پر اقلیدس کے "مبادی" اور نیوٹن
کے "اولیات" بھی ادب کی ذیل میں آجاتے ہیں،
بلکہ ہر صنفِ علم جو کتابوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی
ہے ادب کے نام کی مستحق قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن
پروفیسر مکیلے نے ادب کا مفہوم اتنا محدود لیا ہے
کہ وہ صرف اسکی ایک صنف یعنی ادبِ لطیف کو اسکا
مترادف قرار دیتے ہیں تو گویا اُن کے قول
کے مطابق میں نے جو زمانہ حال کی قوموں کے
بہترین خیالات کو معلوم کرنے کا تذکرہ کیا تھا
اس سے میری مراد محض ادبِ لطیف تھی، اور
اسکے سوا کچھ بھی نہیں تھی یہ تفرض کر لینے کے بعد
وہ مجھ پر یہ اعتراض وارد کرتے ہیں کہ اس قسم کی
معلومات جدید زمانے کی زندگی کی حقیقت سے
آگاہ ہونے کے لئے کافی وسیلہ نہیں۔ لیکن چونکہ
میرا مطلب رومائے قدیم سے واقفیت پیدا کرنے
سے یہ نہیں کہ لایعنی ادبیات کے متعلق کم و بیش

معلومات حاصل کیجائے، اور روما کے جنگ، سیاست
قانون، اور نظامِ حکومت کے شعبوں میں جو کارنامے
نمایاں انجام دئے ہیں اُن کو یک قلم نظر انداز کر دیا
جائے اور چونکہ میرا مطلب یونانِ قدیم سے واقفیت
پیدا کرنے سے یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ یونان
سے دنیا کو فنونِ لطیفہ اور ریاضی، طبیعیات، علم ہیئت
حیاتیات اور فلسفہ کے مبادی ورثہ میں پہنچے ہیں،
نہ صرف یہ کہ چند یونانی نظموں، تاریخوں، مختصر رسالوں
اور تقریروں کو پڑھ لیا جائے وعلیٰ ہٰذا القیاس جدید قوموں
سے آگاہی حاصل کرنیکا مطلب میرے نزدیک یہی
نہیں کہ فقط اُن کے ادب لطیف کو پڑھ لیا جائے
بلکہ یہ معلوم کرنا بھی، کہ کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن، اور
ڈارون جیسے اشخاص نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے
ہیں پروفیسر ہکسلے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے
اسلاف یہ تعلیم حاصل کرتے تھے کہ زمین کائناتِ کلی
کا مرکز ہے، اور زمین کا سارا کارخانہ انسان کے دم
سے چل رہا ہے، خصوصاً یہ امر اُن کے ذہن نشین کیا
جاتا تھا کہ فطرت کے حوادث و مظاہر کا کوئی قاعدہ
کوئی نظام نہیں، بلکہ ان میں سے کسی کو ثبات نہیں
اور اس دنیا کا قانون ہی تغیر ہے۔
آگے چل کر کہتے ہیں کہ ہمارے اسلاف کے ذہن
میں دنیا کی ابتدا و انتہا کی متعلق جو خیالات و تصورات
تھے اب وہ تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اب یہ امر
یقین کے درجہ کو پہنچ چکا ہے کہ مادی دنیا میں
زمین مرکز کی حیثیت نہیں رکھتی اور زمین کے کارخانہ
کی روح و رواں انسان نہیں۔ اور اس سے زیادہ
یہ امر ایک حقیقت ثابتہ ہو چکا ہے کہ حوادثِ فطرت
ایک معین نظام کے مظہر ہیں، جس میں کبھی خلل
واقع نہیں ہوتا .. لیکن وہ خالص ادبیاتِ
قدیم کی تعلیم جس کے اس زمانے کے بعض اربابِ
فکر حامی ہیں، ان تمام باتوں سے یکسر معرا ہے۔"
میں علومِ قدیمہ کی تعلیم کا بحث انگیز مسئلہ مناسب
موقع و مقام کے لئے اٹھا رکھتا ہوں؛ سردست
میں صرف یہ سوال حل کرنا چاہتا ہوں کہ جدید زمانے
کی اقوام کے بہترین خیالات سے آگاہی حاصل کرنے
کے کیا معنی ہیں؟ سب سے پہلے میں اِسکے متعلق
یہ کہتا ہوں کہ اسکے معنی صرف ادبِ لطیف کے جاننے
کے نہیں ہیں۔ کسی ملک کے ادبِ لطیف سے واقف
ہونا اُس ملک کی باطنی زندگی سے واقف ہونے کے
مرادف نہیں نہیں۔ اسکے لئے ضرورت ہے کہ ہم
اُس ملک کے مفکرین، علما، حکما، فلاسفہ سے
بھی واقف ہوں۔ ادبِ لطیف پر جو یہ الزام لگایا جا

ہے کہ اس کا دائرہ صرف انسان کی خارجی اور باطنی زندگی کے ایک سطحی مطالعہ تک محدود ہوتا ہے، یہ الزام بالکل حق بجانب ہے! اور اس اعتبار سے وہ تعلیم کے لئے چنداں مفید مضمون نہیں ہے۔ لیکن میں جس نظام تعلیم کا ذکر کر رہا ہوں یعنی دنیا کے بہترین خیالات، اُسے واقفیت بہم پہنچانا، اس پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا۔ بہترین خیالات کی تعریف میں صرف جدید اور قدیم ادب ہی داخل نہیں، بلکہ زمانۂ حاضرہ میں مشاہیر مفکرین سائنس دانوں، اور حقیقتِ کائنات کے متجسّسین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ میرے اور پروفیسر ہکسلے کے درمیان اس امر کے متعلق کوئی اختلاف نہیں کہ سائنس کی جدید تحقیقات کے نتائج کا علم ادب اور فنونِ لطیفہ کی تخلیقات کے علم کے پہلو بہ پہلو تعلیم کا ایک ضروری جزو ہے۔ لیکن اختلاف یہاں آپڑتا ہے کہ علوم طبعی کے حامی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ جس طریقے سے یہ نتائج حاصل کئے جاتے ہیں وہی تمام افرادِ انسانی کو تعلیم دینے کا طریقہ ہونا چاہیئے؛ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام تعلیم سائنس کے اصولوں کے مطابق ہونی چاہیئے

مجھے اس سے اتفاق کلی نہیں۔ سائنس کے قاعدے کے مطابق مظاہر فطرت کا مشاہدہ اور تجسّس کرنے سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اُن کو جزوِ تعلیم منانے کے متعلق تو ہم ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی تعلیم کا کتنا حصّہ اس طریقے اور اس عمل کے مطالعہ کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ جس سے ہم ان نتائج پر پہنچتے ہیں۔ یہ تو صریح امر ہے کہ سائنس کے مشاہدے اور تحقیق و تدقیق کے نتائج کا انسانی زندگی پر بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ وہ طریقے وہ وسائل جن سے ہم ان نتائج کا استنباط کرتے ہیں ہمارے لئے مطالعہ کا ایک دلچسپ موضوع ہیں۔ علم کسی قسم کا ہو عقلمند آدمی کے لئے دلچسپ ہے اور پھر فطرت کا مطالعہ تو تمام انسانوں کے لئے بلاتفریق دامتیاز دلبستگی کا سامان رکھتا ہے۔ مثلاً یہ معلوم کرنا ایک نہایت دلچسپ امر ہے کہ کس طرح انڈے کی سفیدی سے چوزہ اپنے گوشت پوست ہڈیوں، خون اور پر پرزوں کے لئے مواد حاصل کرتا ہے اور کس طرح وہ انڈے ..... سے وہ گرمی اور قوت اخذ کرتا ہے جو انڈا پھوڑ کر باہر نکلنے میں مدد دیتی ہے، اسی طرح یہ معلوم کرنا بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ جب شمع

جلتی ہے تو موم کاربانک ایسڈ اور پانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ بالکل درست ہے کہ واقعات کے مطالعہ کرنے کی عادت جو فطرت کے مشاہدے سے راسخ ہو جاتی ہے تربیت کے لئے بہت مفید ہے؛ اور طبیعات کے حامی اسکی جو تعریف کرتے ہیں بجا کرتے ہیں۔ مظاہر فطرت کے مطالع میں ہمیشہ مشاہدے اور تجربے سے کام لینا پڑتا ہے، صرف چند خارجی اشیاء یا واقعات ہی پیش نہیں کئے جاتے۔ بلکہ یہ بھی تحقیق کر کے دکھایا جاتا ہے کہ اشیاء اور واقعات جیسے نظر آتے ہیں اصل میں ویسے ہیں یا نہیں۔ صرف یہ بتا ہی نہیں دیا جاتا کہ جب شمع جلتی ہے تو اُس کا موم کاربنگ ایسڈ اور پانی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ جیسے کوئی ہمیں یہ بتادے کہ زید دریا پر کشتی چلا رہا ہے یا وکٹر ہیوگو بہت بڑا شاعر ہے، یا مسٹر گلیڈسٹون نہایت قابل تعریف سیاست داں ہے؛ بلکہ ہمیں یہ ثابت کر کے دکھایا جاتا ہے کہ موم کے کاربانک ایسڈ اور پانی میں تبدیل ہونے کا عمل فی الواقعہ ظہور میں آتا ہے سائنس کی معلومات کی یہی وہ وثوق ہے اور یہی وہ واقعیت ہے جس کی بنا پر سائنس کے حامی اُسے اشیاء حقیقی کا علم کہتے ہیں اور روح انسانیت" کے مطالعہ کی ضد

قرار دیتے ہیں جسکے لئے وہ محض الفاظ کے علم نام تجویز کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پروفیسر ہکسلے نے یہ حکم لگایا کہ صحیح معنوں میں تہذیب و تربیت ذہنی حاصل کرنے کے لئے خالص سائنس کی تعلیم اتنی ہی کارآمد ہے جتنی خالص ادبی تعلیم۔" ایک اور صاحب نے تو یہ دعوی کرنے کی جرات کی ہے کہ۔ اگر کوئی شخص اپنی ذہنی تربیت کے لئے ادب اور تاریخ کو علوم طبیعی کا نعم البدل قرار دے تو یہ اسکی غلطی ہے۔" بہر حال ہم اس افراط کی حد تک پہنچیں یا نہ پہنچیں، یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ علوم طبیعی کے مطالعہ سے واقعات کے مشاہدے کی جو عادت ہو جاتی ہے وہ دماغ کے لئے نہایت کارآمد مشق ہے اور ہر شخص کو اس مشق سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

لیکن تعلیم کے مصلحین اسی پر اکتفا نہیں کرتے وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ علوم طبیعی کی تدریس کو تعلیم کا جزو اعظم بنایا جائے۔ کم از کم عامۃ الناس کے لئے اور جب بحث یہاں پہنچتی ہے، تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرا اور علوم طبیعی کے حامیوں کا جن کیساتھ میں ابتک کلی طور پر متفق تھا، رستہ جدا ہے۔ میں کوشش کرونگا کہ میں اگر اب انکی رفاقت نہیں کر سکتا جو روش میں نے اپنے لئے نکالی ہے اسپر نہایت حزم احتیاط اور سلامت روی سے گامزن ہوں طبیعات

مشکل الفہم قاعدوں سے مجھے محدود واقفیت ہے اس کا احساس ہر وقت مجھے دامنگیر ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ اپنی کم علمی کی وجہ سے کہیں اُنکے متعلق کوئی خلاف واقعہ بات کہکر اُنکی حق تلفی نہ کر بیٹھوں علوم طبیعی کیطرفدار قیل وقال کے ایسے ماہر اور بحث و مباحثہ کے معرکوں کے لئے ایسے آمادہ ہیں کہ اُنسے عہدہ برا ہونا مشکل مرحلہ ہے اس بنا پر میں وہ طالبعلمانہ استفسار کا لہجہ اختیار کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو مجھ جیسے مبتدی علم اور محدود قابلیتوں کے آدمی کو زیبا ہے۔ ایک بات مجھے محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ اصحاب جو علوم طبیعی کو عامۃ الناس کے نصاب تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت دینا پسند کرتے ہیں۔ ایک نہایت ضروری بات نظر انداز کر جاتے ہیں یعنی۔ لیکن میں اس کے متعلق آپ کے سامنے اظہار خیالات کرنا چاہتا ہوں اور میرے خیالات ایسے امور پر مبنی نہیں ہیں جو غیر معروف اور دور از کار ہوں، بلکہ ایسے امور پر جو آئے دن ہمارے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ جو سادہ ترین الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں، اور جنکی اہمیت سے مجھے امید کامل ہے کہ، ارباب سائنس کو انکار نہ ہوگا:۔

(باقی دارد)

مترجم ("ہ") میتھیو آرنلڈ

رُباعیات

(۱)

آنکھوں کو چمن میں جستجو ہے تیری
جا پردۂ گل میں مثل بو ہے تیری
پایا نہیں کچھ نشاں سوا پردے کے
سنتے ہیں نمود سو بسو ہے تیری

(۲)

یہ ارض و سما، یہ آفتاب و مہتاب
ہیں قلزم بیکران ہستی کے حباب
امواج ہوا کے آبگینہ خانے
تعمیر ہوئی ہے جن کی بر روئے آب

"ہ"

بیر کی سرگزشت

ذیل کے مضمون کی شانِ نزول جناب مصنّف ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ ایک روز علی الصبح موسمی بیر کو دیکھ کر خواجہ صاحب کی صدا دفتہ" کانوں میں گونجی۔ جس نے باوجود بے بضاعتی خواجہ صاحب کے تتبع کی جراءت دلائی۔۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ان کا منکسرانہ حسنِ معذرت بھی قابلِ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔" سی پارۂ دل کے دیکھنے والے لطف زبان اور نکاتِ تصوّف۔ تبحرِ علمی کی چاشنی تلاش نہ کریں، بلکہ قوّتِ استفادہ کا جواب مضمون سمجھیں۔

ایک خوش ذائقہ۔ شیریں تُنک چھوٹا سا پھل ہے۔ جو آلوچہ یا چھوارہ کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا درخت اکثر گنبد نما چھتری دار ہوتا ہے۔ پتّے باہر کی طرف سے سبز چکنے اور اندر کی طرف سے کھرکھرے اور رگدار۔ قلم لگانے سے شیریں اور ذائقہ میں سیب کو شرماتا ہے۔ بدوں قلم کھٹ مٹھا ہوتا ہے۔ جس کو نمک مرچ کیساتھ کھانے سے زبان چٹخارے لیتی ہے۔ جھاڑی نما جنگلی بیری کے بیر چینپ دار ہوتے ہیں۔ کھانے میں ترشی کی ڈلیاں منہ میں گھلتی ہیں۔ بالعموم تین قسمیں ہوتی ہیں۔ قلمی (توپڑا اسی میں شامل ہے) کھٹ مٹھے جنگل کے ترش بیر۔

یہ اقسام تقریباً اختلاف جسامت اور ذائقہ کے اعتبار سے ہوئیں۔ ورنہ ہر ایک میں جداگانہ لذت ہے۔

جس کا تغیّر باوجود ایک نوع ہونے کے چشم حیرت کو نور بخشتا ہے۔ فیشن ایبل نوجوان زیادہ پسند نہیں کرتے۔ لیکن غریبوں کو وہ بھی نہیں ملتے کیونکہ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی زمانہ کی عالمگیر گرانی نے ان سب کی قیمت میں قدرے وزن پیدا کر دیا ہے۔ از روئے طب اس کا مزاج سرد و خشک ہے۔ مفرحِ قلب و دماغ ہے۔ قلیل الغذا صالح الکیموس۔ ردی گرمی کو بجھاتا ہے۔ ترش بیر دماغ پر ابخرے چڑھنے نہیں دیتا۔ صفرا پیاس کو دفع کرتا ہے۔ اس کا پانی جگر کا سدہ کھولتا ہے۔ آنتوں اور معدے کے کیڑے مارتا ہے۔ اس کی لکڑی کا برادہ خون بہنے کو بند کرتا ہے۔ آنتوں کے زخم اور دستوں کو نافع ہے۔ پتّوں کا لیپ ورم حار کو پکاتا ہے۔ پتّوں کے جوشاندہ کا پاشویہ دماغ پر

اجزات چراٹھنے نہیں دیتا۔

جنگلوں میں غریب کسانوں کا رزق معنت وخداداد ہے۔ شہر میں ناقدردان حریصوں سے بدوں ادائے زرفیس بات نہیں کرتا۔ رات کو طیور کا میزبان ہے تو دن کو چرندوں کے واسطے پتّوں کا خوان عام بچھاتا ہے تشنہ لب کی دفع تشنگی کا سرچشمہ۔ مسافر گرسنہ کا توشہ۔ آب وغذا کا جامع۔ غرض ہر مہمان کے واسطے اپنے سبز مخملی شامیانہ میں شبانہ روز خوان نعمت بچھاکر بدوں افتراق حیوان وانسان کی خدمت بجالاتا ہے آج کل اس کی فصل ہے۔ بیری کے درخت بیروں کے گچھوں سے لدے ہوئے ہیں۔ ہرے ہرے پتّوں میں زرد اور سرخ رنگ کے بیر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ گویا ایک عروسِ نازنین سبز اطلس کا جوڑا زیب تن کئے ازسرتاپا زیورات سے آراستہ ہے۔ ڈالی ڈالی متوالی اور خالق الارض والسموات کی عطائے نعمت پر سربسجود ہے۔ گرانمایگی سے ہر وقت سر لچکا ہوا ہے تاکہ شانِ تکبّر نہ پیدا ہو۔ "نہد شاخ پر میوہ سر برزمین" کی صحیح مصداق ہے۔ پتّوں کے لاکھوں ہاتھ اچک اچک کر مہمانوں کو اشارہ سے بلاتے ہیں۔ اور گھنے سایہ کے ہموار شامیانہ میں بٹھاکر اس کی دعوت میں اپنے جگر گوشہ پیش کرتے ہیں۔ کانٹے نازک ہیں، تاکہ کسی ذی روح کی تکلیف کا باعث نہ ہوں۔ یہ صرف اُن حریص نادانوں کے واسطے ہیں جو خام اور پختہ میں فرق نہ کرکے خام کھانے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پھل اور کانٹے گویا جمالی وجلالی شان کے دو نمونے ہیں جن کا اجتماع عالم کائنات میں ضروری ہے۔ یا کشمکش حیات میں درشتی ونرمی کی دو مجسم تصویریں ہیں جن پر بقائے زندگی کا مدار ہے۔ جو بیر پختہ ہوکر قوت ہضم کے لائق ہوجاتے ہیں، وہ خود گر پڑتے ہیں یا دست طلب کے دراز ہوتے ہی سائل کی مٹھی بھر دیتے ہیں۔ لیکن حریص انسان ڈھیلوں اور لکڑیوں سے پیٹتا ہے اور شدّت حرص سے خام پھلوں کو بھی کچّا چبا جانے کی خواہش کرتا ہے۔ درخت اس خام خیالی، اور مضرت کے اندیشہ سے کانپ جاتا ہے اور انتہائے تحمل وضبط سے اپنے اعضا تک کو مع خام پھلوں کے اس کے حوالہ کردیتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اے نادان انسان تیری بے صبری سے خام پھل مضر ثابت ہونگے۔ تجھے یاد نہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ایک روز علے الصباح طائرانِ خوش الحان کے ترنم ریز نغموں نے سیرِ سبزہ زار پر مجبور کیا۔ بیری کا باغ سامنے تھا۔ موسمی پھل کی رغبت دامن دل کے

اُلجھانے کو خار ہو گئی۔ اندر جا کر اور ہی تماشا دیکھا۔ درختوں کے پتّے آبِ شبنم میں غسل کئے ہُوئے جھوم جھوم کر تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔ ڈالیاں مراقب ہیں۔ طیور کے قوال یادِ حق کے ترانے گا رہے ہیں بیر گریبان چاک اور عالمِ وجد میں نوکِ مژہ سے قطراتِ اشک کے چمکدار موتی گرا رہا ہے۔

مَیں اندر گیا۔ بادِ صبا کے دربان نے نہایت پھرتی سے میرا وزیٹنگ کارڈ درخت کو دیا۔ میزبان سے اجازت پا کر ڈالیاں جھومیں اور اپنی خداداد سُریلی آوازمیں نعرہ ہائے خوش آمدید بلند کرنے لگیں بتوں نے بے شمار ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر سر جُھکا جُھکا کر تسلیم کی نذریں پیش کیں۔ کانٹے مہمان کو دیکھ کر شرم سے پتّوں میں روپوش ہُوئے۔ درخت کا اشارہ پا کر۔ چند سرخ اور سینہ دریدہ بیر میرے قدموں پر گر کر لوٹنے لگے۔ مَیں نے ایک بیر کو اُٹھا کر چند سوال کئے۔ تو سُرخ کیوں ہے؟ سبزی و زردی و سُرخی کے تین رنگ بدلنے کی کیا وجہ ہے؟ سینہ کیوں چاک ہے؟ میری جوع الحرص کے دفعیہ کے واسطے اپنی ہستی مٹانے میں تو نے کیوں سبقت کی۔ اور دوسرے بیروں کی ڈھال میں تو نے اپنا سر کیوں نہیں چھپایا۔ اس بزرگیِ سن اور تجربہ کاری پر یہ نادانی ضرور قابلِ تعجب ہے۔

بیر نے ایک خندۂ حسرت انگیز کے ساتھ جواب دیا۔ سُنو! سبز رنگ جوانی کا ہے، جو خامی کے زمانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مَیں جبتک خام تھا سبز رنگ کہلایا۔ جب فکر و غور کا مادہ پیدا ہُوا تو زردی چھانی شروع ہُوئی۔ جب اپنی غرض و غایت پر نظر پڑی تو عشقِ فنا نے بیتاب کر دیا۔ دل و جگر کباب ہو گیا مُنہ جُھلس گیا۔ دیکھو سینہ میں زخم ہے گوشت پوست کے پار نظر کر کے استخوان بھی دیکھ سکتے ہو۔ لیکن زخم کی طرف خیال نہ کرو۔ بلکہ نشان اور صورتِ زخم میں الف کا جلوہ دیکھو۔ ابتدائے شعور سے اس کی تلاش تھی۔ لیکن درد پیدا ہوتے ہی میرا مطلوب خود میری ذات۔ دل و جگر میں سما گیا اور مجھ ہی سے ہویدا ہو گیا اب مَیں اور وہ دونوں ایک ہیں۔ جس کا نام تم نے بیر رکھ لیا ہے۔ اب ایک سوال تمہارا باقی ہے جس کا جواب یہ ہے کہ گو میرے محبوب کے آثار و کیفیات مجھ میں ہویدا ہو گئے۔ اور اُس نے مجھ میں جلوہ نمائی کی۔ لیکن یہ عارضی ہے۔ چاہتا ہوں کہ بقائے دوام حاصل ہو۔ اور جلد سے جلد اپنی ہستی کو فنا کر کے ایسی طاقت پیدا کر دوں کہ میری ایک ذات کے فنا ہونے سے کروڑوں ذاتوں میں میرا ہی جلوہ نظر آئے

میری ہی صورت دیکھے۔ میرا ہی نام باقی رہے۔ اسی کو
وحدت فی الکسر کہتے ہیں۔ جس کو تم بیری یعنی درخت
کہہ رہے ہو۔ وہ اور میں دو چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ
بیری بھی بیر کی گٹھلی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ نام
علیحدہ ہیں۔ لیکن حقیقت ایک ہی ہے۔ اس موقعہ پر
یہ بغیر کہے نہیں رہ سکتا۔ کہ ان تمام ترقیوں کا گُر اور
خالق تک رسائی کا زینہ محض خدمت خلق ہے۔
اور یہی فنائے فی الخدمت الخلق فنائے فی الخالق
کہلاتی ہے۔

دیکھو! میرے پتے چرندوں کی شکم سیری کے
کام آتے ہیں۔ پھل سے انسان و حیوان کا تغذیہ
ہوتا ہے۔ آروں سے جسم چیر کر تختے بنائے جاتے
ہیں۔ جن سے اہل قبور کے کاشانہ گلی کی سقف
تیار ہوتی ہے۔ کانٹے غربا کی خام قبور پر بغرض تحفظ
لگائے جاتے ہیں۔ میرا مورث اعلےٰ سدرہ آسمان ہفتم
پر فرشتہ قدس کا فرودگاہ ہے جو اعمال کا منتہائے مقام
ہے۔ میرے محسن بہشت میں ہیں۔ میں پستی میں ہوں
اپنی زبون حالت پر شرماتا ہوں۔ لیکن ممکن ہے کہ
اس تدبیر سے اُن کا ہم پلہ ہو سکوں۔

بیر کی محیر العقول تقریر سنکر عجیب حیرت
ہوئی۔ اور خیال آیا کہ انسان جو اشرف المخلوقات
ہے۔ اگر ایک بیر کے منازل فنا و بقا پر بھی غور
کرے۔ تو کافی سامان ترقی اور دائمی زندگی کا پیش خیمہ
ہو سکتا ہے۔ جسم و رُوح کے درخت میں عرفان
خداوندی کا قلم لگائے تو کبھی شیرینی داثر میں
فرق نہ ہو۔ خدمت خلق بہر رضائے خالق کرے تو
سدرہ کیا لامکان بھی اس کی ترقی عروجی کا گام اولیں
ثابت ہو سکے

سر روحانیاں داری ولے خود را ندیدستی
بخواب خود درآ تا قبلۂ روحانیاں بینی

محمد علی خاں اثر

منشی فاضل۔ رامپوری

لسان العصر اکبر مرحوم

اس کے اقوال رازدارِ ممات — اس کے اشعار نکتہ سازِ حیات

جب ملا شاعروں کو حسنِ قبول — ق — اور پھر اُن کو مختلف درجات

اُس نے پائی زبانِ نکتہ طراز — اُس نے پایا کلام خندہ صفات

غرق اُس کی زباں تمسخر میں — ہر تمسخر میں اُس کے تلمیحات

آئینہ دارِ غم تھی اُس کی ہنسی — اُس کے ہنسنے میں لاکھ لاکھ نکات

اُس کی ہر نظم کے معانی میں — قوم کی زندگی کی تصریحات

اُس کی تفسیرِ عاشقی کو دوام — اُس کی تشریحِ زندگی کو ثبات

ذہن پر بارشیں تصوّف کی — یعنی ہر لفظ میں تجلّیات

اُس کی تلقین علم کا سورج — اور تہذیبِ نو اندھیری رات

لاکھ مضموں اور اُس کی ایک ٹھٹھول

سو تکلف اور اُس کی سیدھی بات

"حالی"

جلال الدین اکبر

انجمن ارباب علم

کے

انعامی مقابلہ کی چند نظمیں

(باقی نظمیں وقتاً فوقتاً پیش کی جائینگی)

نور جہاں

دہر میں مہرالنسا اِک نیر تاباں ہے تو
تیری آمد باپ ماں کی خوش نصیبی کا نشاں
ایک دن تھی باپ کی تجھ پہ حقارت کی نظر
تھی خبر کس کو کہ قدرت مہرباں ہو جائیگی
یاد ہے اہل زمانہ کو وہ ساری سرگزشت
باپ کو تیری محبت تھی نہ ماں کو کچھ خیال
غیر اپنے ہوگئے جب فضل یزداں ہوگیا

نازشِ ہندوستاں سرمایۂ ایراں ہے تو
مٹ گئی نکہت بڑھی پھر آبروئے خاندان
ماں نے پھینکا گود سے ناچیز تجھ کو جان کر
زیر فرماں کشور ہندوستاں ہو جائیگی
یا خدا کی ذات تھی یا تو تھی اور دامانِ دشت
دشتِ غربت میں نگہباں تھا خدائے ذوالجلال
قافلے کا قافلہ تیرا نگہباں ہوگیا

رحمتِ باری تعالےٰ سے جو تو ہمدوش تھی
پھر وہی تو تھی وُہی ماں باپ کی آغوش تھی

الغرض دہلی پہنچتا ہے بدیسی کارواں
قصرِ شاہی تک پہنچ جاتا ہے تیرا خانداں

سایہ ساں بڑھتی ہے تو ہے مہرباں ربِ غفور
رنگ لاتا ہے جہاں میں پھر ترا حسن و شعور

تیرے اندازِ تغافل سے دلِ شیدا دو نیم
سادگی تیری ہُوئی برہم زنِ طبعِ سلیم

کرگئی کیا کام نادانستہ تیری سادگی
اِک اشارے پر فدا تھی شاہی و شہزادگی

حالِ پروازِ کبوتر کہہ سُنایا کس طرح
کہہ کے "بس یوں اُڑ گیا" دل کو اُڑایا کس طرح

رفتہ رفتہ حسن تیرا رنگ دکھلانے لگا
دِلربائی کا غرض ساماں نظر آنے لگا

شیر افگن پھنس گیا ان گیسوؤں کے جال میں
بس اسی نسبت سے پہنچایا تجھے بنگال میں

شاعروں کو ہے تری زلفِ چلیپا کا خیال
ورنہ کیوں مشہور ہیں عالم میں بنگالہ کے بال

تھا جو تیرے حسن بے پردا پر اک عالم نثار
شیر افگن ہو گیا جوشِ رقابت کا شکار

آب و دانہ کھینچ لایا پھر جہاں آباد میں
پھر ترقی تھی کسی کے نالہ و فریاد میں

کشمکش حسن و محبت میں رہی چندے بپا
رفتہ رفتہ بن گئی نورِ جہاں مہرالنسا

بندۂ بیدام تیرا آسماں پیری میں تھا
سکّہ تیرے نام کا دورِ جہانگیری میں تھا

اپنے انداز و ادا سے کر لیا وحشی کو رام
تھی سریرِ سطوتِ شاہی کی قیمت ایک جام

وہ مہابت کی بغاوت بھی زمانہ کو ہے یاد
اور وہ تیری شجاعت بھی زمانہ کو ہے یاد

ہند کی تاریخ میں ہے قید تیری یادگار
شاہ کو ہمراہ لیکر وہ تیرا ہونا فرار

ہاں نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی وہ بزم آرائیاں
محفلیں ہونگی بہت لیکن وہ باتیں اب کہاں

باغِ عالم میں بہاریں یوں تو آئیں گی بہت
بلبلیں بھی شاخِ گل پر آکے گائینگی بہت

جمگھٹے ہونگے حسینوں کے بہت گلزار میں
عیش کے جلسے جمیں گے دامنِ کہسار میں

ہاں مگر عہدِ جہانگیری نہ آئے گا کبھی
وہ مزے کے دن زمانہ پھر نہ پائیگا کبھی

فیض سے جن کے ہوا ہندوستاں جنت نشاں
قصۂ ماضی ہُوئی ہے آج اُن کی داستاں

گھر ہوئے ویران لیکن مقبرے آباد ہیں اُن کے افسانے مگر اب تک جہاں کو یاد ہیں
یا خدا ہندوستاں کے کب بھلے دن آئینگے کون دن ہوگا کہ آزادی کے نغمے گائینگے

نور جہاں

افسوس، ہزار داستان کی تنگ دامانی نے اجازت نہ دی، کہ اس نظم کے شروع کے کچھ بند جو ایک نہایت مرصع "پیرایۂ آغاز" تھے درج کئے جاتے۔ مدیر

وہ نور جہاں تاجرِ بے مایہ کی دُختر قسمت نے بنایا جسے ہمدوشِ سکندر
ہیں جس کی تجلّی سے درو بام منوّر نازاں ہے زمیں مملکتِ ہند کی جس پر
یہ چاند نہ نکلا تھا ابھی برجِ شکم سے
ماں باپ کو عسرت نے نکلوایا عجم سے

ہمراہ نہ ساماں نہ کوئی حامیؔ و ناصر رنگِ غم و اندوہ تھا رخساروں سے ظاہر
دل سرد بدن زرد پریشانیِ خاطر اس طرح روانہ ہوئے ایراں کے مسافر
یہ عالمِ غربت انہیں تصویرِ عدم تھا
مرزا پہ مصیبت تھی تو بیگم کو الم تھا

وہ راہ پہاڑوں کی وہ سنسان بیاباں ہر سمت مصیبت کے وہ آثار نمایاں
کثرتِ غم و اندوہ کی وہ شامِ غریباں وہ بید کی مانند شجر خوف سے لرزاں
دل شدتِ اندوہ سے بیتاب ہوئے تھے
شیروں کی صداؤں سے جگر آب ہوئے تھے

سو درد کی تصویر تھا اِک عالمِ غربت سایہ نہ کہیں چاہ نہ آرام کی صورت
وہ دھوپ وہ میدان وہ آثار قیامت پاؤں میں سکت اور نہ تنِ زار میں طاقت

یوں درد سے بیگم ہوئی اس حال میں بیکل
جس طرح پرندہ ہو کوئی جال میں بیکل

اس درد سے تھی پیش نظر موت کی تصویر — حیران تھا شوہر کہ کروں کونسی تدبیر
اب دیکھئے دکھلاتی ہے کیا گردشِ تقدیر — ہے کون جو بتلائے مرے خواب کی تعبیر

عسرت ہے غریبی ہے مصیبت کا سماں ہے
امکانِ اقامت ہے نہ سامانِ اماں ہے

ناگاہ وہ میدان ہوا مطلع تاباں — خورشید ہوا پردۂ مشرق سے نمایاں
یا درجِ صدف سے نکل آیا در غلطاں — آباد ہوا فرطِ خوشی سے دلِ ویراں

عمدہ کی آغوش میں اک لعبتِ چیں تھی
یا محفلِ ماتم میں کوئی ماہ جبیں تھی

یہ اور الم دشت میں قسمت نے دکھایا — زندانِ مصیبت میں غریبوں کو پھنسایا
کس منزلِ غم میں یہ نیا چاند ہے آیا — اب یار و مددگار فقط تو ہے خدایا

ہر گام پہ فریاد تھی نالہ تھا فغاں تھی
اس لعبتِ چیں کی انہیں ہمراہی گراں تھی

تھا اس ننے ساتھی سے سفر اور بھی دشوار — مادر نے رکھی صبر کی سل سینے پہ ناچار
اور ڈال دیا فرشِ زمیں پر درِ شہوار — جس طرح لٹاتا ہے گہر دیدۂ خونبار

سینے سے الگ پھینک کے اس لختِ جگر کو
اُس سمت روانہ ہوئے جانا تھا جدھر کو

ناگاہ کوئی قافلہ والا ادھر آیا — یہ ماہ اسے فرشِ زمیں پر نظر آیا
آغوش میں دل فرطِ محبت سے بھر آیا — بولا کہ مری شاخِ امل میں ثمر آیا

آغوشِ محبت میں لیا اس کو اُٹھا کے

مسرور تھا یہ گنجِ گراں غیب سے پا کے

سوچا کہ مری گود تھی اولاد سے خالی بے بہرہ ثمر سے تھی مرے نخل کی ڈالی

پھرتی تھی نگاہوں میں یہ تصویر خیالی تقدیر کی خوبی نے یہ حسرت بھی نکالی

کافی ہے جو مل جائے خداوند کے در سے

دختر ہی یہ مجھ کو تو فزوں تر ہے پسر سے

اس دشت میں تھی اب اُسے دایہ کی ضرورت تا طفلکِ دو روزہ کے جینے کی ہو صورت

ہر سمت عناں تاب تھا وہ صاحبِ دولت لیکن نہ میسّر تھا کہیں شیرِ محبّت

قسمت کھلی آخر اسی دامانِ قبا کی

دایہ جو ملی ماں تھی اسی مہر نسا کی

والد نے کہا دل میں کہ یہ دخترِ خوشتر ہے محفلِ ہستی میں نصیبے کی سکندر

چھوڑا تھا اسے ہم نے تو منحوس سمجھ کر آرام ہُوا اس کی بدولت ہی میسّر

اس عمر میں آرام دیا اہلِ الم کو

اب اس کی جواں بختی پہ امید ہے ہم کو

اللہ کو منظور جو تھی اُن کی بھلائی تقدیر انہیں مملکتِ ہند میں لائی

اور ہو گئی دربار شہنشہ میں رسائی مرزائے الم دوست کی امید بر آئی

اکبر نے سرِ برگِ جلالی اسے بخشا

دربار میں اک منصبِ عالی اسے بخشا

اکبر کی حکومت تھی نہ علم تھا پیدا ہر طرح کی تعلیم کے ساماں تھے مہیّا

دنیا میں ہوئی مہر نسا علم میں یکتا ہر فن میں دیا اس کو خدا نے ید طولیٰ

اور اس پہ مئے حسن نے مدہوش کیا تھا

اس نور نے قندیل در آغوش کیا تھا

یہ برق گری دل پہ جہانگیر کے آخر اس تیغ جہاں سوز کا جو ہر ہُوا ظاہر
ہر لحظہ یہ فقرہ یاد تھی یا حامی و ناصر میں مایۂ ایماں کی حفاظت سے ہوں قاصر

لیکن نہ چھپانے سے چھپا رازِ محبت
اکبر پہ عیاں ہو کے رہا رازِ محبت

یہ سُن کے ہُوا ظلِّ خدا فکر میں غلطاں شہزادہ کی حرکت پہ تھا انگشت بدنداں
مرزا پہ بالآخر یہ کیا راز نمایاں فی الفور ہُوا مہر کی تزویج کا ساماں

خورشید نمایاں ہُوا ڈھاکے کی زمیں سے
منسوب ہُوئی مہر قلی خانِ حزیں سے

وہ راب فنا موت نے جب شہ کو پلایا اور ہند کا اورنگ جہانگیر نے پایا
تب قطب کو گردوں نے قلی خاں سے لڑایا شمشیر نے آغوش میں دونوں کو سلایا

روپوش ہُوا شیر فگن غارِ اجل میں
داخل ہُوئے پسماندہ شہنشہ کے محل میں

اسلام نے بیوہ کو عطا کی ہے فضیلت ہر مردِ مسلماں پہ ہے فرض اس کی محبت
خود بانیٔ اسلام نے کی اس سے مروّت ہوتی نہ جہانگیر کو کس طرح سے اُلفت

یکسو جو ہُوئی ماتمِ مقتول کی صف سے
شادی کا پیام اس کو ملا شہ کی طرف سے

ہر چند کیا عذر پریشانیٔ خاطر راضی ہُوئی پیغامِ شہنشاہ پہ آخر
اور چاند ہُوا کا رخ جہانگیر سے ظاہر آفاق میں ہمدوش ہُوئے رفتہ و حاضر

کیا نیک گھڑی اس کے جواں بخت پہ آئی
اِک آن میں مسند سے اُٹھی تخت پہ آئی

سر اس کا سرافراز ہُوا بالِ ہما سے اور نور جہاں ہوگئی وہ مہر نسا سے

پرنور ہوئی محفلِ آفاق ضیا سے	سیراب ہوئے تشنہ دہن آب سخا سے
چاہت تھی جہانگیر کو اِک ساغرِ مل کی
اور نور جہاں مالک و مختار تھی کل کی

اِک عمر کیا تختِ فلک بوس پہ اجلاس	ناگاہ سرِ شاہ پہ چھایا چترِ یاس
آئی نہ کوئی محفلِ ہستی میں دوا راس	اور توڑ دیا موت نے سر رشتۂ انفاس
دنیا سے گیا کوچ شہِ نیک سیر نے
لاہور کی مٹی میں کیا دفن پسر نے

خوں آنکھ سے برسوں جو غمِ شہ میں بہایا	اور آتشِ فرقت میں دل و جاں کو جلایا
مہجور نے اس بزم سے ہاتھ اپنا اُٹھایا	اور گلشنِ فردوس میں کاشانہ بنایا
منزل اسی معمورۂ دلجو میں بنائی
تعمیر جہانگیر کے پہلو میں بنائی

اے نور جہاں اے گلِ پروردۂ صحرا	اے حور ارم اے چمن آرائے تمنّا
دیکھی ہے تری آنکھ نے نیرنگیٔ دنیا	ہے تجھ پہ عیاں گردشِ دوراں کا تماشا
تو خار بدامن بھی ہوئی غیرتِ گل بھی
بے یار و مددگار بھی اور مالکِ کل بھی

ہوتا نہیں سینے میں نہاں جوشِ طبیعت	چھپتا ہے چھپائے سے کہیں مقصدِ فطرت؟
کی علم و فضیلت نے عیاں طبع کی جودت	پیدا تری مٹی سے ہوا گلشنِ حکمت
لب زمزمہ پرداز ہوئے ذوقِ سخن سے
یا کھینچ لیا عطرِ گلِ صحنِ چمن سے

دانائے تکلم ہے شناسائے سخن ہے	آرائشِ ایوانِ سلاطینِ کہن ہے
خورشید جہانتاب ہے یکتائے زمن ہے	تو حلقۂ مردم میں زنِ شیر فگن ہے

ہر مرد خرد مند نے پہچان لیا ہے
اور فنِ سیاست میں تجھے مان لیا ہے

سچ یہ ہے تری ذات پہ نازاں ہے خدائی — کرتا ہے ترے در پہ جہاں ناصیہ سائی
گردوں پہ ترے فکرِ رسا کی ہے رسائی — ہے یاد عنادل کو تری نغمہ سرائی

تیرے گلِ مضموں ہیں جو دامانِ صبا میں
مصروف ہیں مرغانِ چمن تیری ثنا میں

ہے شام و سحر اسپِ فلک گرمِ تگا پو — آرام سے اب حشر تلک زیرِ زمیں سو
مصروف تری نوحہ گری میں ہیں سخنگو — جی کھول کے اے چشمِ گہر بار یہاں رو

شمعوں کی ضیا ہے نہ عنادل کی صدا ہے
یہ قبر نہیں منزلِ اندوہ فزا ہے

نورجہاں

سازِ الفت تشنہ و بیگانۂ مضراب تھا — بحرِ ذخارِ محبت خشک تھا پایاب تھا
دیکھتا تھا دل رہِ غارت گرِ ایمان و ہوش — آفتِ جاں کے لئے خود جان تھی صرفِ خروش
بربطِ عشاق تھا بے نغمۂ ناز و نیاز — عشق کہتے ہیں کسے؟ تھا اک معمّا ایک راز
ساقی و مطرب کی تھیں بے کیف سب رنگینیاں — غم زدا مے تھی، نہ فرحت زا ترنم ریزیاں
زخمۂ سازِ محبّت! یعنی اے مہرالنسا! — تو نے آ کے آتشِ افسردہ کو بھڑکا دیا

عشق کے بے جان قالب کو ملی تازہ حیات!
بھر گئی جذباتِ الفت سے فضائے کائنات!

اے کتابِ حسن! اے سرنامۂ تحریرِ عشق! — شرح و تفصیلِ محبت! متن و تفسیرِ عشق!

حکمرانِ کشورِ دل! فاتحِ ملکِ دماغ!
تاجِ اکبر کی ضیا! مشکوئے بابر کے چراغ!

ہو گئی تیری حکایت دہر میں ضرب المثل
مرحبا! آنے نہ پایا تیری عفت میں خلل

حیرت افزا ہے تری دوشیزگی و بیوگی
کعبۂ دل میں شہنشاہی کی کچھ وقعت نہ تھی

وہ شباب و حسن اور وہ عیش سامانی تری
فخر کے قابل ہے بیگم! پاک دامانی تری

قلعۂ فولاد تھا کوئی کہ یہ تیرا ضمیر
پا سکی جس پر نہ قابو رفعتِ تاج و سریر

عزتِ ایران! اے "نورِ جہاں" .... غیاث!
تیرا ضبطِ نفس و عفت شوکت و اوجِ اناث

امتحاں ایسا زبیدہ کو نہ تھا دینا پڑا
چاند بی بی پر یہ مشکل تھی نہ وقت اتنا کڑا

گو رضیہ نے دکھائے خوب مردانہ ہنر
معترض تاریخ ہے اس کے مگر اخلاق پر

قصۂ شیریں بھی گویا عامیانہ ہو گیا
تیرا اے بیگم! وہ پُر معنی فسانہ ہو گیا

راکھ ہو جانا چتا میں سہل ہے آسان ہے
زندہ رہ کر جو رہے ثابت قدم انسان ہے

شاہ بیگم ہو کے بھی تو فرض سے غافل نہ تھی
خدمتِ ملک و تمدن کچھ نہ کچھ کرتی رہی

ہاں بھرا کی شیشۂ ہندی میں ایرانی شراب
تیری جو ایجاد تھی بے مثل تھی اور لاجواب

تو نے اپنے ہاتھ سے کھولیں سیاسی گتھیاں
منحصر تھا تیری خوش تدبیر پر امن و اماں

شہرۂ آفاق ہے وہ کار آگاہی تری
وہ جہانگیری تری وہ سطوت شاہی تری

زندۂ جاوید بیگم! آج تیری قبر پر
مرثیہ خواں حسرتیں ہیں اور عبرت نوحہ گر!

وہ جہانداری نہیں ہے آہ! وہ شاہی نہیں
وہ جہانگیری ہمایونی و جم جاہی نہیں

شوکتِ تیمور و بابر سطوتِ اکبر مٹی
لٹ گئی حشمت وہ شانِ رایت و افسر مٹی

آہ اے مہر النسا! شمعِ شبستانِ نشاط!
انقلابِ دہر نے روندی الٹ دی وہ بساط!

اے غریب و بے سر و سامان بیگم! آہ آہ!
آج ہے بے حاجب و دربان تیری خوابگاہ!

اجنبی کو روکنے والا یہاں کوئی نہیں سونے والی! تیری عظمت کا نشاں کوئی نہیں
ہو گئے یوں تو اور بھی ویرانے اور عبرت کدے ذرّے تیری خاک کے حسرت سے ہیں یہ کہہ رہے

"بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے"

"نے پر پروانہ آید نے صدائے بلبلے"

سید علمدار حسین واسطی بنوڑ

شاعر

ساری دُنیا سو رہی ہے اور تو بیدار ہے دُور ہے راحت سے اور لذّت کش آزار ہے
لے رہا ہے ذرّے ذرّے سے تو عبرت کا سبق یعنی ہر ہر گام پر ہوتا ہے سینہ تیرا شق
تیری نظریں دیکھتی ہیں انتہا آغاز میں محو ہو جاتا ہے جب تو انکشاف راز میں
ظاہری رنج و الم سے دل ترا بیگانہ ہے انکشاف راز یزدانی میں تو دیوانہ ہے
مضطرب ہوتی ہے تیری رُوح لہریں دیکھ کر تو سمجھتا ہے انہیں سے کیا ہے انجام بشر
تو کبھی کرتا ہے تاروں سے خطاب پُر ملال کسقدر وسعت نما ہے تیری دُنیائے خیال
دیکھ کر پھولوں کو روتا ہے کبھی تو زار زار وجد میں کرتا ہے اپنا ہی گریباں تار تار
قطرۂ شبنم ہیں گویا اِک کتاب زندگی دیکھتا ہے جس کو تو پڑھ پڑھ کے خواب زندگی
تو ہے عکاس ازل فطرت میں تیری درد ہے گو بظاہر خوش ہے لیکن لب پہ آہِ سرد ہے
تو خزاں میں دیکھتا ہے موسم گل کی بہار ثبت کرتا ہے در و دیوار پر نقش و نگار
تو نے فطرت کے سبق کو پھر سے دہرایا یہاں آشکارا کر دئے جو راز تھے اب تک نہاں
تیرا دل گنجینۂ انوار سے معمور ہے تیری نظروں میں ہر اِک ذرّہ سراپا طور ہے
تو بناتا ہے کبھی اس طرح کے نقش و نگار جن سے ہو جاتی ہے فطرت کی تجلی آشکار
اے کہ تیری ذات سے ہے رونق بزم جہاں اے کہ ہستی ہے تری سرمایہ دار کن نکاں

اے کہ تو ہی بخشتا ہے تو مِ مردہ کو حیات
اے کہ تیری ذات سے قائم ہے نظم کائنات

اے کہ تیری ذات سے ہے رونق بزم شہود
اے کہ تیرے رنگ سے ہر شے میں ہے رنگ نمود

تو نہ ہوتا تو نہ ہوتا یہ جہانِ رنگ و بو
تو نہ ہوتا تو نہ ہوتی حسن کی کچھ آبرو

تو نہ ہوتا تو نہ ہوتے منکشف رازِ حیات
تو نہ ہوتا تو نہ ہوتا نقشِ فانی کو ثبات

ابو محمد ثاقب

شعر

مظہر جذبات عشق! آئینہ تصویر حسن!
شوخیِ تحریرِ الفت! لذت تصویر حسن!

دردِ آہ دل خراش و قطرۂ خون جگر!
شعلۂ مجلس فروز و نکتۂ دلکش اثر!

شیشۂ صہبائے ناز و بادۂ کیفِ نیاز!
جرعۂ جامِ حقیقت ساقیِ بزم مجاز!

نالۂ شبگیر فرقت! شرح لطفِ انتظار!
دفتر شوق وصال و مختصر احوال زار!

شکوۂ دردِ جدائی نوحۂ جور و جفا!
زور دریائے محبت! شور سودائے وفا!

ترجمانِ حالِ دل کیفیتِ سوز و گداز!
شرح خوش عنوان رازِ عشق رُوداد نیاز!

نغمۂ سازِ معانی زخمۂ تارِ بیاں!
شمع مشکوئے ادب اور جوہر تیغ زباں!

شہپر مرغ تخیّل! رفعتِ پروازِ فکر!
قطرۂ نیسانِ طبع و قوت شہباز فکر!

ہے بجا کہنا تجھے مشاطۂ گیسوئے حسن
ترکش تیر نظر تیغ خم ابروئے حسن

ہے شکستِ خاطرِ غمدیدہ کی آواز تو
اور معراجِ محبّت عشق کا اعجاز تو

سحر کار و حیرت افزا ہے تری صورتگری
اے طلسمِ شعر تو ہے شیشۂ دل کی پری

تجھ سے ہوتی ہے عیاں بیتابیِ دل کی تڑپ
تیرے لفظوں میں نہاں ہوتی ہے بسمل کی تڑپ

محفل عشاق کو باتوں میں گرماتا ہے تو رُوح تڑپاتا ہے تو اور وجد میں لاتا ہے تو

ہے تری ترکیب میں موسیقی جادو اثر تو سرود دردِ دل ہے نغمۂ زخمِ جگر

جلوہ فرما تجھ میں ہیں دلسوزیاں غمخواریاں پھول کی رنگینیاں بجلی کی آتش باریاں

ہے نوائے غم زبانِ درد کی آواز تو سحر تو افسوں ہے تو الہام تو اعجاز تو

روشنیٔ بزم بھی تو اور طبلِ جنگ بھی درس دل افروز بھی تعلیمِ نام و ننگ بھی

ہے طلسمانِ معقولات و محسوسات کا ایک محشر ہے تو گویا عالمِ جذبات کا

نکتہ آموزِ رموزِ حکمت و عرفاں ہے تو اور آزادِ قیودِ حجت و برہاں ہے تو

ہاں ہُوا اکثر ہے قوموں کے تنزل کی دوا کام تو دیتا رہا ہے صورِ اسرافیل کا

دل ہدف ہیں اور تو زہ گیر بھی ہے تیر بھی صید بھی صیّاد بھی فتراک بھی نخچیر بھی

مے بھی اور مینا بھی تو خرمن بھی اور اخگر بھی تو درد بھی درماں بھی تو مرہم بھی اور نشتر بھی تو

زندگی بخش ابد ہے چشمۂ حیواں ہے تو سچ تو ہے اے شعر! یہ خضرِ رہِ انساں ہے تو

تجھ سے فردوسی نے پائی ہے حیاتِ جاوداں اور انیس نکتہ داں تیری زمیں کا آسماں

تیرے آئینہ کا طوطی غالب حکمت سرا آج بھی بزمِ ادب میں دل کو ہے تڑپا رہا

پیکرِ شیریں و خسرو کی ہے بیشک جان تو نوحۂ محرومیٔ فرہاد پہ ارمان تو

تو ہے طغرائے بیاضِ لیلیٔ محمل نشیں مطلع دیوان عشق قیس مہجور و حزیں

ہائے الفت کا گل و بلبل کی افسانہ ہے تو راز دارِ سوز و ساز شمع و پروانہ ہے تو

تو نہ ہوتا گر تو تھے مہمل زبس سرو و چنار بے اثر دورِ خزاں تھا بے مزہ فصلِ بہار

نرگس و سنبل میں یہ خوبی ہے تیری ذات سے لالہ و گل میں یہ محبوبی ہے تیری ذات سے

وہ تو اکثر کو ملی پیغمبری کا ذکر کیا تیری دُنیا میں ہے بندوں کو خدا مانا گیا

سیّد علمدار حسین واسطی بنوڑ

نمودِ سحر

اے نمودِ صبح اے رنگینیٔ روحِ حیات
تیری لطف انگیزیوں میں غرق ہے یہ کائنات

تو نے آ کر بھر دیا پھولوں میں حسنِ تازگی
تو نے ہر غنچے میں اک روحِ تبسم پھونک دی

تو نے ہر ذرّے کو رشکِ مہرِ تاباں کر دیا
یعنی حسن شاہدِ فطرت کو عریاں کر دیا

منتشر ہے سارے عالم میں ہوائے مشکبار
صرف گلشن ہی نہیں آئینہ ہے ہر کوہسار

اے نمودِ صبح تجھ سے ہے بہارِ کائنات
حسنِ فطرت کو ہے تیری وجہ سے حاصل ثبات

وہ ستاروں کا تبسم اور وہ حسنِ انتشار
وہ نسیمِ صبح کا تھم تھم کے چلنا بار بار

وہ سپیدیٔ سحر نغموں کی وہ طغیانیاں
سبزۂ خوابیدہ کی وہ بار بار انگڑائیاں

چاندنی میں جھومنا سبزے کا وہ مستانہ وار
کیف پرور کس قدر ہے یہ ادا تیری بہار

وہ ہوائے سرد، وہ جنگل، وہ رنگینی تری
کوہساروں کی ہوا ہے برف میں ڈوبی ہوئی

ڈوبتے تاروں کا چشموں میں وہ دلکش انعکاس
گویا مخمل پر ستارے جڑ دئے ہیں پاس پاس

آسماں کو صبح کی سُرخی نے رنگیں کر دیا
یا مطلّا ہو گئی ہے دہر کی ساری فضا

وہ ترنم ریز نغمے وہ صدائے سرمدی
اور وہ طاری ہر اک دل پر سرورِ بیخودی

ایک نغمہ بن گئی ہے باغ کی ساری فضا
طائروں کی زمزمہ سنجی ہے کیسی دلربا

ابو محمد ثاقب

نمودِ سحر

کھلا فلک پہ سرِ صفحۂ بیاضِ سحر
ہنسا شگفتہ ہوا غنچۂ ریاضِ سحر

بھری تھی مانگ جو تاروں سے لیلیٔ شب کی
اُجڑ گئی کہ مٹی آب و تاب کوکب کی

نمک وہ حسن فلک میں وہ دلکشی نہ رہی　وہ بات اس کی جو تھی رات بھر رہی نہ رہی
وہ آسماں کہ جو تھا زیورِ شبِ دیجور　ہے سر سے تا بہ قدم اوڑھے چادرِ کافور
ہے گویا صبح کے کاندھے پہ رات کا تابوت　عجیب وقت ہے یہ بھی کہ شور ہے نہ سکوت
مٹا رہا ہے فروغِ سپیدۂ سحری　سیاہیٔ رخِ شب تیرگی و زاغ پری
وداعِ شب سے گھٹیں جھلملا گئیں شمعیں　نمودِ صبح سے جھپکیں ستاروں کی آنکھیں

عجب حسین و دل آویز ہے نمودِ سحر　بندھی ہے ٹکٹکی سوئے فلک جمی ہے نظر
بدن پہ گویا کنھیا ملے ہوئے ہیں بھبوت　جو دیکھ پائیں یہ عالم ہوں گوپیاں مبہوت
وہ بھولا بھولا سا گدرایا پن سحابی رنگ　وہ پیاری پیاری صباحت وہ آفتابی رنگ

جھلک رہی ہے سراپردۂ افق میں دھوپ　وہ چرخِ صبح جبیں اب ہے جو تھا شام سروپ
خموش شمع ہے رخصت ہے ماہ پاروں کی　نہ دھوپ نکلی ہوئی ہے نہ چھاؤں تاروں کی

اذانِ فاختہ کی سرو سے صدا آئی　نمازِ صبح کو دوڑی ہوئی ہوا آئی
قطار باندھے ہیں نخل اوس میں نہا دھو کر　مہیا جیسے جماعت ہو باوضو ہو کر
زمیں پہ رکھ دی جبینِ نیاز سبزہ نے　جھکایا سر کو بصد عجز پتہ پتہ نے
ہوائے سرد کے آئے جو دلکشا جھونکے　درخت جھوم گئے اور چٹک گئے غنچے
سوار دوش پہ کر کے چلی نسیم سحر　ہزار ناز و تبختر سے نکہتِ گل تر
تمام رات جو شبنم نے کی مشاطہ گری　بنا ہوا ہے گلستاں نکھر کے سبز پری
گلاب آرسی پہنے ہے نازک و نایاب　سمن ہے چمپا کلی ڈالے خوشبو و شاداب
پروئے موتی ہے ایک ایک بال میں سنبل　دُرِ یگانۂ شبنم ہے زیبِ گوشِ گل

لئے ہیں برگ ہتھیلی پہ شبنمی گوہر　　کہ با نیاز کریں نذرِ خسروِ خاور
کھڑے ہیں گردنیں اونچی کئے درخت تمام　　بہ شوقِ دید رُخِ نیّرِ بلند مقام
بھرے ہے اوس سے لالہ پیالۂ لعلیں　　چھلک رہا ہے سر شاخ ساغرِ نسریں

عجب سماں ہے عجب وقت ہے عجب منظر　　کہ ہر مقام بہشت نظر ہے سحر اثر
وہ سبزہ زار وہ جنگل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا　　کھلا ہے حدِ نظر تک صحیفہ فطرت کا
ہیں بولتے کہیں دراج و تیہو اور چکور　　مچا رہی ہیں کہیں فاختائیں شادکیں شور
کہیں ترانے کہیں نغمے اور چہکاریں　　کہیں ہیں ٹکڑیاں جھلڑ کہیں کہیں ڈاریں
چہک رہے ہیں طیور اور چہک رہی ہے فضا　　ہے رُوح پرور و جاں بخش و دلنواز ہوا
کلیلیں کرتے، اِتراتے ہیں بھرتے پھرتے غزال　　ہیں دوڑتی کہیں روباہیں بھاگتے ہیں شغال
نکل کے جھاڑی سے بھاگا اگر کوئی خرگوش　　جھپٹ کے باز گرا اس پہ یوں کہ اُڑ گئے ہوش
سجے ہیں زیورِ شبنم سے لہلہاتے کھیت　　لٹے ہے حسن دل آویز بھیگی بھیگی ریت

ہے سنبلوں کا بھی اس وقت دیدنی عالم　　کہیں وظیفے ہیں پوجا کہیں کہیں سرگم
دکانیں ساری مرتب ہوئیں کھلے بازار　　نمودِ صبح کا آئینہ ہیں در و دیوار
رواں دواں ہیں ہر اک سمت پیدل اور سوار　　یہ بھیڑ ہے کہ گزرنا ہے راہ میں دشوار
اُجالا ہوتے ہی چھٹتے سرد سارے بسترِ عیش　　نہ روٹھنا نہ منانا نہ چشمِ لطف نہ طیش
بدل کے کروٹیں اُٹھ بیٹھے نیند کے ماتے　　کچھ آنکھیں ملتے ہلاتے زبان برّاتے

جہاں میں پھیل گئی روشنی و نور سحر
وداع ہو گئی شب صبح کے گلے مل کر

سید علمدار حسین واسطی نور

مورلا

ایڈگر ایلن پو کا نام افسانہ نگاری کی چند ایسی خصوصیتوں کے لئے ضرب المثل ہے جو اس زمانے میں بھی جبکہ افسانہ نگاری یورپ میں معراج کو پہنچ چکی ہے، سند کمال سمجھی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ نفسانی کیفیات کا ایسا تحلیل و تجزیہ کرتا ہے جیسے کوئی کیمیا دان کسی کیمیاوی مرکب کا کرتا ہے۔ اُس کے افسانوں کے واقعات کی ترتیب ایک عالیشان عمارت کے نقشے کی طرح بہمہ وجوہ مکمل ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑی خصوصیت، جو اُس کے بعد بہت کم مصنفین کو نصیب ہوئی ہے، یہ ہے کہ اُسکے افراد کی سیرت کی تشکیل میں وراثت تعلیم اور ماحول کا جو زبردست عنصر شامل ہوتا ہے اُسے وہ ایسی دقت نگاہ سے بیان کرتا ہے کہ ہمیں کہنا پڑتا ہے ع۔ درصدف تعبیر گوہر زدہ اور ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ افراد، اُنکی سیرت، اُنکے افعال، اقوال، اُنکی زندگی کے واقعات، سب قوانین فطری کے ناگزیر نتائج ہیں۔ جن سے کوئی راہ نجات نہیں۔ ذیل کا افسانہ جو ایک ایسی خارق عادت ذہنیت کے متعلق ہے جس کا صحیح صحیح سمجھنا نفسِ نیم شعوری کی کیفیات سے واقف ہوئے بغیر دشوار ہے۔ خاص طور پر آخری خصوصیت کا حامل ہے اگرچہ افسوس ہے کہ ایلن پو کے الفاظ میں جو مخفی اور غیر محسوس اثر پنہاں ہوتا ہے، وہ اُردو کے الفاظ میں پیدا نہیں ہوسکا۔ آپ جانتے ہیں کہ اُردو میں نیم شعوری کیفیات کے بیان کرنے کے لئے کتنا کم ذخیرۂ الفاظ ہے۔

مدیر

مورلاؔ سے مَیں جس رشتے میں وابستہ تھا اگر اُسے بیان کرنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس سے اتنی ہی گہری محبت تھی جتنی کسی کو کسی سے ہوسکتی ہے۔ لیکن سچ پُوچھئے تو یہ تعلق ایسی عجیب و غریب نوعیت کا تھا۔ جس کی تصریح کسی قسم کے سبھی الفاظ نہیں کر سکتے جب سے حسن اتفاق نے ہمیں ایک دوسرے کے مقابل کیا تھا۔ اُسی لمحے سے میری رُوح میں ایک ایسی آگ کے شعلے روشن ہوگئے تھے۔ جس سے مَیں پہلے مطلق آشنا نہ تھا لیکن ان شعلوں میں وہ التہاب نہ تھا، جسے آنکھیں دیکھ سکیں یا جس کی تصویر الفاظ کے رنگ و روغن سے کھینچ سکے۔ وہ شعلے نہ تھے۔ ایک ایسی مبہم سوزش تھی جسے مَیں محسوس تو کرتا تھا لیکن یہ نہ بیان کرسکتا تھا۔ کہ وہ کس قسم کی سوزش ہے اور کہاں ہے؛ جتنی زیادہ مَیں اُس کے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اُتنی ہی زیادہ وہ مبہم ہوتی جاتی تھی اور اسطرح مَیں ایک ایسی روحانی خلش میں مبتلا تھا جو روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ بہرحال ہماری قسمت میں ایک دوسرے سے ملنا لکھا تھا۔ اور یہ بھی ہماری قسمت میں تھا کہ ہم نکاح کے رشتے میں مربوط ہوں اور ایک دوسرے کے ہوکر رہیں۔ گو مَیں نے کبھی اپنی زبان سے اپنی محبت کا راز نہیں کھولا لیکن وہ میری ہوگئی، اور اُس نے دوسروں سے قطع تعلق کرکے اپنے آپ کو میری خوشی کے لئے وقف کردیا۔

مورلاؔ کی علمیت غیر محدود تھی۔ یہ مبالغہ نہیں کہ اُس کی ذہنی قوتیں معمولی درجے کی نہ تھیں، وہ اپنی ذہانت لیاقت کے اعتبار سے ایک خارقِ عادت ہستی تھی اور

ہیں کیونکہ یہ محسوس کئے بغیر رہ سکتا تھا؟ چنانچہ میں نے اُسے اپنا اُستاد تسلیم کر لیا۔ تاہم مجھے بہت جلد یہ معلوم ہوا کہ اُس نے جو کتابیں مجھے پڑھنے کے لئے دی ہیں وہ جرمن فلاسفہ کی وہ متصوفانہ تحریریں ہیں، جنہیں جرمنی کی ادبیات کی ادنےٰ درجے کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتابیں اُسے کیوں اتنی مرغوب تھیں، اور وہ کیوں ہر وقت ان کے مطالعے میں مصروف رہتی تھی؛ تاہم غیر محسوس طور پر مجھے بھی اُنسے رغبت ہوتی چلی گئی۔ جس کی وجہ غالباً صحبت کے سریع اور غیب بشعوری اثر کے سوا کچھ نہیں۔

اور اس اثر پذیری میں جہاں تک میرا خیال ہے میری عقل کو کوئی دخل نہ تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ میں اُس کے طبعی رجحانات اور اس کی عادات سے جتنا بھی متاثر ہوا بالکل غیر محسوس طور پر ہوا۔ میرے خیالات اور اعتقادات نے مطلق اُس کا رنگ نہیں قبول کیا۔ نہ میرے اقوال میں، اور نہ میرے افعال میں ان متصوفانہ کتابوں کے اثر کا کبھی کوئی شائبہ پایا گیا مجھے پورے طور پر دلچسپی تھی کہ میں لاکھ ایسی کتابیں پڑھوں، اور لاکھ اپنی رفیقہ کی باتوں کو غور سے سنوں، میری ذہنی کیفیت کا متغیر ہونا محال ہے۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو پورے پر اُس کی تعلیم و تدریس کے سپرد کر دیا اور

بلا خوف و خدشہ اس کی بتائی ہوئی کتابوں کی پیچیدگیوں میں غرق ہو گیا۔ اور جب میں ایسی کتابوں کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف ہوتا، جن کا پڑھنا مذہب اور اخلاق نے ممنوع قرار دیا ہے۔ اور میرے دل میں فاسد خیالات چکر لگانے لگتے، تو وہ فوراً اپنا برف سا سرد ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیتی، اور فلسفۂ قدیم کے خاکستر سے ایسی دبی ہوئی چنگاریاں نکال لاتی جن کا نقش تپے ہوئے لوہے کے داغ کی طرح میرے حافظہ پر مرتسم ہو جاتا۔ اور میں گھنٹوں اُس کے قریب بیٹھا رہتا اور اُس کی آواز کی موسیقی سے اپنی روح کی تشنگی بجھاتا رہتا، تا آنکہ اُس کی آواز کی موسیقیت میں ایک ہولناک اور خوف انگیز عنصر مل جاتا اور میرے دل و دماغ پر ایک تاریکی سی مسلط ہونے لگتی، اور میرے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا اور اس کی آواز کو سُن سُن کر جو کسی انسانی آواز سے مشابہ نہ ہوتی تھی۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ طبقات اسفل کی گہرائیوں سے گونج گونج کر آ رہی ہے۔ میری روح کانپ اٹھتی تھی۔ اُس وقت یکایک میری مسرت، میری ذہنی عشرت ایک پُراسرار خوف سے تبدیل ہو جاتی۔ اور اُس کا مافوق البشر حسن میری نظروں میں ایک مہیب شکل اختیار کر لیتا۔ میں مرعوب اور خوفزدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔

اُن مباحثوں کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، جو مذکورہ بالا کتابوں کے مسائل کے متعلق میرے اور اُس کے درمیان ہوتے تھے، اور ایک طویل عرصے تک ہماری گفتگو کا واحد موضوع تھے۔ جن لوگوں کو دینیات اور اخلاقیات پر عبور ہے کچھ وہی اُن کو سمجھ سکیں گے، اور جن لوگوں کو ان سے مس نہیں، اُن کو بتانا نہ بتانا برابر ہے۔ اجمالی طور پر، فشطے کا فلسفہ ہمہ ادست، فیثاغورث کا ترمیم شدہ مسئلہ تناسخ، اور خاص طور پر شیلنگ کا نظریۂ وحدانیت ـــ یہ تھے وہ مباحث جن سے میری تخیل پرست رفیقہ کو طبعی لگاؤ تھا۔ جس چیز کو لاک نے شخصیت یا وحدتِ ذات سے تعبیر کیا ہے۔ وہ ایک ذی عقل فرد کے صحیح الدماغ اور کامل الحواس ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اور چونکہ ہم ذات سے ایک ذی فہم اور ذی شعور ہستی مُراد لیتے ہیں۔ اور نیز چونکہ تفکّر و تعقّل ہمیشہ شعور کی کیفیّت میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اپنے آپ کو "مَیں" یا "ہم" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس طرح ہم اپنے آپ کو دوسرے ذی عقل افراد سے ممتاز اور قائم بالذّات تصوّر کرتے ہیں لیکن بقائے ذات کا مسئلہ یعنی یہ مسئلہ کہ آیا موت کے بعد شخصیت باقی رہتی ہے یا فنا ہو جاتی ہے۔ میرے لئے بڑی دلچسپی کا موضوع تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس کا حل مشکل اور ادق اور پیچیدہ ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ موریلا اس کا ذکر بار بار ایک ایسے عجیب انداز سے کیا کرتی تھی، جو مجھے اس پر غور کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

آخرکار ایک وقت آیا۔ جب اپنی بیوی کا طور و طریق میرے لئے ذہنی مخمصہ ہو گیا۔ جیسے کوئی حیرت انگیز شعبدہ انسان کی عقل کو چکّر میں ڈال دیتا ہے۔ اب میں اُس کی سرد اور نازک اُنگلیوں کے مس، اس کی مترنّم آواز کے دھیمے سُروں اور اُس کی غمگین آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اور وہ یہ جانتی تھی لیکن ظاہر نہ کرتی تھی۔ اور مجھ سے کچھ نہ کہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری کمزوری اور حماقت سے واقف ہے وہ ہمیشہ مُسکرا دیتی۔ اور اسے ایک قسمت کی بات کہکر ٹال دیتی۔

یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے دل سے آہستہ آہستہ ہٹ جانے کی وجہ جانتی ہے حالانکہ مَیں خود اس سے ناواقف تھا۔ بہرحال وہ مجھ پر کبھی ظاہر نہ کرتی تھی، یہ سب کچھ تھا، مگر وہ پھر عورت تھی، اور اس لئے زود اثر پذیر۔ چنانچہ وہ اسی فکر میں گھلتی جاتی تھی۔ ہوتے ہوتے ایک وُہ دن آیا۔ جب اُس کے رُخساروں پر وہ قرمزی داغ جو خون جگر کا داغ اور ایک جاں گسل بیماری کی نشانی ہوتا ہے۔ ہمیشہ نظر

آنے لگا۔ اور اُس کے زرد پیلے ماتھے کی نیلی نیلی رگیں اُبھر آتیں۔ اُس کو اس حال میں دیکھ کر کبھی کبھی میرا دل نرم ہو جاتا لیکن معاً ہماری آنکھیں چار ہو جاتیں اور اُس کی آنکھوں کے پُرمعنی اندازِ نگاہ کو دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگتی اور میری رُوح پر وہی حالت طاری ہو جاتی جو کسی شخص پر اُس وقت طاری ہوتی ہے۔ جب وہ کسی اتھاہ کھڈ کے کنارے کھڑا ہو کر اُس کی خوفناک گہرائیوں کو دیکھے۔

مَیں صاف طور پر کیوں نہ کہدوں کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو چلی تھی کہ کسی طرح موت کا پردہ میرے اور مورلاؔ کے درمیان حائل ہو جائے، ہاں یہ زبردست خواہش ایک چنگاری کی طرح میرے سینے میں سلگ رہی تھی لیکن کئی دن گزر گئے، ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے مجھے انتظار کرتے ہو گئے پھر بھی رُوح کو اپنا قفسِ خاکی کچھ اتنا عزیز ہوتا ہے کہ جس بات کی مجھے خواہش تھی، وہ نہ ہوئی آخرکار مجھے اپنے دل پر ضبط نہ رہا، اور مَیں اس تاخیر کو دیکھ کر جھنجھلانے اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ مَیں جل کر اُن تلخ و ناگوار لمحوں اور ساعتوں، اُن پہاڑ سے دنوں اور ہفتوں کو کوسنے لگا۔ جو اس طرح طول پکڑتے جاتے تھے اور اس کی مدتِ حیات کو دراز تر کرتے جاتے تھے جس طرح دن ڈھلتے وقت شام کے سایے آہستہ آہستہ طویل ہوتے جاتے ہیں۔

لیکن خزاں کی ایک شام کو جب ہوائیں فضائے آسمانی میں ساکن اور خاموش تھیں، مورلاؔ نے مجھے اپنے بستر کے قریب بلایا۔ جہانتک نظر کام کرتی تھی روئے زمین پر ایک مبہم اور تاریک دُھند چھائی ہوئی تھی۔ اور پانی کی سطح پر ایک ایسی عجیب و غریب چمک تھی، جیسے آگ کے شعلوں کا عکس، در و دیوار پر پڑتا ہے۔ اور جنگل کے پتوں کے درمیان سے آسمان پر قوسِ قزح کے رنگ جھلکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

جب مَیں اُس کے قریب پہنچا، تو وہ بولی۔ "آج کیسا اچھا دن ہے! یہ وہ دن ہے کہ اس دن یا انسان صحیح معنوں میں زندہ رہے یا مر جائے۔ دُنیا کے بسنے والوں کے لئے یہ دن غنیمت ہے۔ لیکن فنا کی بستی کے رہنے والوں کے لئے یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے!"

مَیں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور وہ کہنے لگی:۔

"میری موت کا دن قریب ہے۔ بس مَیں کوئی دن کی مہمان ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مَیں پھر بھی زندہ رہونگی۔" "مورلاؔ! یہ تم کیا کہتی ہو؟"

"وہ دن کبھی نہیں آیا۔ جب تو نے مجھ سے محبت

کی لیکن جو جیتے جی تیری نظروں میں حقیر رہی، مرنے کے بعد تو اُس کی پرستش کریگا۔"

" خدارا۔ ایسی باتیں مُنہ سے نہ نکالو۔"

" مَیں پھر کہتی ہوں کہ مَیں کوئی دم کی مہمان ہوں لیکن میرے سینے کے اندر وہ امانت محفوظ ہے جو تیری محبت کی یادگار ہے۔ . . . . اور جب میری رُوح تن سے جُدا ہو جائیگی۔ تو تیری بچّی مورلّا میری نشانی بن کر تیرے پاس رہے گی لیکن تیری زندگی غم اور افسوس کی زندگی ہوگی، وہ غم و افسوس جو مٹانے سے نہیں مٹتا۔ تیری خوشی کے دن گزر چکے اور خوشی ایک بار جاکر پھر نہیں آتی "

مَیں نے چلّاکر کہا: " مورلّا، تجھے یہ کس طرح معلوم ہے۔ تو یہ کس طرح کہہ سکتی ہے،" لیکن اُس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ بلکہ میری طرف سے مُنہ موڑ کر تکیے پر مُنہ رکھ لیا۔ اُس کے جسم پر ایک کپکپی سی نمودار ہوئی اور ابھی اس کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے کہ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

لیکن اُس کی پیشینگوئی پُوری ہوئی، اُسی وقت پُوری ہوئی، گویا رُوح اُس کے جسم سے پرواز نہیں کرگئی۔ بلکہ اُس کے جسم ہی کے ایک حصّے سے نکل کر دوسرے حصّے میں داخل ہوگئی۔

اُس کی لڑکی ایک عجیب سرعت کے ساتھ زندگی کے ابتدائی مراحل طے کرکے قد و قامت اور عقل و ذہانت میں جوان ہُوئی، اور وہ مرنے والی کی ایسی صحیح شبیہ تھی کہ سرِ مو فرق نہ تھا۔ مجھے اُس سے ایسی محبت ہوگئی جیسی مجھے کبھی سان گمان نہ تھا کہ مجھے اس دُنیا کے کسی باشندے سے ہو سکتی ہے۔

لیکن بہت مُدّت نہ گزرنے پائی تھی کہ آسمانِ محبت کا مطلع تاریک ہونا شروع ہُوا، اور تاریکی اور خوف اور غم کے بادل اُمنڈ اُمنڈ کر چھانے لگے۔ مَیں ابھی کہہ چُکا ہُوں، میری بیٹی قد و قامت اور عقل و ذہانت میں ایک حیرت انگیز سرعت سے ترقی کر رہی تھی۔ بیشک اُس کی جسمانی ترقی عجیب و غریب تھی لیکن اُف مَیں کیا بیان کروں کہ اُس کی ذہنی نشو و نما کو دیکھ کر کیسے کیسے ہیجان انگیز خیالات میرے دل میں پیدا ہوتے تھے۔

اور یہ خیالات میرے ذہن میں کیونکر نہ آتے جب روز بروز مجھے اس کا زیادہ احساس ہوتا جارہا تھا کہ اس سن و سال ہی میں میری بچی عقل میں جوان ہوگئی ہے میں اُس کی زبان سے اکثر ایسی باتیں سُنتا تھا جیسی بڑی بُوڑھی تجربہ کار عورتیں کیا کرتی ہیں۔ اور مَیں یہ دیکھتا تھا کہ اُس کی آنکھیں جو ہر وقت

کسی سوچ میں رہتی ہیں۔ عالم شباب کے جذبات سے مخمور ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ جب مجھ پر ایک تلخ حقیقت کی طرح ثابت ہو گیا۔ اور جب کوئی توجیہ اسے غلط ثابت کرنے کے لئے اور میرے دل کو تسلّی دینے کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھی، تو پھر یہ کونسی تعجب کی بات ہے۔ کہ میرے دل میں طرح طرح کے خوفناک شبہات پیدا ہونے لگے جن سے میری رُوح پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ اور اپنی بیوی مورلّا کے دل ہلا دینے والے قصّے کہانیوں اور اس کے وحشت انگیز نظریوں کی یاد مجھے ستانے لگی مرنیوالی کی بات پوری ہوئی۔ جس طرح قضا کا حکم اٹل ہوتا ہے میں نے اس کی بچی کو اس کی یادگار رکھی، دُنیا کی نظروں سے چھپا کر پرستش شروع کی۔ اور اپنے گھر کی تنہائی میں مقیدرہ کر میں اپنے اوقات اپنی محبوبہ کی محبوب نشانی کی حفاظت میں بسر کرنے لگا۔ برس پر برس گزرتے چلے جاتے تھے۔ اور میں جب اُس کے حسین چہرے کو جس کے خطّ و خال میں ایک ایسا مبہم سا سحر تھا۔ جس میں ایک تقدس کا عنصر ملا ہُوا تھا اور اُس کے بڑھتے ہُوئے قد و قامت کو دیکھتا تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روز بروز اُس کے انداز و اطوار اور اُس کے چہرے کے نقوش میں اُس کی ماں کی شکل و شباہت نمایاں ہوتی جاتی ہے ساعت بساعت مشابہت کے یہ نقوش جو پہلے مٹے مٹے سے تھے اُبھرتے آتے تھے، اور ساعت بساعت وہ زیادہ شوخ، زیادہ واضح، اور زیادہ مہیب ہوتے جاتے تھے۔ یہ تو میں برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کی مُسکراہٹ عین بین اپنی ماں کی سی ہے۔ مگر جب اُس کا مُسکراتا ہُوا چہرہ دیکھ کر مجھے مرنے والی کی صورت یاد آجاتی تو میں کانپ اُٹھتا۔ میں یہ بھی برداشت کر سکتا تھا کہ اُس کی آنکھیں بالکل اپنی ماں کی آنکھوں سے مشابہ ہیں۔ لیکن جب وُہ مورلّا کی آنکھوں کی طرح میری رُوح کی گہرائیوں تک اُترنے لگتیں تو میں خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیتا۔ پھر اُس کی بلند اور چوڑی پیشانی میں، اس کے ریشمیں بالوں کے پیچ و خم میں، اُس کی زرد زرد انگلیوں میں، اُس کی آواز کے غمگین موسیقیت سے لبریز لہجے میں اور ان سے کہیں زیادہ اُس کے الفاظ اور جملوں میں مجھے اُس کی ماں کی مجسم یادگار نظر آتی تھی۔ اور یہ امر میرے لئے جگر سوز اور جانکاہ خیالات کا نت نیا سامان بہم پہنچاتا رہتا تھا۔

اس طرح میری بیٹی کی زندگی کے دو دور گزر گئے لیکن وہ اب تک رُوئے زمین پر ایک بے نام و نشان

ہستی تھی۔ پدرانہ محبت اُسے "میری بیٹی" اور "میری پیاری" کے عمومی کلمات ہی سے مخاطب کرتی تھی۔ اور اُس کا گھر کی خلوت سے قدم باہر نہ نکالنا اُس کے غیروں سے راہ و رسم رکھنے میں مانع تھا۔ مورلّا کا نام اُسی کے ساتھ مٹ گیا۔ مَیں نے اپنی بیٹی کے سامنے کبھی اُس کی ماں کا ذکر نہیں کیا۔ اور یہ ممکن بھی کیونکر تھا؟

میری بیٹی کے دل و دماغ پر اِس قلیل مدّتِ عمر میں سوائے اپنے محدود حلقۂ معاشرت کے تاثرات کے خارجی دُنیا سے کوئی تاثرات وارد نہیں ہُوتے تھے۔ اور اس لئے اس کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہ آیا ہوگا کہ میرے سوا کسی اور کی ذات بھی اُس کے وجود کی کفیل ہے لیکن آخرکار بپتسمہ کی رسم میرے دماغ کو جو متواتر تفکرات کے باعث بالکل مضمحل ہو رہا تھا۔ مہلکۂ تقدیر سے نجات پانے کا واحد ذریعہ نظر آئی۔ اور جب مَیں یہ رسم ادا کرنے کے لئے تیار ہُوا تو مجھے نام کے انتخاب کرنے میں بہت تذبذب ہُوا۔ قدیم اور جدید زمانے اور اپنے اور غیر ملکوں کی عورتوں کے بے شمار نام جن میں سے کوئی حُسن میں ضرب المثل تھا، کوئی دولت میں شہرۂ آفاق اور کوئی نیکی میں زبان زدِ خلایق، میری زبان پر آ آ کر رُک جاتے تھے۔ لیکن نہ جانے وہ کیا چیز تھی۔ جس نے مجھے مرنے والی کی یاد تازہ کرنے پر مجبور کیا؟ نہ جانے میرے اندر وہ کونسی رُوحِ خبیثہ تھی جس نے وہ لفظ میرے مُنہ سے نکلوایا جس کے خیال سے میری رگوں میں خون خشک ہو جایا کرتا تھا؛ نہ جانے میری رُوح کے عمق میں وُہ کونسی فاسد قوت پوشیدہ تھی۔ جس کے اثر سے مَیں نے گرجا گھر کی تاریکی میں اور رات کی خاموشی میں ڈرتے ڈرتے آہستہ سے "مورلّا" کا لفظ زبان سے نکالا؛ اور نہ جانے وُہ کیا پُراسرار شعبدہ تھا جس نے یکایک میری بیٹی کی صورت مسخ کر دی۔ وُہ اُس خفیف آواز کو سُنکر چونکی اور اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر اور گرجا کے فرش پر دھم سے گر کر جواب دیا۔

"مَیں آگئی۔"

نہایت درجہ صراحت، آہستگی اور خاموشی سے یہ الفاظ میرے کان میں آئے۔ اور اُس کے بعد مجھے یوں محسوس ہُوا کہ گویا پگھلا ہُوا سیسہ میرے کانوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ جو کانوں کے راستے دماغ میں اُتر گیا ہے۔ ماہ و سال ایک دوسرے کے بعد آئینگے اور گزر جائینگے لیکن کیا کبھی اُس منظر اور اُس وقت کی یاد میرے دل سے جائیگی؟ ناممکن۔ اُس وقت کے بعد مَیں تھا۔ اور ایک عالمِ بیخبری، ایک کیفیتِ بیہوشی

میں دنیا و مافیہا سے بالکل غافل ہو گیا۔ میری قسمت کا ستارہ غروب ہو گیا۔ اس لئے دنیا میری نظروں میں تاریک ہو گئی۔ اور اس کی مختلف اللون شکلیں ایک مدھم فانوس کی سایہ نما شکلوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ اور ان سب میں مجھے ایک مورلا ہی کی صورت نظر آتی تھی فضائے آسمانی کی ہوائیں اور وسیع سمندر کی بیتاب لہریں میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور وہ ایک ہی لفظ دہراتی تھیں۔ "مورلا! مورلا" لیکن مورلا کہاں؟ اُسے تو میں اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کر آیا۔ اور جب میں پہلی مورلا کی طرح دوسری مورلا کو بھی لحد کے سیاہ پردے میں چھپا چکا، تو ایک طویل اور ناخوشگوار قہقہے کی آواز قبرستان میں گونجی۔

(ایڈگر ایلن پو)

"نور الہدیٰ"

غزل

وصل کی شب تھی کہ تھی مستی کسی میخوار کی
سامنے تھی اور نظر آئی نہ صورت یار کی

کیا کہونگا اے جنوں جو آ گئے ایسے میں وہ
کوئی دیواروں سے بھی کرتا ہے باتیں پیار کی

دردِ دل! آنسو نہ نکلیں، ہاں کوئی رسوا نہ ہو
ڈھونڈتی کچھ پھر رہی ہیں پتلیاں بیمار کی

رحم کر اے شعلۂ عریاں جلا جاتا ہوں میں
آرزو دل سے نہ نکلے گی ترے دیدار کی

حُسن کی پہلی نظر کیسی تھی سیفی کیا کہوں
ایک برچھی تھی جو خود میں نے جگر کے پار کی

سیفی سہواروی

ترانۂ وحدت

ہر شے سے تو ہے ظاہر اے پردہ پوش وحدت
پھولوں میں رنگ تو ہے رنگیں ہے تجھ سے فطرت
حسن سبہ دیا ہے لیلائے شب کو تو نے
چمکا دیا جمالِ زیبائے شب کو تو نے
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے

سورج کی طلعتوں میں تیرا جلال پنہاں
روئے قمر میں تیرا حسن کمال پنہاں
قدرت ہے تیری ظاہر اشجار کے نمو سے
ظاہر ہے حسن عریاں پھولوں کے رنگ بو سے
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے

نورِ جمال تیرا رنگِ شفق سے پیدا
ذکرِ جمیل تیرا ہر ہر ورق سے پیدا
قدرت کی نیری شاہد صحرا کی وسعتیں ہیں
عظمت پہ تیری نازاں ہستی کی رفعتیں ہیں
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے

گلشن کا ذرّہ ذرّہ حکمت پہ تیری شاہد
صوفی اگر ہے بیخود ہے سجدہ ریز عابد
غنچوں کی مسکراہٹ دنیائے راز تیری
پھولوں کی خود نمائی حیرت طراز تیری
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے

تو نے صدف کے اندر پیدا کیا گہر کو
اوجِ فلک سے اونچا پہنچا دیا بشر کو
بلبل کے دل کو تو نے سوز و گداز بخشا
کوئل کو درد دے کر نغموں کا ساز بخشا
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے

فاراں کی چوٹیوں پر تو ہی تو جلوہ گر تھا
دامن میں طور کے بس تیرا ہی اک شرر تھا
لیلیٰ کے رخ کو تو نے پر نور کر دیا تھا
مجنوں کے دل کو غم سے معمور کر دیا تھا
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے

دیر و حرم میں تو ہی پر تو فگن ہے اپنا بیکار ہے یہ جھگڑا شیخ اور برہمن کا
تیری صدا ہے پنہاں ناقوس کی فغاں میں عظمت ہے تیری مضمر آوازۂ اذاں میں
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے

تاروں کی دلکشی میں، رنگینیٔ سحر میں جنگل کی ہیبتوں میں وادی کے شور و شر میں
تیرے نشاں ہیں مضمر اے پردہ پوش وحدت کبتک چھپائیگا تو گھونگھٹ میں اپنی صورت
وہ کون ہے جو تجھ پہچانتا نہیں ہے

ثاقب نے تجھ کو اپنے تاریک دل میں پایا سر کو جھکا کے تیری وحدت کا گیت گایا
عرفاں نے تیرے اس کو بیخود بنا دیا ہے لیکن وہ ایک تو ہے صورت چھپا رہا ہے
وہ کون ہے جو تجھ کو پہچانتا نہیں ہے ثاقب کانپوری

دوشیزہ

یہ پیاری نگاہیں للچائی آغوش طلب یہ رعنائی
اک مرغِ خانہ طلب ہے تو اک ساز زخمہ طلب ہے تو
اک غنچۂ بوسہ طلب ہے تو اک ساغر بادہ طلب ہے تو
یوں تجھ کو جو پاتا ہوں میں
دیوانہ ہوا جاتا ہوں میں (از دوشیزہ)

دوشیزہ ایک نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ اسکے مصنف پروفیسر دیوانہ ایم۔ اے کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے، کہ حسنِ بیان لطفِ زبان وسعتِ تخیل، پروازِ تصور، تازگیِ ادا البریزیِ معنی کفایت لفظی نہایت روحی جو تعقل و تفضل جو مصوری جو خالص تصور جو کلچر۔ جو ترنم جو جاری و ساری لہر سرم ان کے کلام میں ہے وہ آجتک کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں دیکھی گئی۔ اس کا ثبوت چاہو تو دوشیزہ کے روئے منور کے ہمراز ہو۔ دیکھتے ہی آپ ہمارے ہمزباں اور ہمخیال ہو جائیں گے۔
چند نظموں کے عنوان یہ ہیں:۔
للچائی نگاہیں۔ فتنہ۔ آئینہ۔ مخمور بندرابن۔ بھگوت گیتا۔ روضۂ تاج محل۔ بلبل بیقرار ہند۔ شیلے۔ مصطفےٰ کمال پاشا۔ میری شاعری۔ کشتی۔ بچپن۔ چاند۔ جستجو۔ خوف فنا۔

قیمت مجلد دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ڈاکٹر بن مالی کرشن اگروال۔ ڈیرہ دون (یوپی)

تذکرہ جمال پاشا کے چند ورق

عثمانی حکومت کی سیاست سے میرا ذاتی تعلق

۲۳۔ جنوری ۱۹۱۳ء سے شروع ہوا۔ جبکہ گورنمنٹ درہم برہم ہوگئی تھی۔ اُس شام کو مجھے باب عالی میں طلب کیا گیا۔ جہاں ایک بڑا بھاری انبوہ جمع ہوا تھا۔ اُس وقت محمود شفقت پاشا شاہی محلات سے واپس آرہا تھا۔ جہاں اُس کو سلطان المعظم نے وزیر اعظم مقرر کرنے کے لئے طلب کیا تھا۔ پاشا موصوف مجھے رستے میں ملا۔ اور آتے ہی مجھے حکم دیا۔ کہ میں فی الفور قسطنطنیہ کی فوجی گورنری کی باگ اپنے ہاتھوں میں لیلوں۔ اور دارالخلافہ میں امن قائم کرنیکے لئے سرِ دست انتظام کردوں۔ چونکہ عوام الناس کے دلوں میں ہیجان سا ہوگیا تھا۔ اس واسطے واقعات نے بہت ہی نازک صورت اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ مجھے امن و حفاظت رکھنے کے لئے بڑی سوچ سے کام لینا پڑا۔ جب میں گورنر مقرر ہوا تو اس وقت ناظم پاشا کی لاش، وزیر اعظم کے ایڈی کانگ کے کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ اور کمال پاشا (سابقہ وزیر اعظم) جمال الدین (شیخ الاسلام) رشید بے (وزیر امور داخلی) عبدالرحمن بے (وزیر مالیات) کو حفاظت کی خاطر ایک کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ میں نے اُسیوقت مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ اور طلعت بے کیساتھ جو وزیر امور خارجہ مقرر کیا گیا تھا۔ فیصلہ کیا کہ ناظم پاشا کی لاش کو ہسپتال میں پہنچایا جائے۔ اور کمال پاشا اور جمال الدین آفندی کو مع گارد اپنے گھروں میں بھجوایا جائے۔ لیکن رشید بے اور عبدالرحمن بے کو کچھ دن اور گورنر کے سرکاری مکان میں رکھا جائے۔ تاکہ باغی اُن کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ اس اثناء میں کمال پاشا کا داماد کرنیل نجی بے مجھ سے آکر ملا۔ میں نے اُسے کہا۔ کہ تمہارا خسر صحیح سلامت ہے تم اس کو اپنے گھر لیجا سکتے ہو لیکن اُس کے واسطے بہتر ہوگا۔ کہ وہ کچھ عرصے کے لئے قسطنطنیہ سے باہر کہیں چلا جائے نجی بے نے میرا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ کمال پاشا اور جمال الدین بغیر کسی حادثہ کے اپنے گھروں میں پہنچ گئے ناظم پاشا کی لاش ہسپتال بھجوا دی گئی۔ اور ڈاکٹر کو ہدایت کی گئی کہ پاشا موصوف کی موت کی نسبت مفصل رپورٹ

کہ میں تمام رات شہر کی حفاظت کے واسطے مناسب احکام جاری کرتا رہا۔

دوسری صبح ناظم پاشا کے جنازے کو بڑی دھوم دھام سے نکالا گیا۔ کیونکہ میں نے ہدایت کی تھی کہ مرحوم کا جلوس بڑی شان و شوکت سے بازاروں میں سے چکر لگا کر قبرستان میں جائے۔ تاکہ غیر ملکی افسران ہمارے حسن انتظام سے متاثر ہوں۔ چنانچہ میں نے یورپ کے تمام مقیمی سفیروں و دیگر اعلےٰ افسروں سے جو قسطنطنیہ میں موجود تھے اس جلوس میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ اس دن موسم خراب تھا۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ ایک طرف تو بلغاریا کی فوجیں شتلجہ کے پاس ڈیرہ لگائے بیٹھی ہیں اور دوسری طرف یونانی بیڑے نے درہ دانیال کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں یورپ کی سلطنتوں کے جنگی جہازوں نے قریب ہی لنگر ڈال رکھے ہیں۔ تاکہ وہ کوئی بہانہ بنا کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیں۔ لیکن ہم ایسے بدقسمت ہیں کہ ایسے نازک وقت میں آپس ہی کشت و خون کر رہے ہیں۔ اور اسی وجہ سے کمانڈر انچیف اور وزیر جنگ کو شہید کیا گیا۔ ان خیالات سے میری طبیعت سخت پریشان تھی۔ کیونکہ باوجود اتنی جد و جہد اور قربانیوں کے ہمارے ملک کا مستقبل ابتک اندھیرے میں تھا۔ ایک فرانسیسی میجر بھی میرے ہمراہ جا رہا تھا میں نے اُس سے کہا کہ یورپ والے درحقیقت اس قتل کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ اُنہی کی خفیہ و علانیہ سازشوں نے ہمارے ملک میں ایسی ابتری پھیلا دی ہے۔ کہ ترک آپس میں کتوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ اگر برطانیہ اور فرانس تھوڑی سی بھی مدد کرتے، تو ترکی اس تباہی سے یقیناً بچ جاتا۔ میجر مذکور نے بھی میری تائید کی۔ اسی روز جرنیل پولیس نے مخالفین کے سرکردہ ممبروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ تاکہ شہر میں کوئی فساد برپا نہ ہو۔ گورنمنٹ نے آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ مخالفین کو تنگ نہ کیا جائے بلکہ اُن کے ساتھ مصالحت کی کوشش کی جائے چنانچہ میں نے عبدالرحمٰن بے کو بلایا۔ جو سرکاری عمارت میں مقید تھا۔ اور اُسے صلاح دی۔ کہ وہ قسطنطنیہ چھوڑ کر یورپ میں چلا جائے۔ اور اپنے ہمراہیوں کو بھی ساتھ لیجائے۔ عبدالرحمٰن بے نے میری تجویز کو منظور کر لیا۔ دو دن کے بعد اس کو اور اس کے ہمراہیوں کو رہا کیا گیا اور وہ اُسی وقت یورپ میں جا کر پناہ گزیں ہوئے اس حکمت عملی سے مخالفین کی سرکوبی کی گئی۔ اور سیاسی معاملات چند دنوں میں رو بہ صحت ہو گئے۔

قسطنطنیہ کے بعض بدمعاش لوگوں نے یہ رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ مسلمان شریف زادیوں سے رستہ میں

چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اور ان کو بد معاشی پر ترغیب دیتے تھے۔ مجھ کو مارشل لا میں اس قسم کی سینکڑوں شکایات موصول ہوئیں۔ میں نے حکم دیا کہ اگر کوئی شخص اس جرم میں گرفتار ہوا، تو اس کو جلاوطن کیا جائیگا مجھ کو اس حکم کے ماتحت صرف چار پانچ اشخاص کو سزا دینی پڑی جس کا یہ اثر ہوا۔ کہ ایک ہفتے کے اندر ہی مستورات بیدھڑک ادھر اُدھر آجاسکتی تھیں اس حکم کی بدولت عوام الناس پر اچھا اثر پڑا۔

انہی دنوں میں میں نے ایک روز مشہور اخبارون کے مدیروں کو اپنے دفتر میں بلوایا۔ اور ان کو فہمائش کی کہ اگر وہ باغیانہ مضامین سے احتراز کرینگے، تو ان پر کسی قسم کی بندش عاید نہ کی جائیگی۔ اور اگر انہوں نے ملک میں نئی روح پیدا کرنے والے مضامین شائع کئے، اور عوام الناس کو سچے واقعات بتلائے تو گورنمنٹ ان سے بہت خوش ہو گی۔ اور ان کی مدد کریگی۔ اس تاکید کا یہ اثر ہوا کہ شاذونادر ہی کسی اخبار نے حکومت کے برخلاف کوئی مضمون لکھا ہو، جب کبھی کوئی اخبار تجاوز کرتا تھا تو اس کے مدیر یا مالک کو تنبیہ کی جاتی تھی۔

گورنمنٹ دن رات اس دھن میں تھی کہ قوم کو جوش دلاکر فوج میں بھرتی کیا جائے۔ تاکہ وہ بلغاریا کو ہزیمت دیں۔ جو تسلجہ کے قریب ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا۔ اس سرتوڑ کوشش کی وجہ سے ہزارہا ترک فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اُدھر برطانیہ۔ فرانس اور روس کے سفیر ہم کو مجبور کرتے تھے۔ کہ ہم ایڈریانوپل اور دیگر جزائر چھوڑ کر بلقان کی ریاستوں سے صلح کرلیں۔ انہی دنوں مخالفین ہمارے برخلاف زبردست سازشیں کر رہے تھے۔ مجھے ہر روز ان کی حرکات کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں حتیٰ کہ میں نے ان کی قطعی سرکوبی کا پختہ ارادہ کرلیا۔ ایک روز خفیہ پولیس نے ایک شخص مسمی سردار صدقی آفندی کو گرفتار کیا۔ جو اس وقت ایک باغیانہ اعلان ایک مطبع میں چھاپ رہا تھا۔ تفتیش سے معلوم ہوا۔ کہ یہ بغاوت کا سلسلہ شہزادہ صباح الدین کے ایما پر پھیلایا جارہا ہے۔ کیونکہ باغیوں کا ارادہ تھا کہ شہزادہ موصوف کو وزیر اعظم بنایا جائے۔ ہم نے تمام باغیوں کو گرفتار کرلیا۔ اور ان کو سزائیں دیں۔ لیکن صباح الدین کو گرفتار نہ کیا۔ کیونکہ اس کے برخلاف کافی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ باوجود اس سرزنش کے شہزادہ مذکور نے اپنی باغیانہ حرکات جاری رکھیں۔ اور اپنے دوست ڈاکٹر رشید بے کو اس سازش کا سرغنہ مقرر کیا۔

ڈاکٹر رشید بے ایک طرف تو طلعت بے سے راضی نامہ کی گفت وشنید کرتا تھا۔ اور دوسری طرف سے

محمود شفقت پاشا۔ طلعت بے اور دیگر وزرا کے قتل کرنے کی سازش کر رہا تھا۔ وہ اس چالاکی سے دوہری چال چل رہا تھا کہ طلعت بے بھی دھوکے میں آگیا۔ چنانچہ طلعت بے خفیہ پولیس کی اطلاعات پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب میں نے ایک دن اُس کو قطعی ثبوت بتلائے۔ تو اُس کو یقین آیا۔ میں نے ڈاکٹر موصوف کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا۔ لیکن اُس کو پہلے ہی سے یہ خبر مل گئی تھی۔ اس واسطے وہ بھاگ گیا۔ شہزادہ صباح الدین نے بھی انگریزی سفارت خانے میں جاکر پناہ لی۔ اور گرفتار نہ ہوسکا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے طلعت بے نے خود ہی بتایا۔ کہ چونکہ میں شہزادہ موصوف کی گرفتاری پر تُلا ہُوا تھا۔ اس واسطے اُس نے صباح الدین کو وارنٹ کے جاری ہونے سے پہلے بھاگ جانے کی ترغیب دی تھی۔

میری خفیہ پولیس بڑی جانفشانی سے اپنے فرائض ادا کر رہی تھی۔ وہ آئے دن باغیانہ سازشوں کی اطلاعات مجھے پہنچایا کرتی تھی۔ آخرکار مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہُوا کہ رشید بے (سابقہ وزیر امور داخلہ) اور دامادِ صالح پاشا اس سازش کے رُوحِ رواں ہیں۔ چونکہ صالح پاشا کی سلطان المعظم سے رشتہ داری تھی۔ اس واسطے میں اس کو اس شرارت سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ پاشا موصوف کو اپنے دفتر میں بلایا۔ معمولی بات چیت کے بعد میں نے اُسے کہا۔ کہ بعض آدمی آپ کا نام لے کر گورنمنٹ کے خلاف خفیہ سازشیں کر رہے ہیں۔ اور مزید براں وہ گورنمنٹ کے اعلےٰ افسران کو قتل کرنے کی فکر میں ہیں۔ وہ یہ بھی علانیہ کہتے ہیں کہ آپ ان انجمن کے صدر ہیں۔ گو میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن مفسد خواہ مخواہ آپ کی خاندانی عزت و شرافت کو بٹہ لگانا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کو ان کی باغیانہ حرکات سے بچانا چاہتا ہوں۔ اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کچھ عرصے کے لئے ترکی سے باہر تشریف لے جائیں۔ تاکہ عوام الناس اور ان باغیوں کو معلوم ہو جائے۔ کہ آپ کا ان سازشوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم نے آپ کے سامنے ان مفسدوں کو گرفتار کیا تو شاید آپ کو اس معاملہ میں یونہی بدنام نہ ہونا پڑے۔" پاشا مذکور نے بڑی سرد مہری سے میری باتوں کا یوں جواب دیا۔ "میں بڑے عیش سے یہاں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اور میں ایک منٹ کے لئے بھی قسطنطنیہ سے باہر نہیں جانا چاہتا۔ اس واسطے میں آپ کی ہدایت پر عمل نہیں کرسکتا مزید براں اگر میں باہر چلا جاؤں، تو لوگ مجھ کو خواہ مخواہ ان سازشوں کا الزام دینگے۔ اس واسطے میں اسی جگہ

رہونگا۔اور جو کچھ آپ مناسب سمجھیں۔ بڑی خوشی سے کریں مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ آپ نے یہاں مجھے دھمکانے کے لئے بلایا ہے۔" میں نے پاشا کو جواب دیا کہ شاید آپ اپنی جماعت کی قوت پر بہت نازاں ہیں اور آپ کو یقین ہے کہ آپکی امیدیں عنقریب بار آور ہونگی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ یہاں ایک دن کے لئے بھی صحیح سالم نہیں ٹھہر سکتے میری خفیہ پولیس آپ کی حرکات کے متعلق ہر وقت چوکنی رہتی ہے۔اس واسطے میں دوبارہ آپ سے درخواست کرتا ہوں۔کہ میری صلاح کو منظور کرلیں۔اور یورپ چلے جائیں۔ لیکن اگر آپ نے میری عرض کو رد کیا تو مجھے مجبوراً آپ کے اوپر خفیہ پولیس کا پہرا رکھنا پڑیگا۔ تو پھر آپ کو شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔" پاشا نے غصے سے جواب دیا کہ" جو کچھ آپ کی مرضی ہو کریں۔میں ایسی باتوں سے جھکنے میں نہیں آتا۔" اُس دن سے میں نے پاشا مذکور کے گرد پہرا لگا دیا۔اور وہ ہر وقت کی خبر میں مجھے پہنچاتے تھے

محمود شفقت پاشا کے قتل سے ایک ہفتہ پہلے عظمی بے (جرنیل پولیس) نے مجھ سے آکر کہا کہ کمال پاشا شب گزشتہ کو ایک جہاز سے قسطنطنیہ آیا ہے۔ وہ ابھی تک ساحل پر نہیں اُترا۔اُس کی گرفتاری کے لئے وارنٹ مرتب کر دیجئے۔ میں نے اُسے حکم دیا کہ بیا تی محکمہ کے اعلےٰ افسر کو کمال پاشا کے پاس بھیجدو۔تاکہ اُسے اطلاع دیجائے۔کہ اگر وہ اسی جہاز سے واپس نہ چلا گیا تو گرفتار کیا جائیگا۔

تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد عظمی بے دوبارہ آیا۔ اور کہا کہ کمال پاشا جہاز سے اُتر کر سیدھا اپنے مکان پر چلا گیا ہے۔کمال پاشا کی آمد سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ سازشی عنقریب بغاوت کرنے والے ہیں۔ اس واسطے میں فوری انتظام کرتا تھا۔میں نے عظمی بے کو بلاکر کمال پاشا کے متعلق ایک تحریری حکم دیا۔جس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:-

" میں ایک فوجی افسر کو فوجی پولیس کے ہمراہ کمال پاشا کے مکان پر بھیجونگا۔پولیس چاروں طرف سے اُس کے مکان کا محاصرہ کرلے اور کسی آدمی کو اندر باہر جانے کی اجازت نہ دے۔افسر مذکور پاشا کے پاس جاکر گورنمنٹ کی طرف سے یہ پیغام پہنچائیگا کہ چونکہ پاشا کی قسطنطنیہ میں موجودگی سے امن عامہ میں خلل پڑتا ہے۔اور خونریزی کا اندیشہ ہے اس واسطے پاشا کو درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اسی جہاز میں مصر واپس چلا جائے ۔جس سے وہ آیا ہے۔اگر جہاز کچھ دنوں تک اس جگہ قیام کرے تب بھی پاشا کو جہاز میں بارہ گھنٹے کے اندر واپس چلا جانا چاہئے۔ ورنہ

حکومت ایسی جارحانہ کارروائی کرنے پر مجبور ہوگی۔ جو شاید پاشا پسند نہ کرے۔ افسر مذکور پاشا کا جواب آکر مجھے سُنا دیگا۔ اور تم اسی جگہ ڈٹے رہو۔ اور کسی شخص کو اندر آنے نہ دو" اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ پاشا نے افسر کو یہ جواب دیا۔ کہ چونکہ وہ سخت تھکا ہوا ہے۔ اس واسطے وہ دوبارہ سفر اتنی جلدی نہیں کر سکتا۔ اور وہ حکومت کی ناواجب استدعا کو منظور نہیں کر سکتا۔

انہی دنوں میں فٹز مارس جو انگریزی سفارتخانے کا ایک افسر تھا۔ کمال پاشا کی ملاقات کے لئے گیا تاکہ سفیر کی طرف سے پاشا مذکور کو خوش آمدید کہے۔ پولیس نے حسب معمول اُس کو اندر جانے سے منع کیا۔ وہ سیدھا محمود شفقت پاشا کے پاس چلا گیا۔ اور اس سے جاکر پولیس کے رویہ کی نسبت شکایت کی۔ اور میرے برخلاف بھی بہت کچھ زہر اُگلا۔ وزیر اعظم نے مجھے بُلایا۔ جب میں گیا، تو وہاں خلیل بے اور محمود پاشا (امیر البحر) بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے وزیر اعظم نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تم نے کمال پاشا کو نظر بند کر رکھا ہے۔ اور اُس کو قسطنطنیہ چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا ہاں۔ کیونکہ یہ امن عامہ کیواسطے نہایت ضروری ہے۔ وزیر اعظم نے غصّے میں آکر مجھے حکم دیا۔ کہ اُس کے مکان سے فی الفور پہرا اُٹھا لیا جائے، اور جہاں اس کی خوشی ہو وہاں رہنے دیا جائے۔ میں نے دبی زبان میں جواب دیا کہ میری رائے میں اس حفظ ماتقدم کے منسوخ کرنے سے بڑے خطرناک نتائج پیدا ہونگے۔ محمود شفقت یہ جواب سُنکر لال پیلا ہو گیا۔ اور کہا کہ کیا تم سپاہی نہیں ہو میرے حکم کی فی الفور تعمیل کرو۔ ورنہ میں تمہارے برخلاف محکمانہ کارروائی کرونگا۔ کیا تم انگریزوں کو ترکی کا دشمن بنانا چاہتے ہو۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں پاشا کو سمجھاؤں کہ دوسرے ممالک کو ہمارے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ لیکن وزیر اعظم کے تیور کچھ ایسے بدلے ہوئے تھے کہ وہ کسی قسم کی بحث سُننے پر تیار نہیں تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اور میں نے اُسے کہا کہ جس طرح آپ کی مرضی۔ آپ کے حکم کی تعمیل کیجائیگی۔ میرے جذبات کو اس وقت ایسی ٹھیس لگی کہ میں بالکل بے اختیار ہو گیا۔ لیکن محض حب الوطنی کی وجہ سے میں نے اس بدسلوکی کو طوعاً کرہاً برداشت کیا۔ میں وزیر اعظم کا شکریہ ادا کر کے باہر چلا آیا۔ جب اپنے دفتر میں آیا۔ تو عظمی بے کو بلا کر کہا۔ کہ وزیر اعظم کے حکم کے مطابق کمال پاشا کے مکان سے پہرا اٹھا دیا جائے اور اُس کی آمد و رفت میں کوئی روک ٹوک نہ کیجائے۔ لیکن دو خفیہ پولیس کے سپاہی مکان کے نزدیک کھڑے کئے جائیں۔ جو اُس کی نقل و حرکت اور اُسکے ملاقاتیوں

کو تاڑتے ہیں۔

میں نے گھر آکر محمود شفقت پاشا کو دو خط لکھے۔ ایک خط میں اس کو اطلاع دی کہ کمال پاشا کے متعلق جو حکم آپ نے دیا تھا اُس کی تعمیل ہوگئی ہے۔ اور دوسرے خط میں میں نے پاشا کی خدمت میں اپنا استعفےٰ بھیجدیا اور درخواست کی۔ کہ مجھے اس عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔ کیونکہ کام کی زیادتی کی وجہ سے میری صحت خراب ہوگئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ ایسے نازک وقت میں میری علیحدگی سے مُلک کو بجائے فایدہ کے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے لیکن میں مجبور تھا۔ کیونکہ جب تک مجھ کو اپنے فرائض کی تکمیل میں پُوری آزادی نہ ملے۔ میں شہر کی حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر سے وزیر اعظم بھی اپنی سخت کلامی پر پشیمان ہُوا۔ اس نے میرے خطوط ملنے سے پہلے ہی مجھے بُلایا۔ لیکن چونکہ میں اُسے خطوط پہنچنے سے پہلے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ اس واسطے میں نے کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے حاضری سے گریز کیا۔ پھر اُس نے مجھے رات کے نو بجے آنے کا حکم دیا۔

اس روز میرا استعفےٰ وزراء کی مجلس میں پیش کیا گیا۔ سب نے بالاتفاق رائے دی۔ کہ مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا جائے۔ میرے بعض دوست تو یہ بھی کہتے تھے کہ اگر تم نے اپنا استعفےٰ واپس نہ لیا۔ تو ہم بھی تمہاری تقلید کرینگے۔ وزیر اعظم بھی وزراء کی رائے سے متفق تھا۔ چنانچہ میں حسب وعدہ نو بجے رات کو اُس کی ملاقات کے واسطے گیا۔ وہ بڑے تپاک سے مجھے ملا۔ اور جاتے ہی مجھے کہا۔ کہ تم میری باتوں سے کیوں اتنے رنجیدہ ہوگئے ہو کیا تم نہیں جانتے کہ میں تمہیں اپنا لڑکا سمجھتا ہوں اگر والد اپنے لڑکے کو کسی بات پر تنبیہ کرے۔ تو کیا لڑکے کو اس سے مُنہ موڑ لینا چاہیئے۔ میں نے عرض کی کہ میں واقعی آپ کو اپنے والد کے بجا سمجھتا ہوں لیکن میں آپ کی سخت کلامی سے ہرگز ناراض نہیں ہُوا اگر آپ اس سے بھی زیادہ مجھے ڈانٹیں۔ تو پھر بھی میں برداشت کرنے کو تیار رہوں لیکن میں نے استعفےٰ اس واسطے دیا ہے کہ میں ان حالات کے ماتحت اچھی طرح سے اپنے فرائض نہیں ادا کر سکتا۔ جناب کو غالباً یہاں کی باغیانہ سازشوں کے متعلق کچھ علم نہیں، اور نہ ہی میں اس وقت آپ کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دارالخلافہ میں زبردست خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ کمال پاشا کو اس واسطے یہاں بُلایا گیا ہے۔ تاکہ آپ کو قتل کر کے آپکے بجائے اس کو وزیر اعظم بنائیں۔ اگر اس کو اسی وقت ترکی سے باہر نکال دیا گیا، تو باغیوں کی طاقت کمزور ہو جائیگی۔ ورنہ عنقریب ہی ایک بڑی خوفناک بغاوت برپا ہونیکا

اندیشہ ہے۔ جب جناب نے مجھے اس عہدے پر مامور کیا تھا۔ تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اپنے کام میں مکمل آزادی ہوگی لیکن جب آپ میرے اختیار کم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ تو میں شہر کی حفاظت اور وزیروں کی جانوں کا ذمہ دار کیسے ہو سکتا ہوں برطانیہ کی سفارت کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارے اندرونی تنازعات میں دخل اندازی کرے۔ پاشا موصوف نے بڑی سوچ بچار کے بعد کہا۔ کہ جاؤ جو تمہاری مرضی ہو کرو لیکن برائے مہربانی کمال پاشا کو ناجائز تنگ نہ کرنا۔ اُس کو دو تین دن یہاں ٹھہرنے کی مہلت دیدو۔ جب یہ سارا معاملہ طے ہو گیا، تو میں نے اپنا استعفےٰ واپس لے لیا۔ دفتر میں آکر میں نے کمال پاشا کے لڑکے عبداللہ بے کو دوسرے دن کے واسطے بلایا۔ جب وہ آیا۔ تو میں نے اُسے سمجھایا کہ اپنے والد کو کہ قسطنطنیہ سے اسی وقت باہر چلا جاتے۔ کیونکہ حکومت اپنے حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی کسی اور سلطنت کی سفارش مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے صاف طور پر اُسے کہدیا کہ اگر پاشا موصوف کل تک روانہ نہ ہوا تو مجھے مجبوراً اُس کو گرفتار کر کے اناطولیہ میں کہیں نظر بند کرنا پڑیگا۔ عبداللہ بے پہلے تو بہت تلملایا۔ لیکن آخرکار اُس نے مجھ سے وعدہ کیا۔ کہ وہ اپنے والد کو اِس بیفایدہ مخالفت سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا۔

اسی شام کو عبداللہ بے نے مجھے اطلاع کہ کمال پاشا دوسرے دن روانہ ہو جائیگا۔ چنانچہ پاشا دوسرے دن اسی جہاز پر سوار ہو گیا۔

خفیہ پولیس کی اطلاعات سے پتہ لگتا تھا کہ باغی چند ہی دنوں میں ایک وسیع پیمانے پر بغاوت کرنیوالے ہیں۔ ۱۵۔ جون ۱۹۱۳ء کو صبح کے وقت میں حسب معمول جنگی محکمہ میں وزیر اعظم سے احکام لینے کے لئے گیا وزیر اعظم کا ابڈی کانگ مجھے رستے میں مل گیا۔ میں نے اُس کو تاکید کی۔ کہ جب پاشا موصوف باہر جایا کرے، تو اچھی طرح سے حفاظت کرو۔ پھر یہ بات کہکر میں وزیر اعظم کے کمرے میں گیا۔ اور ایک آدھ گھنٹے تک اس سے بات چیت ہوتی رہی۔ وہ اُس دن غیر معمولی طور سے بشاش نظر آتا تھا۔ چونکہ میں اُس کو خواہ مخواہ متفکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس واسطے میں نے معمولی طور سے ذکر کیا۔ کہ چونکہ آجکل قاتلانہ حملوں کا سخت اندیشہ ہے۔ اس واسطے اس کو خبردار رہنا چاہتے۔ میرا ارادہ ہے کہ احتیاطاً چند ایک باغیوں کو کل یا پرسوں تک گرفتار کرلوں۔ پاشا نے جواب دیا۔ کچھ فکر نہیں خدا میرا محافظ ہے۔ میں اس سے رخصت ہو کر ایک دوسرے کمرے میں کسی سرکاری کام کے لئے چلا گیا۔ جہاں میجر سعد لعید

اور میجر کمال بے کے ساتھ باتیں کرنے لگ پڑا۔ کوئی پندرہ منٹ گزرے ہونگے کہ اچانک پستول کی گولیوں کا آواز جنگی دفتر کی طرف سے آیا۔ مَیں معاً تاڑ گیا کہ کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ اُسی وقت میرا نوکر ہانپتا ہوا اندر آیا اُس نے کہا کہ وزیراعظم کو کسی نامعلوم شخص نے شہید کر دیا ہے۔ مَیں نے پُوچھا کس جگہ قتل کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا۔ کہ بایزید کے چوک میں۔ جب میں بھاگ کر دفتر سے باہر نکلا تو لوگ پاشا کو اُٹھا کر اس کے کمرے میں لا رہے تھے۔ اُس کا تمام جسم خُون سے لتھڑا ہوا ایک دو منٹ کے بعد وہ مرگیا۔ اس کی جان کنی کی کیفیت ابتک میرے دماغ میں منقوش ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ سب سے پہلے قاتل کو گرفتار کرنا چاہیے۔ مَیں سیدھا جنگی دفتر میں چلا گیا۔ رستے میں مجھے فوجی پولیس کا ایک افسر ملا۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ کیا قاتل گرفتار ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا۔ مجھے معلوم نہیں۔ مَیں گارد کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ مَیں نے اُسے غصّے میں آکر کہا۔ کہ گارد کو کیا کرو گے۔ جاؤ۔ اور ابھی قاتل کو گرفتار کرو۔ ورنہ وہ کہیں بھاگ جائیگا۔ وہ افسر جاتے وقوعہ کی طرف اُلٹے پاؤں لوٹا۔ جب مَیں پانچ چھ منٹ کے بعد موقع پر پہنچا تو افسر مذکور نے مجھے بتایا۔ کہ ایک قاتل تو گرفتار کیا گیا

ہے لیکن اس کے ہمراہی بھاگ گئے ہیں۔ مَیں نے اسی وقت شہر کے مختلف حصوں میں سخت پہرا لگا دیا۔ اور ایک اعلان شائع کر دیا۔ جس میں پبلک کو اس افسوسناک حادثہ کے متعلق اطلاع دی گئی۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ اگر کسی نے ذرا سی شرارت یا فساد کیا تو اس کو عبرتناک سزا دیجائیگی۔ مَیں نے اسی دن عزت پاشا سے۔ جو ڈپٹی کمانڈر انچیف تھا۔ درخواست کی کہ وہ دو رسالے اور دو پیادہ فوجیں شہر کی حفاظت کے واسطے بھیجدیں۔ تمام وزرا کو مَیں نے اطلاع دی۔ کہ وہ فوجی وزارت خانے میں جلدی تشریف لائیں۔

محکمہ پولیس نے میری ایما پر پہلے ہی سے ان لوگوں کی فہرستیں تیار کر رکھی تھیں جن کے متعلق اشتباہ تھا۔ مَیں نے عظمی بے کو حکم دیا۔ کہ وہ ان تمام مشتبہ گان کو گرفتار کرے۔ دوسرے دن ان آدمیوں کو ایک جہاز میں لدوا کر سینوپ بھیجدیا گیا۔ مَیں نے داماد صالح پاشا کو بھی گرفتار کرا لیا تھا۔ اور پولیس نے اس کے مکان کی تلاشی لی۔ وزیراعظم کی موت کے بعد سید حلیم پاشا اس کا قائم مقام بنایا گیا۔

میرا ارادہ تھا کہ پاشا موصوف کا جنازہ بڑے تزک واحتشام سے بازاروں میں گشت لگا کر قبرستان میں جاتے۔ بدیں غرض مَیں نے غیر ملکی سفیروں، جرنیلوں

امیرالبحروں و دیگر اعلےٰ افسران کو اس جنازے میں شریک ہونے کی درخواست کی۔ مَیں چاہتا تھا کہ عوام الناس کے دلوں میں اس موت سے اچھا اثر پڑے چنانچہ مَیں نے جگہ جگہ پر فوجی پہرا لگا دیا۔ تاکہ کسی قسم کا کوئی فساد نہ ہو۔ کئی افسر تو کہتے ہوئے سُنے گئے کہ قتل کے دوسرے دن ہی اس قسم کا جلوس نکالنا ایک خطرناک غلطی ہے۔ کیونکہ ابھی تک باقی قاتل پکڑے نہیں گئے تھے لیکن چونکہ مجھے اپنے انتظام پر اعتبار تھا۔ کہ نقض امن کا خطرہ نہ ہوگا۔ اس واسطے میں بیفکر تھا۔ مجھ سے ایک غیر ملکی جرنیل نے گفتگو کے دوران میں یہ ذکر کیا۔ کہ اگر کسی شخص نے خدانخواستہ کسی فرنگی کو اس جلوس میں قتل کر دیا تو ترکی پر عذاب ٹوٹ پڑیگا۔ مَیں نے اُسے یقین دلایا۔ کہ اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بالآخر جنازہ بغیر کسی حادثہ کے قبرستان میں پہنچایا گیا۔ اور مَیں نے فرنگی طاقتوں کو جتلا دیا۔ کہ حکومت ترکی اپنے ملک کو محفوظ رکھنے پر خود قادر ہے۔ اور کسی غیر ملک کی مدد کی کچھ ضرورت نہیں۔

اس قتل کے تیسرے روز تمام قاتل گرفتار کر لئے گئے۔ اور ان کو کورٹ مارشل کے سپرد کر دیا گیا۔ دوران تفتیش میں ثابت ہوا۔ کہ باغیوں کی جماعت نے انجمن اتحاد و ترقی کے تمام ارکین کو قتل کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ کمال پاشا یا صباح الدین کو وزیر اعظم بنا کر حکومت کے اعلےٰ عہدے اپنی جماعت میں تقسیم کریں گے۔ کورٹ مارشل نے ملزمان کو مختلف سزائیں دیں۔ مَیں نے فیصلہ کے بعد بھی ان کے پاس اپنے آدمی بھجوائے۔ تاکہ اگر وہ اس سازش کے صحیح واقعات قلمبند کر کے حکومت کو بھیجدیں۔ تو اُن کو رہا کر دیا جائیگا۔ کیونکہ مَیں چاہتا تھا کہ عوام الناس کو اس جماعت کی حرکات سے واقفیت ہو جائے۔ تاکہ وہ آئندہ انجمن اتحاد و ترقی کو بدنام نہ کریں۔ لیکن قیدیوں نے میری شرط کو منظور نہ کیا۔

داماد صالح پاشا کو کورٹ مارشل نے پھانسی کی سزا دی۔ سلطان المعظم نے ابھی تک اس فیصلہ پر شاہی مہر ثبت نہ کی تھی۔ کہ اس فیصلے سے لوگوں میں کچھ اضطراب پیدا ہو گیا۔ ایک روز مجھے فرانسیسی سفیر نے بلایا۔ جب میں وہاں گیا۔ تو اُس نے مجھے ایک تار دکھائی۔ جو پائکن (فرانسیسی وزیر امور خارجہ) نے بھیجی تھی۔ اس کا مضمون یہ تھا۔ "ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ صالح پاشا کو موت کی سزا دی گئی ہے۔ اس خبر سے ٹیونس میں بڑی بے چینی پھیل رہی ہے۔ کیونکہ وہ ٹیونس کا ایک بڑا نامور رئیس ہے۔ اور وہاں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے حکومت فرانس کو اندیشہ ہے کہ اس سزا سے ٹیونس میں فساد برپا ہو جائیگا۔ اس واسطے فرانس داماد صالح پاشا

کے متعلق دخل اندازی کرنے پر مجبور ہو گی۔ براہ مہربانی فوراً وزیراعظم سے اس کے متعلق بات چیت کرو۔ اور اس مجبور کرو کہ داماد صالح پاشا کو رہا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے ملک میں واپس چلا جائے" میں تار پڑھ کر کچھ عرصہ خاموش رہا۔ تب میری سمجھ میں آیا۔ کہ صالح پاشا نے ان سازشوں سے باوجود ہمارے فہمائش کے کیوں قطع تعلق نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اُس کو یقین ہوگا کہ فرانس اس کی آڑے وقت میں مدد کریگا۔ میں نے سفیر کو یوں جواب دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں فرانس سے کس قدر ہمدردی رکھتا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے اس معاملے میں دخل دیا تو ترک آپ کے مُلک کے مخالف ہو جائینگے۔ صالح پاشا کے برخلاف کافی ثبوت گزر چکا ہے۔ اور اب اس کی زندگی سلطان المعظم کے ہاتھ میں ہے۔ اس قسم کی باغیانہ سازشوں سے حکومت ترکی دن بدن کمزور ہو رہی ہے۔ اور اس دفعہ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ملزمان کو عبرتناک سزائیں دیں۔ تاکہ آیندہ اس قسم کے فساد برپا نہ ہوں۔ وزیراعظم کے پاس سفارش کرنے سے صالح پاشا کی جان ہرگز نہیں بچ سکتی۔ لیکن اس دخل اندازی سے ترکوں کو یقین ہو جائیگا۔ کہ فرانس درپردہ ان باغیوں کی حمایت کرتا ہے۔ میری رائے ہے کہ آپ وزیر امور خارجہ کو سمجھائیں۔ کہ اس خیال کو

ترک کر دے۔ سفیر نے میری بات مان لی۔ اور ہمارے وزیراعظم کے پاس سفارش کرنے نہ گیا۔ بلکہ فرانس کی حکومت کو اپنی رائے بھیجدی۔ لیکن دو دن کے بعد ہی رات کے گیارہ بجے پھر فرانسیسی سفیر نے مجھ سے بذریعہ ٹیلیفون درخواست کی۔ کہ میں جا کر اسے ملوں۔ جونہی میں اس کے کمرے میں گیا۔ اُس نے ایک اور تار مجھے پڑھنے کے واسطے دی۔ جو وزیر امور خارجہ نے بھیجی تھی۔ اور جس کا مضمون یہ ہے۔" جس طرح بھی ہو سکے داماد صالح پاشا کو بچانا چاہئے۔ براہِ مہربانی فوراً وزیراعظم سے اس امر کے متعلق تصفیہ کیا جائے۔ میں نے اُسے کہا کہ اب آپ کی سفارش کسی کام نہ آئیگی۔ کیونکہ سلطان المعظم نے سزائے موت کی اجازت دیدی ہے۔ اور پاشا مذکور کو کل علی الصبح پھانسی پر لٹکایا جائیگا۔ اور چونکہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس واسطے آپ وزیراعظم کی ملاقات اس وقت نہیں کر سکتے۔ اور کل اگر آپ نے بالفرض وزیراعظم کو منوا بھی لیا تو بالکل بےفایدہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے پاشا مر چکا ہوگا۔ سفیر نے دخل اندازی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور اس کی ذمہ داری اپنے سر پر لی۔ دوسری صبح داماد صالح پاشا پھانسی پر لٹکایا گیا۔

پاشا کے مرنے سے چند روز پہلے میں نے اس

کے دو بھائیوں کو بھی گرفتار کرلیا تھا۔ فرانسیسی حکومت نے ان کے حق میں بڑا زور مارا۔ آخر کار یہ فیصلہ ہُوا۔ کہ وہ آیندہ ترکی معاملات میں کسی قسم کا حصّہ نہ لیں۔ اور فرانس میں چلے جائیں۔ ان دنوں میں ہمارے مخالفین نے یہ افواہ اُڑائی تھی۔ کہ سلطان المعظم نے صالح پاشا کی سزائے موت پر شاہی مہر ثبت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ پاشا موصوف اس کا رشتہ دار تھا۔ اور میں نے اور طلعت بے نے پادشاہ کو دستخط کرنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ جب سلطان نے مقدمہ کے کاغذات ملاحظہ کئے۔ تو اس کو یقین ہوگیا تھا کہ پاشا اور اُس کے ہمراہی سلطنت کی بیخکنی پر تلے ہُوئے تھے۔ اس نے خوشی سے مہر ثبت کر دی

(ماخوذ) محمد علی وکیل

رُباعیات

(۱)

تو مجھ کو رواں دواں لئے جاتا ہے ہمراہ کشاں کشاں لئے جاتا ہے
اتنا تو بتا' اے کاروانِ مہ و سال یوں رشتہ بپا کہاں لئے جاتا ہے

(۲)

ہنستا ہے تو کبھی' کبھی روتا ہے ظاہر اس کا سبب نہیں ہوتا ہے
ہنسنے رونے سے اے مرے دل' تیرا پردے پردے میں کیا یہ سمجھوتا ہے؟

(۳)

کیا چیز تھا دورِ آسماں میرے لئے؟ کیا تھے غم و شادیٔ جہاں میرے لئے؟
ہنگامے یہ کیا تھے ایک ہوتا نہ جو تو؟ تو ہے اے دل' بلائے جاں میرے لئے

"ہ"

وجدانیات

برقِ جمالِ یار کی تنویر دیکھنا
شادابیٔ نگاہ کی تصویر دیکھنا

دامن کو دستِ شوق میں پاؤگے تم اسیر
میری درازدستیٔ تدبیر دیکھنا

انکارِ آرزو پہ ہے اقرار کا گماں
رنگیں رُخوں کی شوخیٔ تقریر دیکھنا

پھر لے کے اپنے ساتھ جنوں آگئی بہار
پھر میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیر دیکھنا

اس رشکِ مہر و ماہ کی امید مٹ گئی
اب رنگِ مہر و ماہ کو دلگیر دیکھنا

خوشبوئے عشق سے ہے معطر لباسِ دوست
میری وفا کا عالم تاثیر دیکھنا

دل رہ گیا ہے ڈوب کے حسنِ نگار میں
رنگینیٔ خیال کی تفسیر دیکھنا

وہ جوشِ اضطراب سکوں ہو کے رہ گیا
خوابِ جنوں کی شوخیٔ تعبیر دیکھنا

دو روز میں گلاب کی رنگت بدل گئی
عابدؔ بنائے حسن کی تعمیر دیکھنا

عابدؔ

ہزار داستان کا انعامی مقابلہ

"ہزار داستان کی طرف سے ہر ماہ مختصر افسانوں کے ایک انعامی مقابلے کا اعلان ہوا کریگا جسکے قواعد و ضوابط حسب ذیل ہیں"

(۱) افسانوں کے لئے کسی موضوع کی تعیین نہ ہوگی۔ اس کا انتخاب افسانہ نگار کی ذاتی رائے پر چھوڑ دیا جائیگا۔

(۲) ترجمہ، ماخوذ اور طبعزاد افسانوں میں کوئی تفریق نہ ہوگی۔ تاہم ہندوستانی معاشرت کے افسانوں کو ترجیح دیجائیگی۔

(۳) افسانے کی ضخامت کی کوئی حد مقرر نہیں۔ تاہم "مختصر افسانہ" کے نام کی رعایت سے اختصار جتنا ہو بہتر ہے۔

(۴) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

(۵) افسانے خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھے جانے چاہئیں۔

(۶) امتیازی نشان کے طور پر ہر افسانے کے اُوپر "ہزار داستان کے انعامی مقابلے کا افسانہ" کے الفاظ جلی قلم سے تحریر کئے جانے چاہئیں۔

(۷) ہر افسانے پر مصنّف کا نام، پورا پتہ خوشخط تحریر ہونا چاہئے۔

(۸) افسانہ جس ماہ کے انعامی مقابلے کی شرکت کے لئے بھیجا جائے۔ اس کی ۲۰۔ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہونا چاہئے۔

(۹) جو افسانہ منصفین یعنی (۱) جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی (۲) سیّد عابد علی عابدؔ بی اے ایل ایل بی وکیل د (۳) مدیر ہزار داستان کے فیصلے سے اول درجہ پائیگا اُس پر بیسؔ روپے کا انعام دیا جائیگا۔ جو بذریعہ منی آرڈر صاحب افسانہ کی خدمت میں ارسال کر دیا جائیگا۔

(۱۰) بہترین افسانے کے علاوہ اگر اور افسانے بھی کامل المعیار تصوّر ہونگے تو اُن پر بھی منصفین اگر مناسب سمجھیں، تو مزید انعامات دینگے۔

(۱۱) کوئی افسانہ واپس نہیں بھیجا جائیگا۔

(۱۲) انعامی مقابلے کے افسانوں کو مجموعہ کی صورت میں شائع کرنے کا حق صرف پروپرائیٹر ہزار داستان کو ہوگا۔

(۱۳) اگر کوئی افسانہ کسی مقابلے میں منصفین کے مقررہ کردہ معیار پر پورا نہ اُترے گا تو اُس صورت میں اُن کو حق ہوگا کہ کوئی انعام نہ دیں۔

شرکت کی شرائط حسب ذیل ہیں:۔

شرکت کا استحقاق عام ہے۔ لیکن ہر شریک ہونے والے کو آٹھ آنے بطور داخلہ کی فیس کے ادا کرنے ہونگے جس کی عدم ادائیگی کی صورت میں کوئی افسانہ شریک مقابلہ نہ تصوّر ہوگا۔ اس کے عوض میں اسے اس ماہ کا ہزار داستان ارسال کیا جائیگا۔

مینجر

تنقید و تبصرہ

رُوحِ تنقید - از ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زورؔ بی - اے - جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۲۰۶ صفحے - قیمت ۱۲/ عثمانی - ملنے کا پتہ - مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ یا مصنف نظامت منزل کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد دکن ✦

کسی ادب کی تاریخ میں تنقید کا دَور حقیقی معنوں میں اُس وقت تک شروع نہیں ہوتا - جب تک اُس کی تخلیق و اختراع کی قوتیں اپنی نشو و نما کے ابتدائی مراحل طے کر کے ایک اعلیٰ درجۂ ترقی پر نہ پہنچ چکی ہوں - اور یہ کُلّیہ قطع نظر اس کے کہ ادبیات کی تاریخ اس کی صداقت کہاں تک شاہد ہے - بالکل قرین قیاس ہے - تخلیقی ادب اور تنقید کو آپس میں وہی تعلق ہے جو ایک جذبہ میں اور اس کے تحلیل و تجزیہ میں ہے - یہ ایک نفسیاتی قانون ہے کہ جب تک کوئی جذبہ اپنی تمام قوت صرف کر کے اختتام کو نہ پہنچ چکا ہو، اس وقت تک اُس کو مشاہدۂ نفس کے تحت میں نہیں لایا جا سکتا اور اُس کا تحلیل و تجزیہ نہیں کیا جا سکتا - کیونکہ جذبہ اور اُس کا مشاہدہ دو ایسی متضاد و نفسانی کیفیتیں ہیں جن کا اجتماع محال ہے - مثلاً اگر کوئی شخص ہنستے ہنستے اپنی ہنسی پر غور کرنے لگے تو فوراً اس کی نفسانی کیفیت میں تغیر واقع ہو جائیگا - اور اس طرح اُس کا موضوعِ فکر ہنسی کے بجائے کچھ اَور ہو جائے گا - اسی طرح کسی ادب کے ابتدائی مراحل میں، جب اُس کی تخلیقی قوتیں ایک ایسے پُرجوش جذبے کے مائل ہوتی ہیں جو قوتِ غور و فکر کو سلب کر لیتا ہے، یہ ایک امر ممتنع ہے کہ تنقید اُس کا جزو غالب ہو - دوسرے الفاظ میں تخلیقی دَور تنقیدی دور سے بلحاظ زمانہ مقدم ہوتا ہے ✦

واضح رہے کہ "تخلیقی" اور "تنقیدی" دَور میں جو امتیاز قائم کیا گیا ہے وہ انفرادی مصنفین سے صرفِ نظر کر کے اور صرف اکثریت اَور تحریک عام کی رعایت سے کیا گیا ہے - ورنہ یہ کوئی نہیں کہ سکتا کہ کسی تنقیدی دَور میں تخلیقی مصنف یا

تخلیقی دور میں تنقیدی مصنف نہیں پیدا ہو سکتے اور ایک ہی مصنف دونو قسم کی ادبیات کا جامع نہیں ہو سکتا ۔

ادبیات کی تاریخ بتاتی ہے کہ تنقید کا دور عموماً اس طرح شروع ہوتا ہے کہ کسی ادب کا ایک مہتمم بالشان دور، جو تخلیقی کارناموں سے مالامال ہے اختتام کو پہنچتا ہے، اور اُس کے ردِ عمل کے طور پر ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں تنقید کی نگاہ بازپسیں گذشتہ دور کے کارناموں کا جائزہ لیتی ہے اور ان کا محاکمہ و محاسبہ کرکے اُن کی قدر متعین کرتی ہے ۔ یہ دور لازمی طور پر تخلیقی ادب کے انحطاط اور تنقید کے فروغ کا زمانہ ہوتا ہے ۔ اس میں ادب کے اصول و فروع ، اور قواعد و ضوابط مرتب کئے جاتے ہیں، گویا ادب جو فی الاصل ایک فن لطیف ہے، نفسیات، یا اخلاقیات، یا حسابیات یا اسی قسم کے دوسرے علوم کی طرح ایک منضبط و منتظم علم کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے ۔ بہرحال یہ دور اگر بجائے خود تخلیقی و تخیلی ادب کے فروغ کا زمانہ نہیں ہوتا، تو ایک ایسے عظیم الشان دور کا پیش خیمہ ضرور ہوتا ہے جس میں تخلیقی ادب کو غیر محدود ترقی حاصل ہوتی ہے وجہ یہ کہ تنقید کے دور کے بعد جو لوگ آتے ہیں اُن کے سامنے اسلاف کے کارنامے نمونے کے طور پر موجود ہوتے ہیں، اور اُن کے معائب و مناقب بھی تنقید کے وسیلے سے منکشف ہو چکے ہوتے ہیں، اس بنا پر اُن کے لئے محاسن کی تقلید اور معائب سے احتراز کی کی بہت کچھ گنجائش ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ اس سے ادبی ورثے کا ایک غیر محسوس اثر بھی ہوتا ہے جو بالکل اُس اثر سے مشابہ ہے جو کسی ایسی قوم کے لئے جس کے عہد ماضی کی تاریخ عظمت کی داستانوں سے پر ہو جوشِ عمل کا محرک ہوتا ہے ۔

ان مطالب کو ذہن نشین کر لینے کے بعد جب ہم اردو کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اُس نے اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل بمشکل طے کئے ہیں ۔ کچھ تو اُس کی ابتداء کو کوئی زیادہ زمانہ نہیں گذرا، اور کچھ ہندوستان کی ذہنی ترقی کی سست رفتاری! ایسے میں اُس نے جو ترقی کر لی ہے ۔ وہی غنیمت ہے ۔ تاہم یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی تخلیقی قوتیں اپنی معراج کے قریب پہنچ چکی ہیں ع

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

اس سے آپ مندرجہ بالا کلیہ کے مطابق اندازہ کر سکتے ہیں کہ ابھی تنقید کا دور کتنا دور ہے ۔ چنانچہ ہمارے یہاں تنقیدی ادب کے قحط کی جو یہ حالت ہے کہ فنِ تنقید کی مستقل کتابوں کا تو کیا ذکر، تنقید کے پریشان مضامین بھی اتنی تعداد میں نہیں ملتے کہ ہم

انہیں اپنے ادب کا کوئی قابل قدر عنصر کہہ سکیں، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں +

لیکن کچھ عرصہ ہوا دکن میں، جو اس وقت اُردو کا مرکز کہلائے جانے کے استحقاق میں پنجاب کا کامیاب حریف ہے، ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کی بہت کم توقع تھی۔ اس کتاب کا نام ہے "روحِ تنقید" اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ادب کا عہد جدید میں جو مفہوم ہے وہ اردو دان طبع پر واضح کیا جائے۔ اس کے متفرق شعبوں میں مابہ الامتیاز قائم کیا جائے، اور اس کے حسن و قبح نقص و کمال، اور قدر و قیمت کے اصول ترتیب دیئے جائیں۔ مختصر یہ کہ تنقید کا ایک مستقل فن جدید اصولوں کے تدوین کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل جس قدر مشکل اور ہمت فرسا ہے اور جن جن دقتوں کا سامنا مؤلف کو کرنا پڑا ہوگا، اُن کا اندازہ سرسری طور پر اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اردو میں فن تنقید پر جدید اصولوں کے مطابق کتاب لکھنے کے لئے نہ کوئی مصطلحات کا ذخیرہ جمع ہے اور نہ کوئی ایسی کثیر التعداد اور مختلف النوع تصنیفات و تالیفات ہی ہیں جن کو تنقید کا مبحث بنایا جا سکے۔ لیکن مؤلف نے مصطلحات کی مشکل اسی طریقے سے رفع کی ہے کہ جو آج کل عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے اور کرنا پڑتا ہے۔ یعنی حسب ضرورت یورپ کی مروجہ مصطلحات کا ترجمہ کر لیا ہے، یا اُن کے لئے جدید تراکیب اختراع کر لی ہیں، یا جہاں ان دونوں میں سے کوئی صورت ممکن نہ تھی، یورپ کی مصطلحات بنفسہٖ عاریتاً لے لی ہیں، اگرچہ اس آخری صورت کی مثالیں بہت کم ہیں، کیونکہ اُن کا ایک مقصد اپنی زبان میں تنقیدی ذخیرہ الفاظ کا رائج کرنا بھی معلوم ہوتا ہے۔

میں ان تینوں قسم کی مصطلحات کی جو انہوں نے استعمال کی ہیں تھوڑی تھوڑی مثالیں پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تو خود تنقید کا لفظ جو اردو میں کرٹسزم کا مرادف قرار دیا گیا ہے، اپنے مفہوم کی تصریح کا محتاج ہے، کیونکہ باوجود کثرت استعمال کے اُس کی پوری پوری دلالت معنوی عام لوگوں کو ابھی معلوم نہیں، جس کی وجہ سے عموماً غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ مؤلف نے اس لفظ پر، اس کے مختلف مفاہیم پر جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، اور اس کے اُس مخصوص معنی پر جس میں انہوں نے اسے استعمال کیا ہے ایک طویل بحث کی ہے، جو کتاب کے سب سے پہلے باب میں درج ہے۔ یہاں اس بحث کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے یا اُن کی طرف اشارہ کرنے کی بھی گنجائش نہیں۔ البتہ اس کا ماحصل جو اس کا سب سے ضروری حصہ ہے پیش کیا جاتا ہے۔

یہ تنقید کی جامع و مانع تعریف نہیں، بلکہ اس کا وسیع ترین

مفہوم۔ وجوہ ذا "فن تنقید اُس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کی حرکات واقوال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں، صحیح وغلط، اچھے اور بُرے، اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنا، دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا، وقلبیہ معتقدات اور ذاتیات کو ملیامیٹ کرنا، نیز صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کو تنقید کہتے ہیں +

اس کے بعد تنقید کے دو متضاد پہلوؤں یعنی تقریظی اور تخلیقی تنقید سے بحث کی گئی ہے، اور اُن کے باہمی فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ قرائن سے یہ دونو الفاظ علی الترتیب (destructive) اور (constructive) کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے مقابلے کے انگریزی الفاظ کہیں نہیں لکھے گئے۔ پہلے لفظ "تقریظی تنقید" سے اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ مؤلف نے انگریزی کے لفظ ([illegible]) کا مطلب ادا کرنے کی کوشش میں اس کے اصلی معنوں کی غیر ضروری تحدید کر دی ہے۔ لفظ "تقریظ" محاسن ومعائب دونو کے دکھانے پر حاوی ہے۔ کیا "تخریبی تنقید" یا "تنقیص" اس موقع کے لئے بہتر لفظ نہ ہوتا؟

ایک دوسری تقسیم تنقید کی ایک اور بنا پر کی گئی ہے یعنی داخلی اور خارجی۔ یہ الفاظ (internal) اور (external) کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کا صرف ذکر کیا گیا ہے۔ کوئی توضیح نہیں کی گئی +

مصطلحات کی ایک اور مثال تخلیقی یا تخیلی ادبیات (creative or imaginative literature) اور تنقیدی ادبیات (critical literature) کے الفاظ سے ملتی ہے جو خالص ادب اور تنقید ادب کے باہمی فرق کو واضح کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں +

خیر اس قسم کی متعدد مثالیں اُن مصطلحات کی دی جا سکتی ہیں جو مؤلف کو یا اپنی زبان میں موجود مل گئی ہیں، یا انہوں نے وضع کی ہیں۔ مندرجہ بالا مصطلحات صرف ایک باب سے بطورِ مشتے نمونہ از خروارے پیش کی گئی ہیں +

دوسری دقت جو مؤلف کو اس کتاب کی تحریر میں پیش آئی ہوئی، اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اردو میں ذخیرۂ ادبیات کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس پر غلبہ پانے کی ایک ہی صورت تھی، جو اگرچہ عجز کا اعتراف ہے لیکن امر مجبوری ہے۔ یعنی مؤلف نے اپنی تمام بحث یورپ کی ادبیات سے متعلق رکھی ہے۔ یورپ ہی کے اصنافِ ادب، یورپ ہی کے مصنفین اور نقاد اور یورپ ہی کے ادبی شاہکاروں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ جا بجا

مختلف مشرقی زبانوں مثلاً عربی، فارسی، اردو وغیرہ کے
مصنفین اور نقادین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُن کے
اقوال سے استناد و استشہاد کیا گیا ہے، یا اُن کی تصنیفات
پر بحث کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں مشرق و
مغرب کے مشاہیرِ علم و ادب کے اقوال اُن کی تشریح و
توضیح، اور اُن کے موازنہ و مقابلہ اور اُن کی تصنیفات کے
تذکرے ملے جلے معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑتا
ہے کہ بنیاد یورپی ہے، اور اس پر جو عمارت کھڑی کی گئی
ہے وہ بھی یورپی طرز کی ہے، صرف مشرقی طرز کے دریچے
کہیں کہیں لگا دیئے گئے ہیں جن سے اس عمارت میں
روشنی آتی ہے۔ مؤلف نے ادب کا ایک نیا تصوّر،
اُس کی تقسیم کا ایک بالکل نیا طریقہ، اُس کے حُسن و قبح،
حق و باطل، صحت و سقم کے پرکھنے کا ایک بالکل نیا
معیار اردو دان طبع کے سامنے پیش کیا ہے، جو غالباً اپنے
مخاطبوں کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوگا۔ اس لحاظ سے
جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے کہ ادب کا جو مفہوم آج
کل مہذب دُنیا میں لیا جاتا ہے وہ عام اردو دانوں کے
ذہن نشین کیا جائے، اس کتاب کی کامیابی کسی وسیع
پیمانے پر یقینی نہیں، کیونکہ اس کا روئے سخن ایک
محدود حلقے کی جانب ہے، یعنی اُس حلقے کی جانب جو
انگریزی اور اردو دونوں سے واقفیت رکھتا ہے +

رہی یہ بات کہ یہ کتاب قطع نظر اس سے کہ یہ اپنے
مقصد میں پوری پوری کامیابی حاصل کر سکے گی یا نہیں
بذاتِ خود کیسی ہے؟ اس کی نسبت میں یہ کہوں گا کہ
اردو کی موجودہ بضاعتِ علمی کا خیال کر کے فی الحال جس
معیار کی کتاب مبادیِ ادب پر لکھی جا سکتی تھی یہ ویسی
ہی ہے۔ مطالب و مضامین کی ترتیب اور تدوین کو دیکھئے
طرزِ تحریر کی ادبیت کو دیکھئے، بحث کے شرح و بسط کے
ساتھ ساتھ اختصار کو دیکھئے تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے
کہ مؤلف نے تحریر کے سلیقہ کا نہایت اچھا ثبوت دیا ہے
یہ سچ ہے کہ بعض بعض جگہ عبارت کی ایسی غلطیاں ہیں جو
سہو کاتب پر محمول نہیں کی جا سکتیں، اور جن کے گنوانے
کی یہاں گنجائش نہیں، اور بعض مباحث تشنہ رہ گئے ہیں
مثلاً مروج تنقید جو شاید سب سے زیادہ تفصیل کی مستحق
تھی، اور نقادوں کے اقوال جو بغیر تشریح و تفسیر کے
مغالطہ اور گمراہی کا باعث ہو سکتے ہیں، اور یہ بھی سچ ہے
کہ مؤلف نے تنقید کے متعلق جو کچھ مواد فراہم کیا ہے،
اُسے ترتیب وار جمع کر دیا ہے، لیکن کسی خاص نقطۂ نگاہ
سے اس مواد کی ترتیب نہیں کی، اور کوئی خاص مذہب
تنقید مدوّن کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن یہ فروگذاشتیں
نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں خاصکر آخری فروگذاشت
جو اگر نہ ہوتی تو بہتر تھی، لیکن اس کے پورا کرنے میں بحث

کے پیچیدہ اور دقیق ہو جانے کا احتمال تھا۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ کاغذ بھی گوارا ہے ٭

تیغ اور مُسلم۔ ایک نظم جو انجمن حمایت اسلام لاہور کے چالیسویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ مصنفہ جناب ابونعیم عبدالحکیم نشتر جالندھری۔ تقطیع جُم ۶، ۱ صفحے۔ قیمت ۲ر فی جلد۔ ملنے کا پتہ:۔ مرغوب ایجنسی لاہور ٭

اگرچہ طبعی اختلافات کے تقاضے کے مطابق اُس شاعر کا طرز تحریر جسے ہم صاحب طرز کہہ سکتے ہیں جُدا گانہ ہوتا ہے، اور بعض ایسی انفرادی خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے میں بعینہ اسی صورت میں موجود نہیں ہوتیں۔ تاہم ہر دور کا ایک عام طرز تحریر بھی ہوتا ہے۔ جو اُس دَور کے مختلف شاعروں کے درمیان مابہ الاشتراک ہوتا ہے۔ اور دوسرے دَور کے شاعروں سے انہیں ممتاز کرتا ہے۔ آج کل دیکھا جائے تو اردو شاعری پر سب سے بڑا اثر مرزا غالب کا ہے۔ یہ اثر اگرچہ بعض بعض شاعروں کے کلام میں لفظی و معنوی دونو پہلوؤں میں نمایاں ہے۔ لیکن بالعموم مرزا غالب کے اندازِ ظاہری کی تقلید زیادہ کی جاتی ہے کیونکہ زیادہ آسان ہے۔ مرزا غالب کی وہ خصوصیات، جن کے لئے انہیں اردو کے صاحب طرز شعراء میں اتنا بڑا درجہ دیا جاتا ہے۔ اگر اپنے معائب سے جو عموماً مشکل پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے کسی شاعر میں دیکھنی ہوں تو وہ اقبال ہے۔ اقبال نے اردو کے طرز شاعری کو جس حدِ کمال تک وہ پہنچ سکتا تھا پہنچا دیا ہے۔ اور ابھی اردو کو اس کے طرز سے بہتر کوئی طرز پیدا کرنے کے لئے مدّتیں چاہئیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اقبال کے جو ہمعصر اُن کے بعد میدانِ سخن میں آئے۔ اُن کے لئے منتہائے کمال یہ ہوتا ہے کہ اقبال کے طرز کو اپنا نمونہ اور نصب العین بنائیں چنانچہ اقبال کے معاصرین میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسے شعراء کا، عام اس سے کہ وہ کہنہ مشق ہوں یا بساطِ سخن کے تازہ وارد، موجود ہے جس نے اقبال کا طرز اختیار کیا ہے اور اُسے اپنا بنا لیا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو جہاں تک اقبال کے کلام کی خصوصیاتِ ظاہری کا تعلق ہے اُس کی تقلید مشکل بھی نہیں ٭

میرا یہ قول باعثِ تعجب نہ ہونا چاہئے۔ اقبال کا طرز اردو کے مدتوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے اور اردو کی گذشتہ شاعری کی خصوصیات کا مجموعہ ہے اُن کا دامن شعرائے سلف (جس میں اردو اور فارسی دونو کے شعرا کا شمار ہوتا ہے) کے گرانبہا تاریخی ورثے سے مالامال ہے۔ گو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ

انہوں نے اس وصف کو دو چند کر دیا ہے۔

موجودہ دور میں اقبال کی بجائے اردو کا بہترین شاعر کوئی اور ہوتا تو اس کا بھی طرز تحریر یہی ہوتا۔ میرا یہ دعویٰ صرف طرز تحریر تک محدود ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ کچھ کہنا ایک صریح حقیقت سے انکار کرنا ہے۔

نشتر صاحب کی اس نظم میں اقبال کا اثر نمایاں ہے کیونکہ ان کی قومی و مذہبی شاعری کا جہاں اس نظم کا پیغام اقبال کے اس پیغام کی صدائے بازگشت ہے۔ جس نے مسلمانوں کے مدتوں کے خوابیدہ محسوسات کو بیدار کر دیا، وہاں لہجہ بھی اقبال کا ہے۔ وہی شوکت الفاظ ہے وہی بلند آہنگی ہے، اور وہی تراکیب کی ندرت ہے، کہیں کہیں شعر کا تیور بھی بالکل اقبال کا سا معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ نظم "شمع و شاعر" کی طرح مکالمہ کی صورت میں ہے اور ترکیب بند ہے، اور اسی طرح بعض بعض بند کے اخیر میں ایک ایسا شعر ہے جو تمام بند کے معنی کا خلاصہ ہوتا ہے۔

ان تمام اوصاف کو جدا جدا مثالیں پیش کر کے واضح کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس لئے ہم پہلے بند کے کچھ شعر ذیل میں درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جن سے امید ہے اندازہ کرنے میں کچھ مدد مل سکے گی۔

تلوار مسلم کو مخاطب کر کے کہتی ہے:۔

تو جو تھا یثرب کے ساقی کا گدائے آستاں
رشک صد ساغر جم تھا ترا جام سفال
آتش اسلام سے تو تھا جو سینا در کنار
تھا جہاں افروز تیرا نیّر اوجِ کمال
دولت عشق شہ بطحیٰ کا دامن چھوڑ کر
غیر کے آگے تو پھیلانے لگا دستِ سوال
جب ہوئی ایماں پہ غالب مُلک گیری کی ہوس
حشر بن کر تجھ پہ ٹوٹا قہر رب ذو الجلال
جب ترا دل ہو گیا بیگانۂ رُوحِ جہاد
ذرّہ ذرّہ بن گیا اک حلقۂ دامِ وبال
سلطنت کے اوج سے قعرِ غلامی میں گرا
بڑھ گئی عشقِ محمدؐ سے جو حُبِّ جان و مال
یاد ہے تجھ کو کہ خیبر میں مری جھنکار تھی
زخم ہائے قلبِ مومن کو نویدِ اندمال
جو راہِ حق میں جہاں آرا ہوا سکے ساتھ ہوں
میں کفِ غازیؓ میں لے مسلم خدا کا ہاتھ ہوں

مندرجہ بالا اقتباس میں جو سرسری طور پر انتخاب کیا گیا ہے۔ اقبال کا رنگ نظر آتا ہے لیکن ایک فرق ارباب ذوق کی نگاہ کو نظر آئے گا۔ اقبال کے الفاظ میں اُس روح کے جذبات اور شاعرانہ کیفیات کا رنگ یُوں جھلکتا ہے جیسے مرزا غالب کے اس شعر میں کہ؎

تیوری چڑھی تھی پر جو اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

معشوق کے چہرہ کی کیفیت اس کے نقاب سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ اس کی رُوح کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اور اُس کے باطنی جذبات کا تلاطم اس آئینے کا بیتاب جوہر ہے۔ بخلاف اس کے نشتر صاحب کے آئینۂ سخن میں ایک عکس کا عکس ہے، گو یہ عکس بہت رنگین اور دل فریب ہے۔

ناظم شعبۂ تنقید و تبصرہ

ڈراما پردۂ غفلت

مصنفہ سید عابد حسین صاحب مطبوعہ شرکت کاویانی برلن (جرمنی) حجم موزوں۔ طباعت و کاغذ کے کیا کہنے۔ قیمت (عہ) فی جلد ملنے کا پتہ شرکت ادبیہ (علی گڈھ) یہہ کہنا شاید مبالغہ میں داخل نہ ہو کہ آجتک اردو زبان مین جسقدر ڈرامے شائع ہوئے ہیں یہہ ڈراما کم سے کم ان سے بہتر نہیں تو ڈراما کا جواب ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ سپرٹ کسی حد تک ضعیف اور تشنہ ہے۔ چند ایک مقامات پر تقریروں کی طوالت سے۔ ڈرامیت دب گئی ہے اور پردہ کی بحث نے دخل در معقولات کا انداز پیدا کر دیا ہے۔ پھر بھی محاسن کی اسقدر کثرت ہے کہ یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ کہ یہ ڈراما بلاشبہ ایک کامیاب کاوش ہی اور اردو زبان سکے شکریہ کی مستحق۔ اسکا شستہ و رفتہ روزمرہ تصنع اور بناوٹ سے منزا ہے۔ جسکی ہر سطر سے کیرکٹر کی خصلت پھوٹی پڑتی ہے۔ اسلوب بیان کا سلجھاؤ اور مکالمہ کی صفائی نے ہر جگہ خاص ادبی شان پیدا کر رکھی ہے۔ حقائق نگاری بدرجہ اتم ممتاز ہے۔ ڈراما حقیقت کے اسقدر قریں ہے کہ متخذرات محرسوں کے روبرو نہیں رہتی بلکہ اکثر پیروں کی کی اوٹ لیکر بات کرتی ہیں۔ بہت تھوڑی ترمیم و تنسیخ سے یہ ڈراما سٹیج پر جلوہ افروز ہونے کی اہلیت رکھتا ہے

اگر ارباب ذوق اس کتاب کی قدر کرنے میں بہی بخل سے کام نہیں تو تصنیف و تالیف کی محنت محض بیکار ہے۔ ورنہ یہہ ڈراما تو اس قابل ہے کہ اسے بلا کسی پس و پیش کے داخل نصاب کیا جائے۔

ڈرامی (از جموّں)

اطّلاع

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں دفتر ہزار داستان میں تبصرے کے لئے وصول ہوتی ہیں، ان کے متعلق انشاء اللہ کسی آیندہ اشاعت میں اظہار رائے کیا جائیگا۔

مینجر

اعلاقات پر لیبر رد ہوکر ... گئے ... دب گئی ہے اور پردہ کی بحث نے دخل در معقولات کا انداز پیدا کر دیا ہے۔ پھر بھی محاسن کی اسقدر کثرت ہے کہ یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ کہ یہ ڈراما بلاشبہ ایک کامیاب کاوش ہی اور اردو زبان پُر ... سکے شکریہ کی مستحق ! اسکا شستہ و رفتہ روزمرہ تصنع

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں دفتر ہزار داستان میں تبصرے کے لئے وصول ہوئی ہیں، ان کے متعلق انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں اظہار رائے کیا جائیگا۔ مینجر

تصنیفات نو از آلٰہی محمد عمر

ناٹک ساگر یعنی وہ گرانمایہ تصنیف جس کے صلے میں پنجاب یونیورسٹی نے مصنفین کو ۵۰ روپے کا اول درجہ کا انعام عطا فرمایا ہے

ناٹک ساگر اس لاجواب کتاب میں ہندوستان۔ چین۔ جاپان۔ سیلون۔ افریقہ ایران۔ عرب۔ ٹرکی یونان۔ اٹلی۔ سپین۔ پرتگال۔ فرانس۔ جرمن۔ انگلستان۔ سویڈن۔ ناروے۔ روس اور امریکہ کے مشاہیر نامہ نگاروں اور ایکٹروں کی زندگی کے حالات ڈراموں پر نقد و نظر۔ سٹیج کی حالت بتا کر فن ڈراما کے رموز آشکارا کئے گئے ہیں۔ باوجود تاریخی باتوں پر مشتمل ہونیکے کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ بغیر ختم کئے نہیں چھوڑ سکتے اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کا کتب خانہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں آجکل ہندوستان بھر میں اسی کتاب کا چرچا ہے۔ طباعت کتابت اور کاغذ نفیس، حجم قریباً ۵۰۰ صفحات باوجود ان تمام خوبیوں کے بلا جلد ۴؎ مجلد طلائی ۴؎ ہے

موجودہ لنڈن کے اسرار

اردو زبان میں کوئی کتاب موجود نہیں جو فلسفہ جرائم پر روشنی ڈالتی ہو اس کتاب کی اشاعت نے بہت حد تک اس کمی کو پورا کیا ہے۔ لنڈن کی سنسنی پیدا کرنے والی وارداتوں کو سامنے رکھکر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ جرائم کے حیرت انگیز طریقے صاف نظر آجاتے ہیں۔ من گھڑت قصہ کہانیوں کو ان حقیقی واقعات سے دور کی بھی نسبت نہیں ہو سکتی۔ مگر باوجود اسکے کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ناول بھی اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔ اگر آپ دنیا میں دھوکہ کسی فریب کا شکار ہونا نہیں چاہتے تو اس کتاب کو حرز جاں بنائیے۔ اگر آپ تحقیق جرائم میں دلچسپی لیتے ہیں، تو ہر وقت اس کتاب کو اپنے سامنے رکھئے قیمت ۴؎

جانِ ظرافت

ایک بزمیہ ڈراما ہے۔ جس میں ایک بخیل کے بخالت آمیز کارنامے ہنسی دل لگی میں سینکڑوں کام کی باتیں سمجھاتے ہیں۔ اصل کتاب مولیئر سے ماخوذ اور اس میں وہ تمام چٹکیاں مستور ہیں جو جرمنی کے مشہور ڈرامانگار لیسنگ ودفارسی میں ڈراما کے موجد آغا جعفر کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ بہت کچھ باتیں مصنفین کی طبع زاد ہیں۔ غرضکہ اس نعفران لی بالیدگی کے لئے کئی شاداب چمنوں کی خوشہ چینی کی گئی ہے، متین اور مہذب ظرافت کا بہترین نمونہ ہے۔ ریاست کشمیر کے سکولوں کے لئے منظور ہوئی۔ اس کی خوبی کی اس سے بڑھکر اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ عالیجناب سر ڈاکٹر اقبال نے اس کا ڈیڈیکیشن منظور فرمایا ہے

قیمت ۸/ فیجلد

فسانہ آزاد

قرنِ ق

جرمنی کے شہرۂ آفاق فلسفی شاعر اور ڈرامانگار شلر کے ایک دلفریب ڈراما کو ہندوستانی مذاق کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے نشیب و فراز، اعمالِ بد کے مآلِ کار اور محبت کے حقیقی معیار کا مرقع پیش کیا ہے۔ سوز و گداز کے مناظر دل کو لبھاتے ہیں۔ ایڈیٹر رسالہ اردو اس کی زبان کو فصیح اور شاندار تصور کرتے ہیں۔ اور جناب لالہ کنورسین صاحب ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر اسے از حد دلچسپ خیال فرماتے ہیں :۔ قیمت فیجلد ۸/

ظفر کی موت

بلجیم کے چابکدست اور محیر العقول ڈرامانگار میٹرلنک کی ایک سنگلاخ تصنیف کا سلیس ترجمہ مع حواشی جسمیں ایک انکی محبت کا جلوہ دکھا کر ان جذبات کو نمایاں کیا ہے جو انسان کے دل ہی میں رہتے ہیں۔ اور جنکا اظہار زبان سے نہیں ہو سکتا انہیں جذبات کا اظہار میٹرلنک کی خصوصیت ہے عجب پُر تاثیر کتاب ہے۔ جسکے مطالعہ کے بعد بھی رقت طاری رہتی ہے :۔ قیمت (۴/)

بگڑے دل

فرانس کے مسلم ایف ڈرامانگار مولیئر کی بہترین تصنیف کا آزاد ترجمہ مبصروں کی رائے میں حسن زبان اندازِ بیان کے لحاظ سے اس کومیڈی کا جواب ادبیاتِ عالم میں ناپید ہے۔ اور شعار نگاری کا اس سے بہتر نمونہ ملنا ناممکن ہے اس ڈراما میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص بے محابا صداقت شعاری کے ہاتھوں کن الجھنوں میں پھنستا ہے قیمت فیجلد ۸/

۲۹	رائے بہادر پنڈت دولت رام کالیہ بیرسٹرایٹ لا فیروزپور
۳۰	مسٹر محمد اسلم خاں صاحب بی اے وکیل میانوالی
۳۱	مسٹر مشتاق احمد زاہدی بی اے پرنسپل کالج ریاست بہاولپور
۳۲	شیخ غلام جیلانی صاحب تاجر خیمہ لاہور
۳۳	مسٹر روشن لال صاحب نیّر
۳۴	مرزا یاس عظیم آبادی
۳۵	مولانا فیض احمد صاحب ایم اے اسلامیہ کالج لاہور
۳۶	حضرت جگر مراد آبادی
۳۷	منشی قاسم علی خاں بدایونی
۳۸	مسٹر سلامت اللہ شاہ صاحب بی اے (جامعہ)
۳۹	چوہدری فضل الٰہی صاحب عاؔلی بی اے
۴۰	سیٹھ عبدالمجید صاحب
۴۱	شیخ عطاء اللہ صاحب
۴۲	ڈاکٹر نند لال صاحب ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا۔ سرپرست
۴۳	مسٹر محمد ہادی حسین بی اے (آنرز)
۴۴	بخشی مہاراج کرشن صاحب مہتمم اجلاس
۴۵	مسٹر محمد صدیق صاحب رکن مجلس ادبا۔
۴۶	شیخ غلام جیلانی صاحب ادیب فاضل رکن مجلس ادبا۔
۴۰	صاحبزادہ محمد عمر صاحب
۴۱	محمد اسمٰعیل نعیم